غالب درونِ خانہ

(اضافہ شدہ ایڈیشن)

کالی داس گپتا رضا

انجمن ترقی اردو پاکستان

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

غالبؔ درونِ خانہ

(اضافہ شدہ ایڈیشن)

کالی داس گپتا رضاؔ

انجمن ترقی اردو پاکستان
ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال،
کراچی۔۷۵۳۰۰

انتساب

ساوتری گپتا
کے نام

میں جانتا ہوں کہ اس کتاب کا
ایک حرف بھی تم نے نہیں لکھا
مگر تمھارے بغیر شاید میں ایک
حرف نہ لکھ سکتا ______

فہرست مضامین

۱۔ حرفے چند	۷
۲۔ خانہ باغ	۹
۳۔ غالبؔ کا خاندان (دادا، والد، چچا اور پھوپھیاں وغیرہ)	۱۳
۴۔ غالبؔ کی والدہ	۲۹
۵۔ غالبؔ کی تاریخِ ولادت	۳۵
۶۔ غالبؔ کا نام	۴۳
۷۔ غالب کا مذہب	۴۷
۸۔ زوجۂ غالبؔ امراؤ بیگم (ازدواجی زندگی کے پہلے ۱۶ سالوں کی مختصر داستان)	۵۳
۹۔ غالبؔ بنام امراؤ بیگم	۵۷
۱۰۔ غالبؔ اور امراؤ بیگم میں ان بن، کتنا جھوٹ کتنا سچ	۶۷
۱۱۔ غالبؔ کے سفر کلکتہ کی توقیت	۸۵
۱۲۔ عارفؔ اور فرزندیِ غالبؔ؟	۹۳
۱۳۔ غالبؔ کا ملازمِ خاص کلّو داروغہ	۱۰۹
۱۴۔ مرزا عباس بیگ	۱۲۱

۱۵۔ نواب مرزا الٰہی بخش خاں معروف ۱۴۷
۱۶۔ فخر الدولہ، دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ ۱۸۵
۱۷۔ مرزا فضل بیگ ۲۰۹
۱۸۔ آبِ حیات میں ترجمۂ غالب (مع حواشی) ۲۲۱
۱۹۔ توقیت غالب ۲۵۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی

حرفے چند

غالب کی شاعری اور نثر پر کافی تحقیقی و تنقیدی کام ہو چکا اور ہنوز ہو رہا ہے۔ مگر ان کے خانگی اور خاندانی حالات پوری طرح سامنے نہیں آئے۔ "غالب درونِ خانہ" میں آں جہانی کالی داس گپتا رضاؔ غالب کی خانگی اور خاندانی زندگی کے بارے میں ممکنہ حد تک تحقیقی نقطہ نظر سے جو معلومات اکٹھی کر سکتے تھے وہ اس کتاب میں یکجا کر دی ہیں۔ یہ کتاب صرف درونِ خانہ تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس میں خاندانی حالات کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے معاملات اور واقعات کی تفصیلات بھی پیش کی گئی ہیں۔ غالب کے ملازمِ خاص "کلو" اور ان کے بھانجے مرزا عباس بیگ جیسی غیر معروف شخصیات پر بھی کافی معلومات اس کتاب میں موجود ہیں۔ غالب کے منہ بولے بیٹے زین العابدین خاں عارفؔ کے بارے میں بھی بعض اہم باتیں ملتی ہیں۔ خصوصاً عارفؔ کو متبنیٰ بنائے جانے کے بارے میں کچھ نئی باتیں سامنے آئی ہیں۔ اس کے علاوہ غالب کے مذہبی معاملات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

حالیؔ نے غالب کو حیوانِ ظریف یوں ہی نہیں لکھا ہے؟ جس شخص کو اس پر فخر ہے کہ وہ افراسیابی، سلجوقی ہے اور سمرقند کے ایک شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اپنی تباہی اور بربادی کا مذاق خود اُڑاتا ہے؟ یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔ اس طرح عزم اور حوصلے کے ساتھ مصیبتوں اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کا درس ملتا ہے۔

کالی داس گپتا رضاؔ نے "دیوانِ غالب" کامل کی تاریخی تدوین بھی کی ہے تاکہ غالب کی

طبعی نشوونما، فکروفن، ارتقا اور ان کے خیالات میں ہونے والے تغیر و تبدل کا تجزیہ ممکن ہو سکے۔

"غالب درونِ خانہ" اور "غالب کی بعض تصانیف" ہندوستان میں پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ بعد از طباعت آں جہانی کالی داس گپتا رضا نے ان کتابوں پر نظر ثانی کی اور مزید اضافوں کے بعد کتابیں طباعت کے لیے انجمن ترقی اردو کو اس کے حق میں کاپی رائٹ تفویض کرتے ہوئے بھیجیں۔ "غالب کی بعض تصانیف" گزشتہ سال انجمن ترقی اردو پاکستان کے جشن صد سالہ کے موقع پر شائع ہو چکی ہے جب کہ "غالب درونِ خانہ" پاکستان میں پہلی بار اضافوں کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔

کاش کہ میں اس کتاب پر ایک کسی قدر تفصیلی حرفے چند لکھ سکتا۔ آں جہانی کالی داس گپتا رضا صاحب نے وعدہ بھی لیا تھا۔ سارا قصہ ہی اس خانوادے سے متعلق ہے جس سے میں متعلق ہوں اور جس کے کئی کرداروں کے بارے میں کچھ علم سینہ بھی رکھتا ہوں۔

مگر اب کہ کتاب خاصی تاخیر کے بعد کمپوز ہو کر بازار میں جانے پر تیار ہے، میں ہسپتالوں کے چکر لگا رہا ہوں۔ مزید تاخیر کرنا ظلم ہوگا۔ ے باقی وماہتاب باقی

خانہ باغ

عام طور پر سمجھا جا رہا ہے کہ تحقیق روکھی پھیکی کارگزاری ہے مگر یہ درست نہیں۔ سچ، پیار اور خوب صورتی (ستیم، شوم، سُندرم) یہ تینوں گُن اس میں موجود نہ ہوں تو تحقیق تحقیق نہیں بنتی اور یہ تینوں گُن اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتے جب تک تحقیق کرنے والے میں خود اعتمادی نظم و ضبط، خود سپردگی اور انہماک نہ ہو۔

تحقیق محض نئے پرانے مواد کو یکجا کر دینا بھی نہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نیا مواد پرانے مواد سے ٹکرا جانے کی حد تک مختلف ثابت ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں تحقیق خاموش تماشائی نہیں بنی رہ سکتی۔ اسے متنازعہ امور پر فیصلہ صادر کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ فیصلے ذاتی ہونے کی وجہ سے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں، تاہم ان سے تغافل نہیں برتا جا سکتا۔ البتہ یہ امید ہمیشہ رکھی جائے گی کہ فیصلے منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہیں۔

توقیت یعنی وقت کے تعین کے ساتھ واقعہ نگاری، بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ اگر واقعات سلسلہ وار دستیاب نہ ہوں تو اس محرومی کو تحقیق کے راستے میں سب سے بڑی دشواری سمجھا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی دھڑکنوں کے سلسلہ وار ریکارڈ ہی کا دوسرا نام "توقیت" ہے اور یہ بھی حقیقت ہی ہے کہ واقعات کا تاریخی تعین جتنا دشوار ہے اتنا ہی دل کش اور سحر انگیز ہے۔ کڑیاں ملنے لگتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی رومانس کامیاب ہونے والا ہے۔ چیتھڑوں میں بٹا ہوا تاریخی مواد جیسے اپنے آپ ریشمی چادر میں ڈھلا جا رہا ہو۔

عصبیت، تحقیق کی راہ میں ایک اور بڑی دشواری ہے۔ مگر اس سچ کا کیا کیجے کہ کوئی محقق

خواہ وہ غیر جانب داری میں کتنا ہی نامور کیوں نہ ہو کلی طور پر عصبیت سے بری نہیں رہ سکتا۔ اس کے باوصف اگر کوئی علمی ادبی صنف ایسی ہے جس کے نتائج پر اعتبار کرنے کو جی چاہے تو وہ تحقیق ہے۔

کتاب زیر مطالعہ جو سترہ عنوانات پر محیط ہے، تحقیق کے ایسے ہی مراحل سے گزر کر معرض وجود میں آئی ہے۔ یہ حیاتِ غالب کی باقاعدہ روداد نہیں ہے، تاہم اس میں بہت کچھ ایسا کہہ دیا گیا ہے جو اس سے پہلے اَن کہا سا تھا۔ (۱) غالب کا خاندان، دادا، والد، چچا، پھوپھیاں وغیرہ۔ (۲) غالب کی والدہ۔ (۳) غالب کی تاریخ ولادت، (۴) غالب کا نام، (۵) غالب کا مذہب، (۶) زوجۂ غالب امراؤ بیگم کی ازدواجی زندگی کے پہلے سولہ سال، (۷) غالب بنام امراؤ بیگم، (۸) غالب اور امراؤ بیگم میں اَن بَن کتنا سچ کتنا جھوٹ، (۹) عارف اور فرزندی غالب؟ (۱۰) غالب کا ملازم خاص کلّو داروغہ، (۱۱) مرزا عباس بیگ (خواہر زادۂ غالب)، (۱۲) نواب الٰہی بخش خاں معروف کے بڑے بھائی)، یہ مضامین ایسے ہیں جن کا تعلق براہ راست غالب کی ذات سے ہے۔ ایک مضمون مرزا افضل بیگ پر بھی ہے۔ یہ غالب کے بہنوئی مرزا اکبر بیگ کے چھوٹے بھائی اور غالب کے بھانجے مرزا عباس بیگ کے چچا تھے۔ اگرچہ غالب کے سوانح حیات سے مرزا افضل بیگ کا سیدھا تعلق کم ہے تاہم یہ مضمون اس عہد کی تاریخ پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے اور غالبیات کے مطالعے کے لیے ناگزیر ہے۔

آزاد مولف "آبِ حیات" غالب کے اوّلین سوانح نگاروں میں ہیں۔ "آبِ حیات" میں شامل غالب کی سوانح عمری تاریخی حیثیت سے لاکھ کمزور سہی مگر اسلوب کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے تحقیقی امور کے لیے کام میں نہیں لایا جاسکتا، لیکن اسے قطعی غیر معتبر کہہ کر نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ میں نے اس پر مفصل حواشی کا اضافہ کرکے اسے "آبِ حیات" میں ترجمۂ "غالب" کے عنوان سے ۱۹۸۷ء میں شائع کردیا تھا۔ اب اسے مزید ترمیم و اضافہ کے ساتھ کتاب زیر مطالعہ کے آخری ابواب میں شامل کرلیا گیا ہے تاکہ غالب کے مختصر ہی سہی۔ مربوط سوانح سے کتاب خالی نہ رہے۔

کتاب کے دو باب تو "غالب کے سفر کلکتہ کی توقیت" اور "توقیت غالب" کے عنوان

سے ہیں۔ ایک مختصر توقیت پہلے ہی باب ''غالب کا خاندان۔ دادا، والد، چچا، پھوپھیاں وغیرہ'' میں بھی ہے۔ چوں کہ اس میں تاریخیں قیاسی بھی ہیں، اس لیے ان سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ مگر سفر کلکتہ اور حیاتِ غالب کی توقیت جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے خاصی مستند و مفصل ہے۔

مجھے اپنی اس کاوش سے اطمینان تو نہیں ہے مگر میں اس وہم میں مبتلا نہیں ہوں کہ اسے حرفِ آخر کہہ سکوں۔ اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ آپ خوبیوں کو (اگر ہوں تو) بھلے ہی دل میں سراہ کر رہ جائیں، مگر خامیوں کو مجھ تک پہنچانے میں ہرگز پس و پیش نہ کریں۔ میں آپ کا ممنون ہوں گا۔

غالب کے انتقال کو ابھی ایک سو تیس سال ہی کا عرصہ ہوا ہے مگر وہ پورے اردو ادب بلکہ اپنے عہد کے دوسری ہندوستانی زبانوں کے حصار کو بھی، ایسا توڑ کر نکل گئے ہیں کہ غالب پر گفت و شنید اور نوشت و خواند کو ''غالبیات'' کا مستقل نام دینا پڑا ہے۔ میری تالیفات و تصنیفات میں ''غالب درونِ خانہ'' اسی سلسلے کی دسویں کڑی ہے۔ ابھی اور دس کتابیں شائع کرنے کا پلان ہے۔ مواد بھی لگ بھگ تیار ہے مگر مخدوش صحت کے پیشِ نظر اب شاید یہ سب ممکن نہ ہو، اس لیے فی الحال اجازت۔

اطلاعاً عرض ہے کہ ''غالب درونِ خانہ'' کے اس اڈیشن میں جو نو سال کے بعد شائع ہو رہا ہے اب تک کی تمام ممکنہ ترمیمیں اور اضافے شامل ہیں۔

کالی داس گپتا رضا

غالب کا خاندان

دادا، والد، چچا اور پھوپھیاں وغیرہ

(I) ۱۸۲۸ء

غالب اپنی پنشن کے مقدمے کے عرضی دعوے[1] مورخہ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء میں لکھتے ہیں:

"میرے چچا) نصر اللہ بیگ خاں کے والد (یعنی میرے دادا)...... کا نام قوقان بیگ خاں تھا ...... (ان کی) بیوی (یعنی میری دادی) کی ایک بیوہ ہمشیر تھی، جس کی ایک نا کتخدا لڑکی تھی۔ ...... (میری دادی) اپنے دوسرے متعلقین اور لواحقین کی طرح اپنی اس بہن اور بھانجی کی بھی پرورش اور نگہداشت کرتی تھیں۔ (ص ۱۱۳)

جب فوج کی کمان پروں[2] (Perron) کے ہاتھ میں تھی تو اس کی طرف سے میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں آگرے کے قلعہ دار مقرر ہوئے۔ پھر جب انگریزی فوج نے اس علاقے میں پیش قدمی کی تو نصر اللہ بیگ خاں نے ہتھیار ڈال دیے اور انگریزی حکومت سے مل گئے (بعد ازاں) لارڈ لیک[3] ــــــ نے بھی قلعے کا نظم و نسق عارضی طور پر انھیں سے متعلق رکھا پھر ــــــ چار سو سواروں کے دستے کی کمان ان کے تفویض ہوئی اور سترہ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی

صوبہ آگرہ میں سونک اور سونسا کے دو پرگنے حین حیات تقرری (۲۱ ستمبر ۱۸۰۵ء کو) جاگیر میں عطا کیے۔ (ص ۱۰۷)

گیارہ مہینے بعد نصر اللہ بیگ خاں (میرے چچا) جب کہ وہ باہر سیر کے لیے گئے ہوئے تھے، اچانک ہاتھی پر سے گر گئے۔ ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور بھی سخت چوٹیں آئیں، چند دن بعد (جولائی یا اگست ۱۸۰۶ء) ان کا انتقال ہو گیا اس پر جاگیر حکومت نے واپس لے لی۔۔۔ (میرے چچا) کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وفات کے وقت ان کے ورثا حسب ذیل تھے۔ (۱) میں (۲) میرا چھوٹا بھائی (مرزا یوسف)، (۳) میری دادی، (۴) میری تین پھوپھیاں۔

اس وقت میری عمر نو برس کی تھی اور میرے بھائی کی سات، میری دادی ستر برس کو پہنچ چکی تھیں۔ (ص ۱۰۸)"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) میں غالب کی دادی زوجہ قوقان بیگ خاں زندہ تھیں اور وہ ستر برس کو پہنچ چکی تھیں۔ گویا غالب کی دادی کی ولادت ۱۷۳۶ء اور ہجری حساب سے (۱۱۵۱ھ) (۳۸-۱۷ء) میں ہوئی تھی۔ اپنے چچا کے ورثا میں غالب نے اپنی بہن چھوٹی خانم زوجہ مرزا اکبر بیگ کو شامل نہیں کیا، شاید اس لیے کہ اس حادثے سے پہلے (باوجود چھوٹی عمر کے) اس کی شادی ہو چکی تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پھوپھیوں کو اس بنا پر وارثوں میں شمار کر لیا گیا کہ وہ خود کفیل نہ تھیں۔ ان کی کفالت غالب کی دادی ہی کی پنشن سے ہوتی تھی۔ غالب کے چچا نواب احمد بخش خاں کے بہنوئی تھے، مگر ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ بیوی کا انتقال ان سے پہلے ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی چچی ورثا میں شامل نہیں۔

"نواب (احمد بخش خاں) نے مجھ سے وعدہ کیا کہ ۔۔۔ میں حکومت سے کہہ کر تم پانچوں کے نام الگ الگ سند لے دوں گا" ص (۱۱۰)"۔ گویا اب وارث چھ کے بجائے پانچ رہ گئے۔ یعنی غالب کی دادی کا انتقال ہو گیا۔ احمد بخش خاں (اکتوبر) ۱۸۲۷ء کو مرے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ غالب کی دادی اکتوبر ۱۸۲۷ء سے پہلے انتقال کر چکی تھیں اور غالب یہ بھی لکھتے ہیں:

"(میرے چچا) کے جائز وارثوں میں سب سے پہلے میری دادی تھیں، جنھیں نواب احمد بخش اپنی زندگی میں پندرہ سو روپے سالانہ دیتے رہے اور ان (دادی) کی وفات کے بعد یہی رقم ان کی سب سے بڑی بیٹی (میری بڑی پھوپھی) کو ملنے لگی۔ یہ انھیں اب بھی ملتی ہے۔ اس سے وہ اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کے گزارے کا انتظام کرتی ہیں..... (ص ۱۰۲)"

اس بیان سے ظاہر ہے کہ غالب کی دادی کی پنشن جوں کی توں غالب کی بڑی پھوپھی کے نام منتقل ہو گئی۔ مگر دو چھوٹی پھوپھیوں کے نام کچھ نہ تھا، کیوں کہ ان کی دیکھ بھال بڑی پھوپھی ہی کرتی تھیں۔ اصل میں پنشن ان تینوں بہنوں کے گزارے کے لیے ملتی تھی مگر سند بڑی بہن کے نام تھی ویسے ہی جیسے پہلے سند صرف ان کی والدہ کے نام تھی مگر پنشن والدہ اور تین بیٹیوں کے گزارے کے لیے تھی۔ شاید یہ بہنیں خود کفیل نہ تھیں۔ ۲۲ دسمبر ۱۸۵۳ء کو غالب نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں:

"منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول (۲۰ دسمبر) کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی، مر گئی..... پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے، تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا..... اس مرحومہ..... کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج یک بار مرگئے....."

اس خط سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ (۱) غالب کی دو چھوٹی پھوپھیوں کا انتقال بڑی پھوپھی (اگر مذکورہ بالا پھوپھی سے مراد بڑی پھوپھی ہو تو) سے پہلے ہو چکا تھا اور (۲) غالب کے دو چچا اور بھی تھے جو شاید غالب کے والد کے انتقال ۱۸۰۲ء سے پہلے ہی مر چکے تھے گویا غالب کے والد دو نہیں بلکہ چار بھائی تھے۔

(II) ۱۸۴۰ء

پنج آہنگ (اشاعت اول ۱۴ اگست ۱۸۴۹ء۔ ص ۳۴۲) میں غالب کا ایک فارسی خط بنام

سراج الدین احمد ہے، جس کے ضروری حصے کا اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"(میں) ترک نژاد ہوں اور میرا نسب افراسیاب و پشنگ سے ملتا ہے۔ میرے بزرگ سلجوقی تھے[۳] اور اپنے عہد میں اعلیٰ فوجی عہدیدار تھے۔

جب روزگار میں زوال آیا تو ایک گروہ رہزنی اور غارت گری کا شوق کرنے لگا اور دوسرے گروہ نے کھیتی باڑی شروع کر دی..... میرے بزرگ توران کے شہر سمرقند میں آباد ہوگئے۔ ان میں سے ایک یعنی میرے جد اعلیٰ اپنے باپ سے روٹھ کر ہندوستان آگئے اور لاہور میں معین الملک[۵] کے ساتھ ہوگئے۔ جب معین الملک کی بساط دولت الٹ دی گئی تو دہلی آگئے اور ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں[۶] بہادر کے ساتھ مل گئے۔ میرے والد عبداللہ بیگ خاں، شاہ جہاں آباد میں پیدا ہوئے۔ جب میں پانچ سال کا ہوا تو میرے سر سے سایہ پدری اٹھ گیا۔ میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے مجھے بڑے ناز و نعمت سے پالا۔ ناگہ اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے کم و بیش پانچ سال بعد وہ بھی چل بسے اور مجھے اس خرابے میں تنہا چھوڑ گئے۔ یہ حادثہ......۱۸۰۶ء میں صمصام الدولہ جرنیل لارڈ لیک صاحب بہادر کی طرف سے لشکر آرائی کے وقت پیش آیا، چوں کہ میرے چچا دولت اہل فرنگ کے رئیسوں میں سے تھے اور چار سو سواروں کے ساتھ صمصام الدولہ کی ہمراہی میں لڑائی لڑ رہے تھے اور سرکار انگریزی کے کرم سے اکبر آباد کے مضافات میں دو پرگنہ جاگیر کے مالک تھے۔ اس لیے سرکار انگریزی کے سپہ سالار نے میرے چچا کے خوں بہا میں بے نواؤں کے لیے جاگیر کے عوض مشاہرہ مقرر کیا جس کی وجہ سے فکرِ معاش سے فراغت حاصل ہوئی آج کہ میری عمر چوالیس سال کی ہو رہی ہے، اس عطا پر خورسند و قانع ہوں .. "

(III) ۱۸۴۵ء

غالب کا ۹ شعر کا یہ قطعہ، مشمولہ دیوان فارسی (پہلی اشاعت۔ مطبع دار السلام دہلی۔ (ص ۲۱ / ۲۲) بہت مشہور ہے۔ اس کے پہلے چار شعر یہ ہیں:

غالب از خاک پاک تورانیم لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی بسترگان قوم پیو ندیم
ایبکیم از جماعہ اتراک در تمامی زماہ دہ چندیم
فن آباء ما کشا ورزی ست مرزبان زادہ سمر قندیم

تیسرے شعر میں کہا ہے کہ میرا تعلق ترکوں کی ایک جماعت ایبک سے ہے۔ اس پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں (غالب اور آہنگ غالب۔ ص ۲۰۷) لکھتے ہیں:

> "غالب نے کئی جگہ اپنے کو ایبک ترک کہا ہے۔ ایبک کسی ترکی قبیلے کا نام نہیں ہے۔ غالباً اس سے ان کی مراد ازبک ہے، جو بدخشاں میں آباد تھے اور اب بھی آباد ہیں۔ اگر غالب کا یہ بیان صحیح ہے کہ ان کے اجداد سمرقند کے رہنے والے تھے اور کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ازبک تھے۔ اگرچہ سمرقند شہر میں تاجک لوگ بڑی تعداد میں سامانیوں کے زمانے سے آباد ہیں لیکن نواح کی آبادی ازبکوں پر مشتمل ہے جو وہاں صدیوں سے رہتے سہتے ہیں۔ اگر غالب کے اجداد کھیتی باڑی کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ شہر کے نواح ہی میں کرتے ہوں گے۔ شہر کے بیچوں بیچ تو کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی۔ ان حالات میں قیاس ہوتا ہے کہ غالب کے اجداد سمرقند کے نواح کے کاشت کاری کرنے والے ازبک ہوں گے۔ سمرقند جہاں سے ان کے اجداد کا تعلق تھا اور بدخشاں جہاں سے ان کے دادا قوقان بیگ خان آئے تھے دونوں جگہ ترکی بولنے والی آبادی ازبکوں کی ہے۔۔۔۔ افغانوں کی۔۔۔۔ شادی بیاہ ازبکوں اور تاجکوں کے ساتھ ہوتا ہے۔"

(IV) ۱۸۵۲ء[8]

غالب نے مہر نیمروز میں خطاب زمین بوس کے تحت لکھا ہے (صرف ضروری مقامات کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔)

"راقم[9] (غالب) کے بزرگ افراسیاب اور پشنگ کی نسل سے تھے ... کینہ کیخر دکی آستیں کی ہوا سے "تور کے بیٹے (افراسیاب) کی ہستی کا چراغ گُل ہو جانے کے بعد پشنگیوں کو یہ روز سیاہ دیکھنا پڑا کہ اس شان و شوکت میں سے ان کے ہاتھ میں سوائے تیغ کے اور کچھ نہ رہا۔ دوسروں کی سرزمین کو تکنے لگے (ہجرت کر گئے) اور تیغ زنی (سپہ گری) کر کے روٹی کھانے لگے ...اس قافلے کے بچے کھچے لوگوں میں سے میرے دادا، جن کا جنم سمرقند میں ہوا تھا... سمرقند سے ہندوستان آیا اور... ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خان کے دفتر میں ملازمت شاہی میں داخل ہو گیا اور پرگنہ پہاسو اس کے اور اس کے سپاہ کے روزی کے نام لگا دیا گیا۔ میرے باپ نے بھی اپنے باپ ہی کا پیشہ اپنایا اور اس نے بھی لڑائی کے میدان میں جان دی ... مجھے (خدا نے) زمزمہ سنج و داستاں سرا پیدا کیا:

رُباعی (ترجمہ)

"اے غالب! میں راؤشم[10] کی نسل سے ہوں
اس لیے میرے دم میں، دم تیغ کی سی صفائی ہے۔
جب سپہ گری کی جگہ شعر گوئی نے لے لی
تو بزرگوں کا ٹوٹا ہوا تیر میرا قلم بن گیا"

(V) ۱۸۶۴ء ؟

غالب نے ایک تذکرے کے لیے اپنے حالات خود لکھے تھے۔ وہ تحریر ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہے۔ (تفصیل کے لیے احوال غالب ص ۲۷ دیکھیے) لکھتے ہیں:

"اسد اللہ خاں عرف "مرزا نوشہ" "غالب تخلص"، قوم کا ترک سلجوقی سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے۔ اس کا دادا قوقان بیگ خاں، شاہ عالم" کے عہد میں سمر قند سے دلّی میں آیا۔ پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا، پہاسو کا پرگنہ جو نواب سمرو بیگم کو سرکار سے ملا تھا، وہ اس کی جاداد میں مقرر تھا۔ باپ اسد اللہ خاں مذکور کا عبد اللہ بیگ خاں دلّی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں جارہا۔ اسد اللہ خاں اکبر آباد میں پیدا ہوا، عبد اللہ بیگ خاں الور میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا، جس حال میں کہ اسد اللہ خاں مذکور پانچ چھ برس کا تھا اس کا حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبے دار تھا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب اکبر آباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی۔ جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا بریگیڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو کی تنخواہ مقرر کی۔ پھر جب اس نے اپنے زورِ بازو سے سونک، سونسا دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہو کر کے سواروں سے چھین لیے، جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بہ طریق استمرار عطا فرمائے۔ مگر خان موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد مرگِ ناگاہ ہاتھی پر سے گر کر مر گیا، جاگیر سرکار میں بازیافت ہوئی اور اس کے عوض نقدی مقرر ہو گئی اور شرکا کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپیہ سال اس شخص کی ذات کو اسی زرِ معافی میں سے ملتے ہیں ....."

(VI) ۱۸۶۵ء

غالب درفش کاویانی (مطبوعہ اکمل المطابع دہلی۔ ۱۸۶۵ء) میں لکھتے ہیں، (صرف ضروری حصے کا اردو مفہوم دیا جاتا ہے)۔

"سلسلۂ نسب سلطان سنجر اور سلطان ملک شاہ سلجوقی سے طغرل و سلجوق تک پہنچتا ہے۔ تاریخ لکھنے والوں نے ان کو افراسیاب و پشنگ و تور ابن فریدوں کی نسل سے لکھا ہے۔۔۔ زوال سلطنت کے بعد یہ لوگ ماوراالنہر کے وسیع میدانوں میں بکھر گئے۔ انھیں میں سے ترسم خاں نے کہ ہم اسی کی اولاد ہیں، سمرقند کو اپنا گھر بنالیا۔ شاہ عالم کی سلطنت کے عہد میں میرا دادا سمرقند سے ہندوستان آیا۔ جن لوگوں نے "خانۂ خجستہ گہر" (میرے دادا) کو دیکھا ہے، وہ کہتے تھے کہ وہ (دادا) سب بات چیت ترکی میں کرتے تھے اور انھیں ہندوستانی زبان نہیں آتی تھی، مگر ادھر میں ہوں کہ ترکی کے حروف تہجی سے بھی واقف نہیں ہوں۔۔۔ (ص ۵۴)۔۔۔ میرے دادا ماوراالنہر سے تھے اور میرے باپ کی ولادت دہلی میں ہوئی اور میں آگرے میں پیدا ہوا۔۔۔ (ص ۱۳۱)۔

(VII) ۱۸۶۷ء

غالب منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں (اردوئے معلی۔ اکمل المطابع مطبوعہ ۱۸۶۹ء۔ خط مورخہ ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء)

"۔۔۔ میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں، دادا میرا ماوراالنہر سے شاہ عالم[۱۲] کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی، صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس

کے جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جاکر نواب نظام الدولہ کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھر آکر (گھبر اکر) الور کا قصد کیا اور راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصر اللہ بیگ خاں بہادر میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا، اس نے مجھے پالا ۱۸۰۶ء میں جب جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا، صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار جمع کیے، چار سو سوار کا بریگیڈیر ہوا۔ ایک ہزار سات سو روپیہ در ماہہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات علاوہ سال بھر مرزبانی کے تھی کہ مرگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔ (ص ۳۵)

مندرجہ بالا اقتباسات درج ذیل ماخذوں سے لیے گئے ہیں۔ آگے کچھ حوالے انھیں نمبروں کے حساب سے دیے جائیں گے۔

I ۱۸۲۸ء از افسانۂ غالب (مالک رام ۱۹۷۷ء۔ ص ۱۰۶ تا ۱۱۷)
II ۱۸۴۰ء پنج آہنگ (قلمی) (اشاعت اول) ۲۷/اگست ۱۸۴۹ء۔ ص ۳۴۲)
III ۱۸۴۵ء دیوان فارسی غالب (اشاعت اول ۱۸۴۵ء)
IV ۱۸۵۳ء نسخۂ کار سطوجاو رجب علی و مہر نیمروز (اشاعت اول ص ۱۲ / ۱۳)
V ۱۸۶۴ء احوال غالب اشاعت اول ص ۲۷
VI ۱۸۶۵ء درفش کاویانی (اکمل المطابع دہلی ۱۸۶۵ء، ص ۱۳۱)
VII ۱۸۶۷ء غالب بنام ذکا (اردوئے معلیٰ ۱۸۶۹ء۔ خط مورخہ ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء)

مندرجہ بالا تجزیے کے بعد چند متنازع فیہ باتوں کے واضح نقوش یہ ابھرتے ہیں۔

ا۔ غالب ترک نژاد تھے۔ ان کا نسب افراسیاب وپشنگ سے ملتا ہے۔ وہ بزرگ جن کی غالب اولاد ہیں سلجوقی تھے (اگرچہ غالب نے لکھا ہے تاہم وہ ایبک ترک نہیں ہو سکتے کیوں کہ ترکوں میں یہ قبیلہ ہے ہی نہیں۔ شاید ازبک ہوں گے) وہ پہلے اعلیٰ فوجی عہدیدار تھے بعد میں جب زوال آیا تو اپنے وطن سے ہجرت کر کے سمرقند میں آباد ہو گئے اور کھیتی باڑی کرنے لگے۔ بحوالہ VII-VI-V-IV-III-II)

۲۔ زوال آنے پر غالب کے وہ بزرگ اعلیٰ جو سمرقند میں آ بسے تھے اور کھیتی باڑی کرنے لگے تھے۔ ان کا نام ترسم خاں تھا۔ (بحوالہ VI)

۳۔ غالب کے دادا کا نام قوقان بیگ خاں تھا (بحوالہ VI) وہ ترکی زبان میں گفتگو کرتے تھے، انھیں ہندوستانی زبان نہیں آتی تھی بحوالہ (VI) وہ اپنے باپ سے روٹھ کر ہندوستان آ گئے تھے اور لاہور میں معین الملک کے ساتھ ہو گئے تھے (بحوالہ II) غالب کہتے ہیں کہ وہ شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلی آئے تھے۔ بحوالہ VII-VI-V) مگر یہ بات مزید وضاحت چاہتی ہے:

☆غالب کی دادی کی ولادت ۱۳ (مقام ولادت نامعلوم) ۱۷۳۶ء یا (۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۸ء)

☆دادا کی ہندوستان میں آمد ۱۷۵۲ء

(بہ عہد معین الملک عرف میر منو

صوبیدار لاہور۔ وفات ۳ نومبر ۱۷۵۳ء)

☆دلی میں احمد شاہ ۱۷۴۸ء تا

۳ جون ۱۷۵۴ء یا بہ عہد

عالمگیر ثانی ۲ جون ۱۷۵۴ء

تا ۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء)

☆شاہ عالم کے عہد شاہزادگی میں ان کی ملازمت بعد از ۲۴ اپریل ۱۷۵۶ء (یہ ملازمت انھیں بہت راس آئی۔ نہ صرف یہ کہ وہ پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے مزین ہوئے بلکہ پہاسو کا پرگنہ بھی ان کی جاداد میں مقرر ہوا۔ پھر اور بھی فتوحات ان کے حصے میں آئی

ہوں گی۔)

☆ قوقان بیگ کی شادی　　　　تقریباً ۱۷۵۰ء تا ۱۷۶۳ء

(قیاس ہے کہ شادی ذرا بڑی عمر میں دلی ہی میں ہوئی ہوگی تب تک قوقان بیگ اپنے پیشے میں خوب جم چکے تھے اور ان کی معاشی حالت بھی اچھی ہو چکی تھی۔ غالب نے دلی میں اپنے مکان کی فروخت کا جو ذکر کیا ہے وہ قوقان بیگ ہی کا بنوایا یا خریدا ہوا خیال کیا جاتا ہے۔)

☆ غالب کے والد عبداللہ بیگ کی ولادت دلی میں　　　　تقریباً ۱۷۶۵ء

معین الملک عرف میر منو کی وفات ۳ نومبر ۱۷۵۳ء کو زہر خورانی سے ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ قوقان بیگ خاں اس سے پہلے لاہور آئے ہوں گے۔ قیاس چاہتا ہے کہ قوقان بیگ، احمد شاہ ابدالی کے تیسرے حملے (دسمبر ۱۷۵۱ء تا مارچ ۱۷۵۲ء) کے بعد ہی لاہور آئے ہوں گے اور معین الملک کے ساتھ رہے ہوں گے کیوں کہ غالب نے کہیں اپنے دادا اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا ذکر نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے دادا نے ان حملوں کے خلاف حصہ نہیں لیا یعنی وہ اس وقت تک لاہور نہیں آئے تھے۔ اس وقت احمد شاہ دلی کے تخت پر جلوہ افروز تھے۔ جنھیں ۲ جون ۱۷۵۴ء کے بعد، کیوں کہ اس روز عالم گیر ثانی کے بیٹے مرزا عبداللہ کو عالی گوہر کا خطاب دیا گیا تھا اور پھر اس خیال سے کہ آگے جا کر یہی عالی گوہر بادشاہ بنے گا اسے ۲۴ اپریل ۱۷۵۶ء کو شاہ عالم کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ مئی ۱۷۷۱ء سے پہلے قوقان بیگ خان کا دلی آکر مرزا نجف خاں کی نوکری کرنا ممکن نہیں۔ شاہی ملازمت عالی گوہر کے ۲۴ اپریل ۱۷۵۶ء کو شاہ عالم کا خطاب پانے کے بعد کی ہوگی۔ یہ شاہ عالم کی شاہ زادگی کا زمانہ تھا، شاہی کا نہیں۔ شاہ عالم نے اپنے والد عالمگیر ثانی کے قتل (۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء) کے بعد ۲۳ دسمبر ۱۷۵۹ء کو اپنی بادشاہی کا اعلان کیا تھا۔ اگرچہ صحیح طور پر ایک اور اڑجن شاہ جہاں ثانی (۳۰ نومبر ۱۷۵۹ء تا ۱۰ اکتوبر ۱۷۶۰ء) کے دور ہونے کے بعد ہی (۱۷۶۱ء میں) وہ بادشاہ بن سکا تھا۔

۴۔ غالب کے دادا قوقان بیگ خاں اور ان کی اولاد کے کوائف مختصراً یوں ہوں گے۔

☆ولادت قوقان بیگ خاں (سمرقند)، (قیاساً) ۱۷۳۰ء

☆غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں، دو اور چچاؤں اور تین پھوپھیوں کی ولادت، اندازہ ہے کہ ۱۷۶۷ء تا ۱۷۸۰ء کے انھیں بارہ سالوں میں ہوئی ہوگی۔

☆قوقان بیگ خاں کا انتقال قبل از ۳۰ جولائی ۱۷۸۸ء

شاہ عالم کو غلام قادر روہیلہ نے اسی روز تخت سے اتارا تھا اور بعد میں اندھا کر دیا تھا۔ قوقان بیگ اس سے پہلے ہی کسی لڑائی میں (شاید ۱۷۸۰ء میں کیوں کہ اس وقت ان کی عمر پچاس سال کی ہوگی اور سپہ گری کے لیے یہ عمر خاصی پختہ ہے) شاہ عالم کی طرف سے لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔ غالب کہتے ہیں کہ میرے باپ نے اپنے باپ کا (یعنی سپاہی کا) پیشہ اختیار کیا اور وہ بھی لڑائی کے میدان میں مارا گیا۔[۱۳]

☆غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں کی شادی ۱۷۹۳ء

اگر مندرجہ بالا کوائف کو صحیح مان لیا جائے تو قوقان بیگ کی وفات کے وقت عبداللہ بیگ کی عمر محض ۱۲ برس کی ہوگی، دو چچاؤں کا انتقال بھی شادی سے پہلے ہی ہو گیا ہوگا۔ غالب کی دادی کی پرورش میں ایک بیوہ ہمشیر اور اس کی ایک، نا کتخدا کی لڑکی بھی تھی۔ گویا قوقان بیگ کے انتقال (۸۰ء تا ۱۷۸۸ء) کے بعد اپنے علاوہ ۱۹ افراد کا کنبہ تھا، جس کا پیٹ غالب کی دادی بھرتی تھیں۔ ظاہر ہے گھر کے مکان کے علاوہ بھی قوقان بیگ نے کافی اندوختہ چھوڑا ہوگا۔

جب شاہ عالم کو اندھا کر دیا گیا تو باوجود یکہ انھیں تخت واپس مل گیا مگر دلی میں طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم رہا۔ اس افراتفری میں قوقان بیگ کی بیوہ کو کون پوچھتا۔ وہ پرگنہ چھن گیا اور بیگم [۱۵] سمرو کو مل گیا۔ چنانچہ عبداللہ بیگ پہلے تلاش معاش میں لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کے نوکر ہوئے۔ پھر حیدر آباد میں نواب نظام علی خاں کے ملازم ہو گئے۔ کئی برس وہاں رہے اور واپس آگئے (اور میرے خیال میں تب آگرہ میں منتقل ہوئے) وہیں ایک امیر فوجی افسر خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی عزت النسا بیگم سے ان کی شادی ہوئی۔ خواجہ غلام حسین خاں کمیدان ذوالفقار الدولہ نواب نجف خاں کے دربار سے وابستہ رہے تھے اسی کی سرکار میں قوقان بیگ خاں بھی ملازم رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ رشتہ اسی زمانے میں طے

ہوا ہو گا اگر چہ شادی قوقان بیگ خاں کے انتقال کے بہت بعد ہوئی۔

☆غالب کی بہن چھوٹی خانم ولادت	۱۷۹۵ء
☆غالب کی ولادت آگرہ میں	۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء
☆یوسف علی بیگ خاں کی ولادت (غالب کے چھوٹے بھائی)	تقریباً ۱۷۹۹ء
☆عبداللہ بیگ خاں (غالب کے والد) کا انتقال (ریاست الور کی ملازمت میں لڑائی میں مارے گئے)	۱۸۰۲ء
☆غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کا انتقال (ہاتھی سے گر کر زخمی اور ہلاک)	۱۸۰۶ء
☆غالب کی شادی (غالب کی عمر تیرہ سال تھی اور دلہن امراؤ بیگم کی گیارہ سال)	۱۹/اگست ۱۸۱۰ء
☆غالب کی دادی کا انتقال	۱۸۰۶ء تا ۱۸۲۵ء

غالب کے دعوے سے پتہ چلتا ہے کہ :

۱۔ ۱۸۰۶ء میں ان کی دادی زندہ تھیں۔

۲۔ ۱۸۲۵ء میں خواجہ حاجی فوت ہوئے۔

۳۔ ان کی دادی کا انتقال اس سے پہلے ہو چکا تھا۔

میری رائے میں غالب کی دادی کا انتقال بہت پہلے ہو چکا ہو گا۔ اگر ۱۸۲۵ء کے لگ بھگ ہوا ہے تو گویا انھوں نے نوے سال کی عمر پائی۔ اس لمبی عمر میں انھوں نے اپنے خاوند قوقان بیگ خاں، اپنے دو بیٹوں اور پھر تیسرے بیٹے عبداللہ بیگ خاں اور چوتھے بیٹے نصراللہ بیگ خاں کو اپنے سامنے دم توڑتے دیکھا۔ اس سے بڑا المیہ کسی کی زندگی میں کیا ہو سکتا ہے۔

غالب کی بڑی اور آخری پھوپھی کا انتقال ۱۷ دسمبر ۱۸۵۳ء (غالب ۲۲ دسمبر ۱۸۵۳ء کو نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں ... "منگل کے دن ۱۸ ربیع الاوّل (۲۰ دسمبر) کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا ... مر گئی۔ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے، تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی

اور ایک داد۱.....اس مرحومہ..... کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو
آدمی آج ایک بار مر گئے۔")

غالب کے اس خط کے مطالعہ کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ۲۰ دسمبر ۱۸۵۳ء کی شام کو غالب کی پھوپھی کی وفات کے ساتھ، قوقان بیگ کی صلبی اولاد (بیٹے، بیٹیوں) کا خاتمہ ہو گیا۔

حواشی

(۱) فسانۂ غالب۔ ص ۱۰۶ تا ص ۱۱۷

(۲) پروں (Perron) اگست ۱۷۵۳ء میں فرانس کے ایک مفلس خاندان میں پیدا ہوا۔ تلاش معاش میں پہلے پانڈیچری آیا۔ پھر ۱۷۸۱ء میں شمالی ہندوستان پہنچا۔ ۱۷۸۴ء میں بھرت پور کے راجا کے یہاں ۶۰ روپے ماہانہ پر فوج میں نوکر ہوا۔ اگست ۱۷۸۹ء میں مہاد جی سندھیا کی ایک بٹالین کا کمانڈر تھا (ان دنوں اس عہدے کو کپتان لفٹننٹ کہتے تھے) ۱۷۹۴ء میں دولت راؤ سندھیا نے اپنے بریگیڈ کے ساتھ پونے بلا لیا اور اس کی مدد سے ۱۱ مارچ ۱۷۹۵ء کو نظام کو شکست فاش دی۔ پروں ۲۲ اگست ۱۷۹۷ء تک پونے ہی میں رہا اور وہیں سے مراٹھا فوجوں کے جنرل کی حیثیت سے شمالی ہند میں بھیج دیا گیا۔ مرہٹوں کی سفارش پر ۱۲ فروری ۱۷۹۹ء کو شاہ عالم نے اسے ہفت ہزاری منصب عطا کیا۔ اس نے سندھیا کی طرف سے ۱۶/اپریل ۱۷۹۹ء کو قلعہ آگرہ اور ۱۲ اپریل ۱۷۹۹ء کو قلعہ علی گڑھ دوبارہ فتح کیے اور علی گڑھ کو اپنا ہیڈ کوارٹر مقرر کیا۔ ۱۸۰۳ء تک اس نے سندھیا کی ماتحتی میں دھوکے اور فریب سے کروڑوں روپیہ کمایا اور انگریزوں سے ساز باز کر کے ہندوستان سے نکل گیا۔ باقی عمر فرانس میں شان و شوکت سے گزاری۔ (فال آف دی مغل ایمپائر ۱۷ ص ۲۴۷/۲۴۵ اور دوسری کتب)

(۳) جنرل لیک (کمانڈر ان چیف) ۳۱ جنوری ۱۸۰۱ء کو کلکتہ پہنچا۔ کان پور کو جو اس وقت

برطانوی علاقوں کا سرحدی ہیڈ کوارٹر تھا، اپنا مسکن بنایا۔ ۱۸۰۲ء کا سرما سیبیں گزار اور فوجوں کو آراستہ کیا۔ ۴ ستمبر ۱۸۰۳ء کو سندھیا کی فوجوں کو جو فرانسیسی جرنیلوں کی کمانڈ میں تھیں، شکست دی۔ ۱۷ نومبر ۱۸۰۴ء کو فرخ آباد میں یشونت راؤ ہلکر کو شکست فاش دی۔ وغیرہ وغیرہ۔

(۴) بعض کے ''نزدیک یہ ثابت نہیں کہ سلجوقی اُنھی تورانیوں کی نسل سے تھے جن کی عظمت وبرتری کا افسانہ شاہنامے نے سنایا ہے''۔ لیکن محقق یہ نہیں بتاتے کہ یہ سلجوقی کس نسل سے تھے؟ تصدیق اور تغلیط کے لیے دیکھیے فرہنگ فارسی از ڈاکٹر معین۔ جلد پنجم۔ ص ۷۸۰۔

(۵) معین الملک عرف میر منو۔ محمد شاہ کے وزیر قمر الدین (متوفی ۱۱ مارچ ۱۷۴۸ء) کا بیٹا۔ اسی سال (۱۷۴۸ء) میں لاہور کا صوبیدار مقرر ہوا تاکہ احمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملوں کو روکا جاسکے۔ ابدالی کے تیسرے حملے (دسمبر ۱۷۵۱ء تا مارچ ۱۷۵۲ء) کے دوران میں معین الملک نے اپنے اہل خانہ اور خزانے کو راجا رنجیت دیوالی جموں کے پاس بھیج دیا تھا تاکہ وہ خطرے سے محفوظ رہیں۔ وفات ۳ نومبر ۱۷۵۳ء کو ملک پور (نزد لاہور) کے مقام پر زہر خورانی سے ہوئی (ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل VIII ص ۱۶۳ اور فال آف دی مغل ایمپائر ۱ ص ۲۵۹ تا ۲۷۵)

(۶) ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں: متوفی ۶ اپریل ۱۷۸۲ء ولادت اصفہان ۱۷۳۷ء عروج کا زمانہ مئی ۱۷۷۱ء سے شروع ہوا۔ غالب کے جدِ اعلیٰ بھی اسی عہد میں نجف خاں کی ملازمت میں آئے ہوں گے۔ اس سے پہلے نہیں۔

(۷) ''میرے بزرگوں کا پیشہ کھیتی باڑی ہے''۔ پھر (۱۸۵۲ء) یہ بھی کہا ہے: ''سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے'' جب صرف دو پشت پہلے ان کے بزرگ کھیتی باڑی کرتے تھے تو سو پشت سے اپنے آباؤ اجداد کو سپاہی پیشہ کہنا محض تعلّی ہے۔

(۸) یہ اقتباسات نسخہ ارسطو جاہ (مولوی رجب علی) میں شامل ہیں۔ جو مارچ ۱۸۵۲ء سے جون ۱۸۵۲ء تک کے عرصے میں لکھا گیا تھا۔ دیکھیے میرا مضمون: ''غالب۔ ارسطو جاہ۔

نسخہ کارسطو۔ مہر نیمروز آج کل اگست ۱۹۸۸ء

(۹) مہر نیمروز۔ ص ۱۲۔ ۱۳، از... نیاگان نامہ نگار... تار بائی... نیاگان قلم"۔

(۱۰) "زادشم نام پسر توراست کہ پدر پشنگ است" مہر نیمروز، از۔ ص ۱۳ حاشیہ

(۱۱) عالم گیر ثانی کا بیٹا شہزادہ مرزا عبداللہ، ۱۶/ اگست ۱۷۵۴ء کو عالی گوہر کا خطاب دیا گیا اور ۲۴ اپریل ۱۷۵۶ء کو شاہ عالم کا، اس خیال سے کہ آگے چل کر یہی شہزادہ بادشاہ بننے والا ہے۔ عالم گیر ثانی کے انتقال (۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء) پر شاہ عالم ۱۲ سال سے زیادہ عرصے تک خانہ بدوش رہ کر واپس دلّی آیا اور ۲۳ دسمبر ۱۷۵۹ء کو اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ تاہم باقاعدہ تخت نشینی ۱۷۷۱ء میں ہوئی۔ ۱۸۰۶ء میں انتقال کیا۔

(۱۲) ڈاکٹر یوسف حسین خاں (غالب اور آہنگ غالب ۱۹۷۱ء، ص ۴۷) فرماتے ہیں:
"غالب کا بیان ہے کہ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں حیدر آباد میں تین چار سو کی جمعیت سے ملازم تھے، لیکن ان کا یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ واضح رہے کہ نظام علی خاں کے زمانے میں جن کو یہ منصب حاصل تھا، ان کے تمام تر کاغذات دفتر دیوانی (موجودہ آندھرا پردیش آرکائیوز) میں محفوظ ہیں۔ میں نے خاص کر ان کاغذات کو دیکھا لیکن ان میں مرزا عبداللہ بیگ خاں کے متعلق کوئی کاغذ موجود نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں غالب نے اپنے چچا نصراللہ بیگ خاں اور اپنے والد کی جمعیت کو گڈمڈ کر دیا... چوں کہ نظام علی خاں کے منصب داروں کی فہرست میں ان کا نام نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات واضح ہے کہ وہ حیدر آباد میں بہت معمولی حیثیت کے کارگزار رہے ہوں گے۔"

(۱۳) غالب نے اپنی پنشن کے عرضی دعوے میں لکھا ہے کہ ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) میں ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں کے انتقال کے وقت ان کی دادی کی عمر ستر برس کی تھی۔

(۱۴) "پدرم پیشۂ پدر خویش داشت و ہم در کارزار از جامعہ گزاشت" مہر نیمروز۔ ص ۱۳

(۱۵) بیگم سمرو ۱۷۵۶ء تا جنوری ۱۸۳۶ء۔ اپنے فرانسیسی شوہر کے انتقال ۴ مئی ۱۷۷۵ء کے بعد سردھنہ کی جاگیر دار بنی۔ غلام قادر روہیلے نے ۱۷۸۷ء میں بادشاہ کو اندھا کیا تھا۔ بیگم سمرو انھیں دنوں میں بادشاہ کی مدد کو پہنچی تھی اور انھیں دنوں میں بادشاہ نے کچھ علاقے اس کو انعام دیے تھے۔ اس طرح یہ واقعہ ۱۷۸۸ء کا ہوا۔

غالب کی والدہ

غالب ایک خط (۱۹/اکتوبر ۱۸۵۸ء؟) میں منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:[۱]

"تمھارے دادا کے والد عہد نجف خاں و ہمدانی میں، میرے نانا صاحب مرحوم غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمھارے پردادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی، یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔"

نجف خاں کا انتقال ۶/اپریل ۱۷۸۲ء کو ہوا[۲] اور ہمدانی ۲۶ جولائی ۱۷۸۷ء کو مرہٹا فوجوں سے لڑتے ہوئے ایک حادثے میں مارا گیا تھا[۳] گویا غالب کے نانا خواجہ غلام حسین ۱۷۸۷ء تک فوجی ملازمت ترک کر چکے تھے۔ اسی خط کے باقی حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ غلام حسین آگرہ میں خاصی املاک کے مالک تھے۔

حالی لکھتے ہیں (یادگار غالب۔ ۱۸۹۷ء)

"(غالب کے والد) عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان[۴] کی بیٹی سے ہوئی تھی جو کہ سرکار میرٹھ کے ایک معزز فوجی افسر اور عمائد شہر آگرہ میں سے تھے۔ (ص ۱۰)... مرزا کے نانا کی جاگیر میں متعدد دیہات اور آگرہ شہر میں بہت بڑی املاک تھی۔" (ص ۱۶)

مگر ان سب پر بھاری غالب کا اوّلین بیان ہے جو انھوں نے اپنے پنشن کے مقدمے کے

عرضے دعوے میں دیا ہے۔ عرضی کی تاریخ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء ہے۔ لکھتے ہیں:

"میں نے آج تک اپنے والد مرحوم کے ترکے کو بیچ بیچ کر زندگی بسر کی ہے اس کے علاوہ میرے نانا خواجہ غلام حسین خان نے بھی کچھ جاداد چھوڑی تھی۔ وہ آگرے کے چوٹی کے عمائد میں سے، اور نواب نجف خان کے دربار کے مشہور امراء میں سے تھے ... میں نے بسر اوقات کے لیے والد اور نانا کی متروکہ جاداد بیچ ڈالی اور اس کے باوجود آج مجھ پر بیس ہزار کا قرض ہے۔"

فسانۂ غالب (ص ۳۱) میں غالب کی ایک فارسی تحریر کا عکس چھپا ہے جس پر سال کتابت ۱۸۰۴ء ہے مگر مالک رام صاحب دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ حقیقت میں ۱۸۴۰ء کی مکتوبہ ہے۔ اصل تحریر آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ذخیرۂ حبیب گنج میں ہے اور خداداد خاں اور ولی داد خاں کے نام ہے جو ظاہر ہے آگرہ ہی کے ہوں گے۔ نواب صدر یار جنگ کو یہ انھیں کے وارثوں سے دستیاب ہوئی تھی۔

یہ تحریر نہایت اہم ہے اس سے معلوم ہوا کہ:

۱۔ غالب کی والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔

۲۔ وہ ۱۸۴۰ء میں بلاشرکتِ غیرے دو حویلیوں کی مالک تھیں ۵۔

۳۔ یہ دونوں حویلیاں ان خاں صاحبان کے پاس لین دین (قرض) کے سلسلے میں رہن تھیں۔

۵۔ غالب کی والدہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور تمسک پر ان کے دستخط ہوتے تھے۔

۶۔ غالب نے یہ تحریر ان خان صاحبان کی درخواست پر بلحاظِ امر ناگزیر کہ لازم نفوس بشری ہے، ان کے اطمینان کے لیے لکھی تھی۔ غالب لکھتے ہیں کہ والدہ صاحبہ کو "خدائے جہاں آفریں"، "دیرگاہ سلامت" رکھے۔ اگر کہیں ان کو "امر ناگزیر کہ لازم ذاتِ انساں" ہے، پیش آجائے تو قرضے کی ادائی کی ذمہ داری ان کی (غالب کی) ہوگی۔

قرضہ اگر ان حویلیوں سے بیباق نہ ہو سکا تو بقیہ وہ اپنی گرہ سے ادا کریں گے۔

ظاہر ہے کہ ایسی تحریریں صرف اسی صورت میں لکھوائی جاتی ہیں جب کہ شخص مذکورہ بہت سال خوردہ اور ضعیف ہو۔ قرض خواہ ضرور چاہے گا کہ اس کے وارث اقرار کرلیں کہ اس کے انتقال کے بعد وہ خود قرض کی ادائی کے ذمہ دار ہوں گے، لہٰذا مالک رام صاحب کا یہ استدلال درست ہے کہ ۱۸۴۰ء میں غالب کی والدہ خاصی ضعیف (ممکن ہے خاصی بیمار) ہوں گی اور ہو سکتا ہے کہ انھیں ایام میں ان کا انتقال بھی ہو گیا ہو۔

اگر ۱۸۴۰ء کو غالب کی والدہ کا سال وفات مان لیا جائے اور اس بات کے پیش نظر کہ غالب کی بڑی بہن کی ولادت تقریباً ۱۷۹۵ء، غالب کی ۱۷۹۷ء اور غالب کے بھائی کی تقریباً ۱۷۹۹ء میں ہوئی تھی اور کہ ان کے والد کا انتقال ۱۸۰۲ء میں ہوا تھا، تو یہ تسلیم کرنا مشکل نہ ہوگا کہ انتقال کے وقت غالب کی والدہ کی عمر ۶۲۔۶۳ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔

اب رہا سوال ان دو حویلیوں کا تو ظاہر ہے کہ وہ قرضے کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ غالب کو تو کیا ملا ہوگا کہ وہ خود گھٹنوں گھٹنوں مقروض تھے۔ ابھی اکتیس ہی برس کے تھے کہ پنشن کے مقدمے کی درخواست میں انھوں نے لکھا تھا کہ ان پر اس وقت بیس ہزار روپے کا قرض ہے۔

غالب سے بڑی ایک بہن تھی، جن کا نام یا عرف چھوٹی خانم تھا۔ مالک رام صاحب اس سے استنباط کرتے ہیں کہ شاید غالب کی والدہ کو اپنے میکے میں "بڑی خانم" کہہ کے پکارا جاتا تھا(ذکر غالب۔ ۵واں ایڈیشن، ص ۲۷)

غالب کی والدہ آخر تک اپنے میکے (آگرہ) ہی میں رہیں۔ ان کے شوہر (غالب کے والد) مرزا عبداللہ بیگ خاں، ظاہر ہے انھیں کے ساتھ رہتے تھے اور میرزا دولھا، کے عرف سے مشہور تھے۔ وہ اگرچہ صاحب جاداد تھے، تاہم ان کی حیثیت خانہ داماد کی سی تھی۔ "میرزا دولھا" ہی کی مناسبت سے غالب کا عرف "مرزا نوشہ" قرار پایا۔

ممکن ہے غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کے خاندان میں افغان خون بھی ملا ہوا ہو، کیوں کہ اس زمانے میں وسط ایشیا سے ہندوستان آنے والے افغانوں کی شادیاں مغلوں اور

کشمیریوں میں ہوتی تھیں، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ غلام حسین کشمیری النسل تھے اور اس طرح غالب کی والدہ کشمیری نژاد تھیں[۶]۔ خواجہ کا لقب اور ان کے سکونتی مکان کا کشمیری محلے یعنی کشمیرن کے کٹرے میں ہونا بھی شاہد ہیں کہ غالب کے نانا کشمیری تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم (غالب اور آہنگ غالب ۱۹۷۱ء، ص ۶۴ حاشیہ) لکھتے ہیں:

> "مرزا فرحت اللہ بیگ کی خاندانی روایت کے بموجب غالب کی نسل میں افغان خون تھا۔ انھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ غالب کی والدہ کشمیری تھیں۔ ان کے خاندان کی خواتین کو اس بات کا علم تھا اور انھیں سے انھوں نے یہ سنا تھا۔۔۔۔"

مرزا فرحت اللہ بیگ کی خاندانی روایات کی تائید اس گفتگو سے بھی ہوتی ہے۔ جو قاضی عبدالودود اور رقیہ سلطان بیگم صاحبہ میں ۱۹۳۳ء میں ہوئی تھی۔ موصوفہ باقر علی خاں ابن زین العابدین خاں کی بہن (صحیح بیٹی) اور ضیاالدین احمد خاں نیر کی نواسی اور فخر الدین علی احمد صاحب اور حمیدہ سلطان بیگم صاحبہ کی والدہ تھیں۔ موصوفہ نے قاضی صاحب سے فرمایا تھا کہ غالب کی والدہ کشمیری تھیں۔ اس لیے ہمارے خاندان والے انھیں بنیا سمجھتے تھے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اپنی اس گفتگو کا ذکر خود ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب سے کیا تھا۔

اوپر کے بیانات کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کی والدہ عزت النساء بیگم نے تقریباً ۱۶ سال کی عمر میں شادی کی ۸۔۷ سال اپنے شوہر کے ساتھ گزارے اور پھر ۳۸ لمبے اور تاریک سال عالم بیوگی میں کاٹے۔ ان کے دونوں بیٹے مرزا غالب اور مرزا یوسف دلی جابسے اور یہ خود آگرے ہی میں رہیں۔ مرزا یوسف عین جوانی میں مجنون ہوگئے تھے اور مرزا غالب کبھی خود کفیل نہ ہوسکے، وہ اپنی والدہ کی دیکھ بھال کیا کر سکتے تھے۔ غالب کے والد اور نانا بہت سی املاک چھوڑ گئے تھے، جسے عزت النساء بیگم نے، جو امیرزادی تھیں آہستہ آہستہ، کچھ بیچ باچ کر، کچھ قرضوں کی نذر کر کے برابر کر دیا۔ غالب کی ۱۸۴۰ء کی تحریر جس کا ذکر اوپر آچکا ہے غماز ہے کہ ۱۸۴۰ء میں عزت النساء بیگم کی تحویل میں صرف ۲ حویلیاں باقی بچی تھیں جو خدا داد خاں اور ولی داد خاں کے پاس رہن تھیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

استدراک

نامہ ہائے غالب فارسی (مطبوعہ فروری ۱۹۶۹ء۔ ص۳۰ و ص۳۲۔۳۳) سے شبہہ ہوتا ہے کہ غالب کی والدہ ۱۳ ماہ اپریل ۱۸۲۸ء تک نہ صرف زندہ تھیں بلکہ دہلی میں میرزا یوسف کے ساتھ تھیں۔ غالب نے ۳۰ ماہ اپریل ۱۸۲۸ء کو دوسری باتوں کے علاوہ محمد علی خاں کو یہ بھی لکھا کہ متواتر پانچ ماہ کے علاج سے اب میرا بھائی میرزا یوسف (اپنی) بیوی، بیٹی اور ماں کو (اپنی) بیوی، بیٹی اور ماں سمجھنے لگا ہے۔ یاد رہے کہ بیوی کے علاوہ میرزا یوسف کی صرف ایک بیٹی تھی اور ماں جو مستقل طور پر آگرہ میں رہتی تھیں شاید میرزا یوسف کی بیماری کی وجہ سے دہلی رہ رہی ہوں گی۔

اسی طرح ایک اور خط (ص۹۷) میں لکھتے ہیں کہ ہفتہ بھر پہلے آگرہ (اکبر آباد) سے چار سو پچھتر (= ۴۷۵/) روپے کی ہنڈی ملی۔ ظاہر ہے کہ یہ ہنڈی غالب کی والدہ ہی نے بھیجی ہو گی۔ اس خط میں ۳ جون ۱۸۲۹ء کو عاشق علی خاں سفیر اودھ کے کلکتہ سے روانہ ہونے کا ذکر ہے۔ گویا خط جون ۱۸۲۹ء ہی میں لکھا گیا ہو گا یعنی والدہ غالب اس وقت تک زندہ تھیں۔

حواشی

(۱) خطوط غالب (مالک رام۔ ص۴۲۳)

(۲) ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں (فال آف دی مغل امپائر جادو ناتھ سرکار، حصہ سوم، ص۱۵۵) مغل سلطنت کا آخری بڑا ستون تھا۔ اس میں مغلیہ افواج کے جنرل کی حیثیت سے نجیب الدولہ کی سی قابلیت تو نہ تھی اور نہ ہی وہ شہ زوری تھی جس کا ماضی میں مغلیہ سردار مظاہرہ کر چکے تھے۔ تاہم اس کی سربراہی میں مغلیہ فوجیں کسی حد تک انگریزی فوجی طور طریقوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئی تھیں، مگر اس کی موت نے یہ آخری لو بھی گل کر دی۔ ولادت، اصفہان ۱۷۳۷ء (ایضاً۔ ص۲۰)

(۳) محمد بیگ ہمدانی (فال آف دی مغل ایمپائر۔ سرکار۔ حصہ سوم ص ۲۵۸) ہمدانی پہلے نجف خاں کی فوج میں کپتان تھا اور بہت ہوشیار تھا مگر اس میں فریب اور سفاکی دونوں موجود تھے۔ وہ نجف خاں کے انتقال پر اس کا جانشین بننے کا متمنی تھا، مگر ایسا نہ ہو سکا، تاہم وہ مرتے دم تک مغلیہ فوجوں کا ایک اہم کمانڈر رہا۔

(۴) علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۳۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں کہ لفظ کمیدان فرانسیسی لفظ (Commandant) یعنی "ک مودان" کا اردو تلفظ ہے۔ فرانسیسی فوج کا یہ عہدہ برطانوی فوج کے کمانڈر آفیسر یا میجر کے برابر تھا۔ اس طرح خواجہ غلام حسین زیادہ متمول اور صاحب ثروت نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر وہ "Commander De Place" ہوں گے یعنی "کمیدان قلعہ" تو یقیناً بڑی حیثیت کے ہوئے۔

(۵) غالب نے اپنے خط بنام شیونرائن میں جن حویلیوں کو اپنے والد اور نانا کی املاک بتایا ہے وہ یہ ہیں۔ ۱۔ بڑی حویلی یعنی کالا (کلاں) محل، ۲۔ اس کے پاس کٹھیا والی حویلی، ۳۔ سلیم شاہ کے تکیے کے پاس کی حویلی، ۴۔ کالے (کلاں) محل سے لگی ہوئی حویلی۔ "اور ایک کٹرہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک کٹرہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔" ان میں سے کوئی دو حویلیاں غالب کی والدہ کی ملکیت تھیں۔ شاید ایک تو یہی کالا محل ہوگا، جس کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر (غالب کی) نشست تھی۔

(۶) غالباً یہی وجہ ہے کہ غالب نے ہمیشہ اپنی ددھیال ہی پر فخر کیا ہے، ننھیال پر نہیں۔

غالب کی تاریخِ ولادت

مرزا غالب اپنے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں، کے انتقال کے وقت صرف پانچ برس کے تھے۔ ان پانچ برسوں میں مرزا عبداللہ بیگ خان پیشۂ سپاہ گری کے باعث اکثر مہمات پر آگرے سے باہر رہا کیے۔ وہ ایسی ہی ایک مہم میں راجا الور کی طرف سے لڑتے ہوئے بمقام راج گڑھ ۱۸۰۲ء میں مارے گئے۔ غالب خود کہتے ہیں ؎

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست
در خاکِ راج گرہ پدرم را بود مزار

یعنی گواہ کی ضرورت نہیں خود چل کر دیکھ لو، مرے باپ کا مزار راج گڑھ میں موجود ہے۔

ظاہر ہے ایسی حالت میں غالب کو اپنی تاریخ ولادت اپنی ماں، دادی اور اپنے دوسرے بزرگوں ہی سے جن میں ان کے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان اپیش پیش کہے جا سکتے ہیں، معلوم ہوئی ہوگی۔ چنانچہ ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ غالب کی تاریخ ولادت وہی ہے جو غالب نے خود صراحتاً کئی دفعہ لکھی، ان کی آنکھیں دیکھے ہوؤں میں آزاد اور حالی نے لکھی، بعد ازاں ماہرین غالبیات میں، قاضی عبدالودود، عرشی، مالک رام، مسعود حسین رضوی، غلام رسول مہر اور شیخ محمد اکرام نے لکھی۔ مگر عجیب ماجرا ہے کہ غالب کے انتقال کے ۹۸ برس بعد ۱۹۶۷ء میں مسلم ضیائی نے لکھا کہ غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو نہیں بلکہ ۸ رجب ۱۲۱۳ھ کو پیدا ہوئے تھے، اس کے دو سال بعد یعنی غالب کی وفات کے سو سال بعد ۱۹۶۹ء میں سید محمد حسین رضوی نے فرمایا کہ وہ ۸ رجب ۱۲۱۳ھ کو بھی نہیں بلکہ ۸ رجب ۱۲۱۱ھ مطابق ۸ جنوری ۱۷۹۷ء کو پیدا ہوئے۔ یہ دونوں تاریخیں جنھیں اب تک کسی نے تسلیم

نہیں کیا اس زائچے کی مدد سے حاصل کی گئی ہیں جو غالب کے کلیات فارسی مطبوعہ نول کشور ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ زائچہ خود غالب کا فراہم کردہ نہیں۔ ممکن ہے ضیاالدین احمد خاں نیر ورخشاں نے فراہم کیا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک زائچے سے دو مختلف سال ولادت کیوں کر برآمد ہوئے؟ ظاہر ہے زائچہ غلط ہے یا زائچہ داں۔

پھر غالب کی وفات سے ایک سو پندرہ سال بعد ڈاکٹر حنیف نقوی نے بہت سی ژرف بینی کے بعد ایک طویل مقالہ غالب کی تاریخ ولادت کے سلسلے میں لکھا اور یہ نتیجہ نکالا کہ غالب کی تاریخ ولادت نہ ہی ۸ رجب ۱۲۱۲ھ ہے نہ ۸ رجب ۱۲۱۳ھ یا ۱۲۱۱ھ، بلکہ ۸ رجب ۱۲۰۸ھ ہے۔

مگر ان تینوں محترم محققوں نے ایک فیصلہ تو کر ہی دیا وہ یہ کہ انھوں نے غالب کی دی ہوئی تاریخ اور مہینے سے کُلّی اتفاق کیا اب رہ گیا سال ولادت تو اس کی خود غالب نے کم از کم چھ بار صراحت فرمائی ہے تین بار خطوں میں اور تین بار تاریخی مادوں میں بہ حساب ابجد۔ جو لوگ تاریخی مادّے نکالنے کے فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ مادّے کے نکالنے میں کتنی فکر کرنی پڑتی ہے اور جب وہ اعداد کے برابر آجائے تو اس میں کسی قسم کے تسامح کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

یہ چھیوں اندراجات اتنی مرتبہ دہرائے جاچکے ہیں کہ کسی شخص کو غالب کے دیے ہوئے اور ماہرین غالبیات کے مانے ہوئے غالب کے سال ولادت کے بارے میں شبہہ باقی نہیں رہنا چاہیے (ذکر آگے آئے گا) میں ان کے علاوہ ایک اور بات کی طرف دھیان دلانا چاہتا ہوں۔

غالب ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۲۱ھ میں شعر کہنے لگے۔ فارسی کا ذوق ابتدا ہی سے تھا۔ فارسی میں سوچتے تھے اردو میں لکھتے تھے۔ ۱۲۳۱ھ تک کے کہے ہوئے تقریباً پونے دو ہزار اشعار دریافت ہو چکے ہیں۔ یہ سب بیدل کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۱۹ سال کی تھی۔ تقریباً ۱۲۴۰ھ یعنی ۲۸ سال کی عمر کو پہنچ کر انھوں نے طرز بیدل کو خیر باد کہہ دیا۔ مگر ایک عمر تک بیدل غالب کے دل و دماغ پر بُری طرح مسلط رہے چنانچہ وہ ہر طرح بیدل کی پیروی کرتے تھے۔ بیدل نے اپنے سال ولادت کا قطعہ اس طرح

کہا ہے۔

بسا لے کہ بیدل بملک ظہور ز فیض ازل تافت چوں آفتاب
بزرگے خبردا واز مولدش کہ "ہم فیض قدس" است وہم "انتخاب"
۱۰۵۴ھ ۱۰۵۴ھ

غالب نے بھی ہو بہو بیدل کی پیروی کی اور یہ رباعی کہی۔

غالب چو زناسازی فرجام نصیب ہم بیم عدو دارم وہم ذوق حبیب
تاریخ ولادت من از عالم قدس ہم "شورش شوق" آمد وہم لفظ "غریب"
۱۲۱۲ھ ۱۲۱۲ھ

بیدل نے اپنا سال ولادت فیض قدس اور انتخاب میں کہا اور غالب نے شورش شوق اور غریب میں دونوں مادوں سے ۱۲۱۲ھ بر آمد ہوتا ہے [۳]۔

جب ۱۲۵۳ھ (۳۸ / ۱۸۳۷ء) میں غالب نے اپنے دیوان فارسی کے مسودے کی تکمیل کے بعد تقریظ لکھی تو اس میں یہ رباعی بھی درج کی اور اس سے پہلے لکھا (دیکھیے دیوان غالب فارسی۔ پہلا ایڈیشن ص ۵۰۴)

"امروز کہ از ہجرت خاتم الانبیاء — یک ہزار و دو صد و پنجاہ و سہ سال گزشتہ — مشاہدۂ آثار سال چہل و کیم است ...."

(آج جب کہ ہجری سنہ ۱۲۵۳ء ہو چکا ہے — میری عمر اکتالیس سال کی ہے۔)

اب ۱۲۵۳ھ سے ۴۱ سال نکال دیجیے پھر وہی ۱۲۱۲ھ رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر حنیف فوق کہتے ہیں کہ غالب کا بیان کردہ سال ولادت ۱۲۱۲ھ "دانستہ غلط بیانی" ہے۔ اس کا بڑا سبب "مقدمۂ پنشن کے سلسلے میں ان کا یہ استدلال معلوم ہوتا ہے کہ نصر اللہ بیگ خان کے انتقال کے بعد نواب احمد بخش خان نے خاندانی پنشن کی تقسیم کے معاملے میں ان کے ساتھ جو ناانصافیاں بلکہ دھاندلیاں کیں، ان کے خلاف وہ اس لیے بروقت صدائے احتجاج بلند نہ کر سکے کہ اس زمانے میں وہ اور مرزا یوسف دونوں کم سن تھے اور خاندان میں چند عورتوں اور ان دو کم سن بچوں کے علاوہ کوئی اور موجود نہ تھا۔ یہ بات اضافۂ پنشن کے لیے اس پہلی درخواست میں

ایک اہم شق کی حیثیت رکھتی ہے۔ (اس) میں انھوں نے چچا کے انتقال کے وقت اپنی عمر نو سال اور مرزا یوسف کی عمر سات سال بتائی ہے۔"

ڈاکٹر نقوی صاحب کا یہ استدلال کمزور ہے کیوں کہ اگر غالب کی عمر چچا کے انتقال کے وقت ۱۳ سال بھی ہوتی تو بھی وہ اس قابل نہ سمجھے جاسکتے کہ بروقت صدائے احتجاج بلند کر سکتے۔

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ غالب نے اپنے سال ولادت کی کم از کم چھے بار صراحت فرمائی ہے، تین بار خطوں میں اور تین بار تاریخی ماڈوں میں بحساب ابجد۔

۱۔ مکتوب بنام علائی جون ۱۸۶۱ء

"میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ ہجری میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔"

۲۔ مکتوب بنام علائی ۱۰ جنوری ۱۸۶۴ء

"میں ۱۲۱۲ ہجری میں پیدا ہوا ہوں۔"

۳۔ مکتوب بنام سیاح ۱۳ مئی ۱۸۶۵ء

"۱۲۸۲ ہجری شروع ہوئی۔ ۱۲۱۲ھ کی ولادت ہے۔"

۴۔ "احسن مارہروی کے پردادا صاحب عالم مارہروی نے غالب سے ان کا سال ولادت پوچھا اور لکھا کہ میری ولادت (۱۲۱۱ھ) لفظ "تاریخ" سے نکلتی ہے۔ مرزا نے جواب میں یہ شعر لکھا۔

ہاتف غیب سن کے یہ چیخا ان کی "تاریخ" میرا "تاریخا"

۱۲۱۱ھ ۱۲۱۲ھ

۵۔ شورشِ شوق ــــــــ ۱۲۱۲ھ

۶۔ غریب ــــــــ ۱۲۱۲ھ

غالب نے جس طرح ان بیانات میں سال ولادت کا حتمی اظہار کیا ہے۔ اس طرح اور کہیں نہیں کیا۔ اس لیے غالب کی تاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ تسلیم کرنے میں کوئی بات مانع نہیں تاوقتیکہ خود غالب کا حتمی طور پر بیان کردہ کوئی اور سال ولادت دریافت نہ ہو جائے۔

استدراک

ا۔ ماہنامہ "سب رس" حیدر آباد، بابت ماہ مارچ ۱۹۸۹ء کے صفحہ ۷ا پر اپنے مقالے میں جناب ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب فرماتے ہیں:

"مولوی کریم الدین نے مرزا غالب کی عمر کے بارے میں پہلی مرتبہ بتایا ہے کہ ۱۲۶۴ھ / ۱۸۳۸ء میں ساٹھ برس کے قریب تھی۔ مولوی آغا احمد علی احمد کے تذکرے "ہفت آسمان" میں ہے کہ "لارنس گزٹ میرٹھ مطبوعہ ۲۷ فروری ۱۸۶۷ء نوشتہ عمر او تخمیناً ہشتاد و دو سال بودہ است،" باوجودیکہ غدر سے پہلے ہجری سال لکھنے اور حساب میں اسی کو کام میں لانے کا معمول تھا۔ مولوی کریم الدین نے عموماً عیسوی سنہ پر زیادہ زور دیا ہے۔ چنانچہ ان کے بیان کے مطابق مرزا غالب کا سال ولادت ۱۷۸۸ء میں مرزا کی عمر بیاسی برس کے قریب ہوگی اور یہی بات "لارنس گزٹ" میں مذکور ہے۔ اپنے بارے میں خود مرزا غالب کا کہنا ہے:

"میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں۔"

یہاں ان سے تحریر میں غلطی ہوگی یعنی ۱۲۰۲ھ کو ۱۲۱۲ھ لکھ گئے ہوں گے۔ بعد کے لوگوں نے اسی کے مطابق مادہ تاریخ "غریب" مقرر کرلیا اور یہی ان کا سال ولادت مشہور ہو گیا۔"

اس مفروضے کی تغلیط کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ غالب نے تاریخی مادے "شورق شوق" اور "غریب" برسوں پہلے فکر کیے تھے اور ۱۲۱۲ھ کا سنہ ہندسوں میں بہت بعد میں لکھا۔ مادے کم از کم ۳۸ / ۱۸۳۷ء میں کہے جا چکے تھے اور "آٹھویں رجب ۱۲۱۲ ہجری" والا جملہ انھوں نے اپنے مکتوب محررہ جون ۱۸۶۱ء بنام علائی میں لکھا تھا۔

۲۔ ہمیں معلوم ہے کہ کلکتہ میں جو عرض داشت متعلقہ پنشن غالب نے ۲۸ ماہ اپریل ۱۸۲۸ء کو داخل کی تھی۔ اس میں انھوں نے لکھا کہ جب ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کی موت (۱۸۰۶ء) واقع ہوئی اس وقت ان کی عمر ۹ سال تھی۔ ۱۳ ماہ اپریل ۱۸۲۸ء کا مرزا یوسف

کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط جو کلکتے میں غالب کو موصول ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ والدۂ غالب اس وقت دہلی میں موجود تھیں۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ والدہ کی طرف سے مالی تعاون غالب کو ملتا ہی رہتا تھا۔ حتی کہ قیام کلکتہ کے دوران (لگ بھگ جون ۱۸۲۹ء) میں ان کی والدہ نے اُنھیں =/۵۷۴ روپے کی ہنڈی بھیجی تھی۔ جب غالب اپنی والدہ کے اتنے قریب تھے اور یہ قربت تقریباً ۱۸۴۰ء تک رہی تو کیا یہ ممکن ہے کہ غالب نے اپنی عمر اور اپنی تاریخ ولادت کی تصدیق اپنی والدہ سے کبھی نہ کی ہوگی اور کیا ۱۸۲۸ء تک جب کہ غالب کی عمر صرف ۳۱ سال تھی۔ غالب کے اپنے خاندان، ننھیالی خاندان اور خاندان لوہارو کے سب بڑھے بوڑھے مر چکے تھے اور کوئی غالب کی تاریخ یا سال ولادت جاننے والا باقی نہ رہا تھا جو غالب کی غلط بیانی پر اسے ٹوکتا!

۳۔ کیا غالب اس عرضی دعوے میں جس پر انھیں اتنی امیدیں تھیں اور جو کسی قاضی کی عدالت میں نہیں بلکہ انگریزی عدالت میں دائر ہوا تھا، اپنی چھوٹی عمر درج کرنے کی جرأت کر سکتے تھے جب کہ ابھی ان کی صحیح تاریخ ولادت جاننے والے بیسیوں بڑے بوڑھے موجود تھے؟ اگر عمر غلط ہوتی تو اسی بات پر ان کے دشمن اس دعوے کو خارج کرا سکتے تھے۔

۴۔ بعض محقق اس بات پر زور دیتے ہیں کہ غالب ادھیڑ عمری میں اپنی بیان کردہ عمر سے کہیں زیادہ کے دکھائی دیتے تھے لہٰذا ان کا سال ولادت ۱۷۹۷ء سے بہت پہلے کا ہونا چاہیے۔ عرض ہے کہ ایک دفعہ ڈاکٹر عابد پشاوری صاحب (ہیڈ آف دی اردو ڈپارٹمنٹ، جموں یونی ورسٹی) سے میں نے ان کی عمر پوچھی تو انھوں نے فرمایا "دیکھنے میں اسّی سال مگر اصل میں پچاس سال" کیا آخری عمر میں غالب کا بھی یہی حال تھا؟

۵۔ کلیات نظم فارسی مطبوعہ لکھنو میں سال ترتیب کلیات ۱۲۷۸ھ بتایا ہے اور عمر "شست و ششم" بتائی ہے گویا تاریخ ولادت (۱۲۷۸۔ ۶۶ =) ۱۲۱۲ھ ہوئی۔ بقول قاضی عبدالودود (کچھ غالب کے بارے میں۔ حصہ اول مطبوعہ 1995ء۔ ص ۶۷) غالب کے کلیات نظم فارسی کے قلمی نسخے (کاتب لالہ چھجمل پدر جواہر سنگھ جوہر۔ ربیع الاخر ۱۲۵۴ھ) میں "غالب نے سال ترتیب کلیات ۱۲۵۳ھ بتایا ہے اور عمر کے متعلق لکھا

ہے ..ور مشاہدۂ آثار سال چہل ویکم است... ..." یعنی (۱۲۵۳-۴۱ =) ۱۲۱۲ھ سال ولادت ہے۔ چھج مل غالب کے گہرے دوست تھے اور عمر میں ان سے چند سال بڑے ہی تھے۔ کیا چھج مل سے غالب کی عمر چھپی ہوئی ہوگی۔

حواشی

(۱) قیاس ہے کہ خواجہ غلام حسین کمیدان انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں تک زندہ رہے ہوں گے۔

(۲) پہلے (۱۲۵۰ھ مطابق ۱۰ مئی ۱۸۳۴ء تا ۲۹ ماہ اپریل ۱۸۳۵ء میں) اس رباعی کی شکل یہ تھی۔

"آنم کہ زنا سازی فرجام نصیب
ہم بیم عدو دارم وہم ذوق حبیب
زا سایش بہرہ ٔ ندارم غالب
تاریخ ولادتم بود لفظ 'غریب' "

پنج آہنگ کا قدیم ترین خطی نسخہ
حنیف نقوی
مطبوعہ ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴

(۳) بعض احباب کو اعتراض ہے کہ غالب نے تاریخ سال ولادت اپنی آخری عمر ہی میں کیوں بتایا۔ ان کا اشارہ مکتوب غالب بنام علائی (جون ۱۸۶۱ء) کی طرف ہے۔ جس میں درج ہے "میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔" اول تو یہ

الزام ہی بے بنیاد ہے کیوں کہ انھوں نے زبانی اپنی عمر، تاریخ یا سال ولادت بیسیوں دفعہ بتائے ہوں گے۔ مگر ان کا ریکارڈ رکھنا کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔ دوسرے انھوں نے ۱۸۲۸ء میں داخل کی گئی پنشن کی درخواست میں لکھا ہے کہ جب ان کے چچا نصر اللہ بیگ خان کا انتقال (۱۸۰۶ء) ہوا ہے "اس وقت میری عمر ۹ برس کی تھی اور میرے بھائی کی سات کی۔" اس درخواست کے وقت غالب ۳۱ سال کے تھے۔

غالب کا نام

جناب ممتاز حسین نے اپنی کتاب "غالب۔ ایک مطالعہ" کراچی (پاکستان) سے بھجوائی۔ میں نے کتاب پڑھی اور اس سے مستفید ہوا۔ کئی اور باتوں کے علاوہ جواب میں، میں نے یہ بھی لکھا کہ آپ نے جو ص ۲۳ پر غالب کا نام "مرزا محمد اسد اللہ خاں" لکھا ہے اور حاشیے میں صراحت کی ہے کہ پورا نام یہی تھا، یہ درست نہیں۔ پورے نام میں بیگ بھی شامل تھا اور محمد نام کا جزو نہیں رہ گیا تھا۔ یعنی محض "اسد اللہ بیگ خاں" ہونا چاہیے۔ ممتاز حسین صاحب نے جواب میں فرمایا:

> "اس وقت زبانی میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔ ایک بات لکھنا چاہتا ہوں کہ غالب نے ایک خط میں اس کا ذکر کیا ہے کہ نام محمد پر جان نثار۔ لیکن اس کے بعد کا جملہ یاد نہیں۔ مفہوم یہی ہے کہ میں نے اسے Dropped کر دیا۔ بہر حال آپ نے جو لکھا ہے اس پر غور کروں گا۔" (۵ جولائی ۱۹۸۳ء)

خط پڑھ کر فوراً یاد آ گیا کہ کچھ ایسی بات ہے تو سہی۔ چنانچہ کھوج شروع ہوئی غالب کی تحریریں اور مہریں دیکھی گئیں۔ پہلے غالب کی تیسری مہر اس کی شاہد نکلی۔ ملاحظہ کیجیے۔

محمد اسد اللہ خاں
۱۲۳۸ھ

جو مطابق ہے ۲۳۔۱۸۲۲ء کے۔ اس وقت غالب ۲۵۔۲۶ برس کے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دلی کے علماء بہت بڑے مذہبی مباحثے میں الجھے ہوئے تھے اور جس میں انھیں

مولوی فضل حق خیر آبادی کے موقف کے مطابق ایک مثنوی بھی کہنی پڑی تھی اس سے شاید انھیں مذہبی امور سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ جناب مالک رام (فسانۂ غالب ص ۸۴) کے نزدیک "اس میں دو محرک کارفرما" ہوئے۔ اول نواب الٰہی بخش خاں کی عزیز داری جو خود صوفی اور تصوف کے حلقوں میں خاصے معروف تھے۔ ... دوسرا اثر مولوی فضل حق خیر آبادی کا تھا۔ (چنانچہ) اس سے پہلے ان کی مہر پر کندہ تھا۔ اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ، اب محمد اسد اللہ خاں، کیا ان کی قلب ماہیت کا اس سے زیادہ کوئی اور ثبوت درکار ہے؟ گویا محمد اسد اللہ خاں، ایک عارضی مذہبی جوش کے تحت تھا اور یہ غالب کا اصلی نام نہ تھا۔ لیکن غالب نے پنشن کے اضافے کے لیے جو درخواست ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء (فسانۂ غالب ص ۱۱۴) کو کلکتہ میں گورنر جنرل کے نام دی تھی۔ اس میں درج ہے:

"میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے وارثوں میں (مرحوم کی بہن کے علاوہ) یوسف علی خاں میرا بھائی ہے جو مرحوم کا بھتیجا ہے۔ (اور) آپ کا یہ درخواست گزار ہے۔ میرا نام محمد اسد اللہ خاں ہے اور عرف مرزا نوشہ "

گویا قانونی طور پر اقرار کرتے ہیں کہ ان کا نام اسد اللہ خاں نہیں، بلکہ "محمد اسد اللہ خاں" ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ "محمد" واقعی ان کے نام کا حصہ تھا اور وقتی طور پر مذہبی دلچسپی کے زیر اثر بعد میں اضافہ نہیں کر لیا گیا تھا۔ یہ نکتہ بھی خاص اہمیت کا حامل ہے کہ غالب کی یہ مہر (۱۲۳۸ھ) تقریباً ۳۰ سال تک استعمال میں رہی۔ تاہم ۱۲۶۷ھ (۵۱-۱۸۵۰ء) والی مہر میں پھر صرف "اسد اللہ خاں" ہے اور پھر یا "اسد اللہ الغالب" (۱۲۶۹ھ مطابق ۵۳-۱۸۵۲ء) اور غالب (۱۲۷۸ھ مطابق ۶۲-۱۸۶۱ء) لیکن غالب اس تبدیلی کا سبب اپنے ایک خط بنام تفتہ (مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء) میں کھل کر بیان کرتے ہیں:

"سنو صاحب۔ لفظ مبارک میم، حا، میم، دال۔ اس کے ہرف پر میری جان نثار ہے۔ مگر چوں کہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ یعنی "محمد اسد اللہ خاں" نہیں لکھا تھا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا میرزاد مولانا نواب، اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے

جو چاہو سو لکھو۔"

لیکن خود غالب نے اپنے لکھے پر کلی طور پر عمل نہیں کیا چنانچہ "ازالہ حیثیت عرفی" کی نالش کی درخواست پر، جو انھوں نے ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کو داخل عدالت کی (احوال غالب ص ۱۴۰) پہلے اپنا نام "اسداللہ خاں غالب" لکھا، پھر اسداللہ خاں" اور وکالت نامے پر جو ۱۴(۴) دسمبر ۱۸۶۷ء کو لکھا گیا اور جس کے دبیی پرشاد اور منشی وزیر علی گواہ ہیں، دستخط "محمد اسداللہ خاں" ثبت کیے۔

اس مقدمے کی ایک اور درخواست مورخہ ۲۳ جنوری ۱۸۶۸ء پر غالب پھر اپنا نام اسداللہ خاں غالب لکھتے ہیں۔ اس سے پہلے ۱۵ دسمبر ۱۸۶۷ء کو ان کے وکیل عزیزالدین نے خود کو "وکیل اسداللہ خاں پنشن اور سرکاری عرف مرزا نوشہ" لکھا ہے۔

یہ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ پورا نام "اسداللہ بیگ خاں" تھا۔ مگر غالب نے اپنے دادا، والد اور چچا کے برعکس بیگ کو اپنے نام کا جزو شاید ایک سے زیادہ بار نہیں بنایا[1]۔ حتی کہ پنشن کی درخواست میں اپنے سگے بھائی کا نام بھی صرف "یوسف علی خاں" لکھا۔

حیرت کی بات ہے کہ قانونی درخواستوں میں بھی غالب نے اپنا نام بیان کرنے میں احتیاط نہیں برتی[2]۔ بہر حال مرزا کا صحیح نام "محمد اسداللہ بیگ خاں" ہی تھا۔

حواشی

(۱) اردوئے معلیٰ طبع اوّل ص ۳۱۳۔ خط بنام انورالدولہ شفق۔ نگاشتہ ۱۸/اکتوبر ۱۸۵۵ء لفظ "ارنی" کے تلفظ کی وضاحت کرتے ہوئے بیدلؔ کے شعر کے بعد، غالب اپنا ایک فارسی شعر درج کرنے سے پہلے شاعر کا یعنی اپنا نام یوں لکھتے ہیں "اسداللہ بیگ غالب"۔ یہاں پورے نام سے دو لفظ غائب ہیں۔ شروع کا محمد اور آخر کا خاں۔

(۲) اردو دیوان کے دیباچے میں غالب نے اپنے نام کی سند یوں دی ہے۔ "این نقش بغیر آمدہ نقاش کہ بہ اسداللہ خاں موسوم بہ مرزا نوشہ معروف بہ غالب متخلص است ....."

غالب کا مذہب

مرزا غالب شیعی تھے۔ اپنے ایک خط بنام نواب علاء الدین احمد خاں علائی، مورخہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء میں لکھتے ہیں:

"(میں) موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لاالہ الااللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الااللہ، لاموثر فی الوجود الااللہ، سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی، یہ خاتم المرسلین اور رحمتہ اللعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی، بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے، ثم حسن ثم حسین، اسی طرح تامہدی موعود علیہ السلا۔ ع

بریں زیستم ہم بریں بگزرم

حضرت مجتہد العصر سلطان العلماء مولوی سید محمد صاحب لکھنوی کو ایک خط (مشمولہ پنج آہنگ مطبوعہ ۱۸۵۳ء) میں لکھتے ہیں:

"اکنوں گاہ آنست کہ بساط شر در نوردم و بہ ہنجار غزل نوانج گردم، تاپدید آید کہ خاک نشین کنج ناکامی در تہ کلاہ نمدچہ شور در سردارد۔۔۔"

(اب موقع ہے کہ بساط شر کو الٹ دوں اور غزل کے قاعدے سے نوانجی کروں تاکہ ظاہر ہو جائے کہ کنج ناکامی کا خاک نشین (یعنی

غالب) اپنی کلاہ نمد سے ڈھکے ہوئے سر میں کیا شور رکھتا ہے۔)

یہ بیان اسی مثنوی سے متعلق ہے جو غالب نے شاہ ظفر کی طرف سے، شیعت سے برائت کے مضمون کی، ۵۴ / ۱۸۵۳ء میں کہی تھی۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ غالب بھی اس کی زد میں آ گئے تھے۔ انھوں نے زچ ہو کر یہ خط سلطان العلماء مولوی سید محمد لکھنوی کو لکھا تھا۔ اس بیان کا اردو ترجمہ جناب مہاجر نے (اقتباس از پنج آہنگ اردو ترجمہ مطبوعہ پاکستان) یہ کیا ہے۔

"اب وقت آگیا ہے کہ غزل کے پردہ میں اپنے عقیدہ کا اظہار کروں تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ کنج ناکامی کے خاک نشین کے دل میں کیا ہے۔"

اس غزل سے غالب کی مراد کون سی غزل ہے جس میں وہ اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتے تھے؟ حاشیے میں مہاجر صاحب۔

مشغول حق ہوں بندگی بو تراب میں

کے مقطع والی غزل کو یہ غزل قرار دیتے ہیں، مگر یہ درست نہیں کیوں کہ یہ غزل دیوان غالب مطبوعہ ۱۸۴۷ء کے متن میں موجود ہے گویا ۱۸۴۷ء یا اس سے پہلے کہی گئی تھی۔ اسے ۵۴ / ۱۸۵۳ء کی فکر کردہ نہیں کہا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کا اشارہ اس غیر متداول ۲۱ شعری سلام کی طرف ہے، جو ۱۸۵۴ء میں کہا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو۔

سلام[۲] اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو — تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اُس کو

نہ بادشاہ، نہ سلطاں، یہ کیا ستائش ہے؟ — کہو کہ خامس آل عبا کہیں اُس کو
خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی؟ — کہو کہ رہبر راہ خدا کہیں اُس کو
خدا کا بندہ، خداوندگار بندوں کا — اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اُس کو؟
فروغ جوہر ایماں، حسین ابن علی — کہ شمع انجمن کبریا کہیں اُس کو
کفیل بخشش اُمت ہے بن نہیں پڑتی — اگر نہ شافع روز جزا کہیں اُس کو
مسیح جس سے کرے اخذ فیض جاں بخشی — ستم ہے، کشتۂ تیغ جفا کہیں اُس کو
وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل، سبیل — شہید تشنہ لب کربلا کہیں اُس کو

عدو کے سمع رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
کہ جن وانس وملک سب بجا کہیں اُس کو

بہت ہے پایۂ گردِ رہِ حسین، بلند
بقدر فہم ہے، گر کیمیا کہیں اُس کو

نظارہ سوز ہے یاں تک کہ ہر ایک ذرہ خاک
کہ لوگ جوہر تیغ قضا کہیں اُس کو

ہمارے درد کی یارب، کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اُس کو

ہمارا منھ ہے کہ دیں اس کے حسن صبر کی داد؟
مگر نبی و علی مرحبا کہیں اُس کو

زمام ناقہ، لف اس کے میں ہے کہ اہل یقیں
پس او حسین علی، پیشوا کہیں اُس کو

وہ ریگ تفتہ وادی پہ گام فرسا ہے
کہ طالبان خدا رہنما کہیں اُس کو

امام وقت کی یہ قدر ہے کہ اہل عناد
پیادہ لے چلیں اور نا سزا کہیں اُس کو

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں
علی سے آکے لڑے اور خطا کہیں اُس کو

یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
برا نہ ماہیے، گر ہم برا کہیں اُس کو

علی کے بعد حسن اور حسن کے بعد حسین
کرے جوان سے برائی، بھلا کہیں اُس کو؟

نبی کا ہو نہ جسے اعتقاد، کافر ہے
رکھے امام سے جو بغض، کیا کہیں اُس کو؟

بھرا ہے، غالب دلخستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اُس کو

گویا غالب کا عقیدہ (یا اس کے کلاہ نمد سے ڈھکے ہوئے سر میں شور) وہی ہے جو اس غزل (سلام) میں بیان ہوا ہے۔

اوپر بیان کیے گئے دونوں بیانات "اقرار باللسان" کا درجہ رکھتے ہیں۔ غالب عمر بھر وقتاً فوقتاً اپنے شیعی ہونے کا اعلان کرتے رہے ہیں۔ ان کے مخاطب سُنّی اور شیعی احباب دونوں تھے۔ ایسے بیانات کا دہرانا محض مضمون کو طول دینا ہے اس لیے ان سے احتراز کیا جاتا ہے اور صرف ایک تقابلی واقعہ اور درج کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے کہ نواب ضیاالدین احمد خاں نیر ورخشاں (۱۸۲۱ء تا ۱۸۸۵ء) نے مل ملا کر غالب کی تجہیز و تکفین شیعی طریقے پر نہیں ہونے دی تاکہ یہ تاثر پیدا ہو سکے کہ غالب شیعی نہ تھے حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ غالب شیعی[۳] ہیں مگر وفات غالب کے کچھ سال بعد جب مولانا محمد حسین آزاد نے نواب علاء الدین احمد خاں علائی (جو خود اپنے چچا نواب ضیاالدین احمد خان کی طرح سُنّی تھے۔ ۱۸۳۲ء تا ۱۸۸۴ء) سے دریافت کیا کہ غالب کا مذہب کیا تھا تو انھوں نے جواب دیا:

"اصل [۴] یہ ہے کہ مرزا صاحب اولاد سلم اور تور سے ہیں اور ترکمان
کہلاتے ہیں۔ اجداد ان کے شیعہ مذہب نہ تھے مگر اس ملک کا آدمی اور
ترکمان لوگ اکثر تفضیلی [۵] ہیں اور مرزا صاحب کو نظر سیر اور تاریخ پر
تھی۔ ان کے نزدیک حقیقت خلافت امامت کی ثابت ہوئی۔۔۔۔۔"

گویا وہ شیعہ ہو گئے۔ مگر کیوں ہو گئے؟ نواب علائی آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "کثرت صحبت ایران کے ساتھ اور خصوصاً نواب حسام الدین کے ساتھ اور بخشی محمود رضا خان کے ساتھ اس امر کی باعث ہوئی۔ اس پر مالک رام صاحب اضافہ کرتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ اس میں ملا عبد الصمد کی صحبت کو بہت دخل رہا ہوگا۔۔۔ ان (غالب) کے تعلقات نواب حسام الدین حیدر خاں کے خاندان سے نہایت ابتدائی زمانے سے تھے اور ان کے صاحبزادے ناظر حسین میرزا ان کے ہمجولی تھے [۶]۔۔۔"

غالب ایک بہت بڑا ذہن لے کر آئے تھے۔ جیسا کہ علائی نے لکھا ہے انھوں نے مذہب امامیہ اس وقت اختیار کیا جب ان پر "حقیقت خلافت امامت کی ثابت ہوئی۔" اسی لیے ان میں غلو کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ حقیقت میں کسی کے راسخ العقیدہ ہونے کے یہ معنی کبھی نہیں ہوتے کہ وہ جا و بے جا اپنے اعتقادات کے ڈانڈے عصبیت سے ملاتا رہے۔ کشادہ ذہن شخص، راسخ العقیدہ ہے کہ بے عقیدہ، کشادہ ذہن ہی رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ غالب نے اپنی تخلیقات کو اپنے مسلک کے پرچار کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ انھوں نے بعض ایسے اشعار بھی کہے جو شیعیت تو کیا اسلام سے بھی میل نہیں کھاتے اور ایسا کرنے میں انھوں نے جس چابک دستی، شگفتگی اور معنی آفرینی کا ثبوت دیا ہے، وہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ وہ عمر رسیدہ ہوتے گئے اور اپنے ذہن کو کشادہ کرتے گئے۔ ۱۸۴۷ء کے بعد کا جب کہ وہ پچاس سال کی عمر سے تجاوز کر چکے تھے، یہ شعر دیکھیے۔

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

شارحین نے عموماً اس کے معنی "آتشِ فراق" سے سارے بدن کے جل جانے کے کیے ہیں۔ یہ معنی قطعی سطحی ہیں۔ اسے ہندو مذہب کے آئینے میں دیکھنا چاہیے۔ پوری اردو شاعری میں اس شعر کا مرادف نہیں ملے گا۔

۵۷ سال کی عمر میں فکر کردہ ایک شعر ملاحظہ فرمایئے:-

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

یہ بھی خالص ہندوانہ شعر ہے۔ "لیلا" کا تصور ہندو فلسفے کا اہم جز ہے۔

غالب نے عہدِ جوانی (۱۸۲۱ء) میں ایک نہایت خوب صورت شعر کہا تھا:-

نشہ رنگ سے ہے واشدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

شارحین غالب اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ "پھول نے اپنے بند قبا اس لیے کھول دیے ہیں کہ وہ نشہ رنگ سے مست ہو گیا ہے۔" لیکن یہ شعر اس وقت تک صحیح معنی نہیں دے سکتا، جب تک اس مصرع اول کو مصرع ثانی اور مصرع ثانی کو مصرع اوّل بنا کر نہ پڑھا جائے یعنی:-

مست کب بند قبا باندھتے ہیں
نشہ رنگ سے ہے واشد گل

یعنی مست کی جامہ دری پر نہ جایئے اسے ہوش کہاں وہ تو سرور عرفان میں مست ہے۔ وہ ایک پھول کی طرح ہے جو اپنے رنگ کے نشے میں ڈوب کر کھل اٹھتا ہے اور اپنے لباس ظاہری ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔

غالب بھی اپنے تخیل کے نشے میں مست ہو کر طرح طرح کے شعر کہہ جاتا ہے۔ اسے مسلک و مذہب کی چار دیواری کا ہوش کہاں رہتا ہے۔ اس مجنون چمن کا دامن رنگ اور شگفتگی سے ہمہ وقت بھرا رہتا ہے۔

حواشی

(۱) پنج آہنگ مرتبہ وزیر الحسن عابدی میں شرم لکھا ہے جو درست نہیں۔ پنج آہنگ اشاعت دوم ۱۸۵۳ء، ص ۳۳۴ پر شرہی درج ہے اور یہی صحیح ہے۔

(۲) دیوان غالب نسخۂ گپتا رضا۔ مطبوعہ ۱۹۹۵ء، ص ۴۴۵۔ یہ سلام پہلے پہل رسالہ معصر لکھنؤ کے مئی ۱۹۲۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ بعد میں "متفرقات غالب" میں شامل کیا گیا۔ اس کا ایک قلمی اندراج رضا لائبریری رام پور میں ہے۔

(۳) عارف اور فرزندیِ غالب؟ والے مضمون میں جو اسی کتاب میں شامل ہے۔ یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے۔

(۴) "نگار" فروری ۱۹۶۳ء۔ ص ۱۰

(۵) اہل سنت کے ایک فرقے کا نام جو حضرت علی کو تمام اصحاب رسول پر فضیلت دیتا ہے۔

(۶) ذکرِ غالب۔ بار پنجم۔ ص ۲۵۱

زوجۂ غالب
امراؤ بیگم
(ازدواجی زندگی کے پہلے ۱۶سالوں کی مختصر داستان)

غالب جب نواب احمد بخش خاں کے دم ولاسوں سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے پنشن کا مقدمہ لڑنے کے لیے سفر کلکتہ کی ٹھانی وہ کلکتہ جاتے ہوئے بنارس[۱] سے جھجھ مل کو ایک خط[۲] (تقریباً جولائی ۱۸۲۷ء) میں لکھتے ہیں:

قطعہ مکتوب ملفوف است۔ یکے بہ جناب مبارز الدولہ نواب حسام الدین
حیدر خاں[۳] بہادر و یکے بخدمت جناب مولوی فضل حق و یکے بہ

غم خانہ بدتراز ویرانۂ غالب ناکام رسانند......

یعنی ایک (تیسرا) خط غالب ناکام کے غم خانے پر، جو ویرانے سے بدتر ہے، پہنچا دیں۔ اس جملے کے سمجھنے کے لیے یہ چند باتیں پیش نظر رکھنی ہوں گی۔ جب یہ خط لکھا گیا اس وقت:

۱۔ غالب نے اپنی عمر کے ابھی ۳۰ سال بھی پورے نہیں کیے تھے۔
۲۔ غالب اور امراؤ بیگم کی شادی کو ۱۷ سال پورے ہو رہے تھے اور دہلی میں غالب کی مستقل سکونت کو تقریباً ۱۴ سال۔
۳۔ غالب نے ان ۱۴ سالوں میں سوائے شعر کہنے اور رنگ رلیاں منانے کے کوئی اور کام نہ کیا جب کہ غالب کی مستقل آمدنی ساڑھے باسٹھ روپے مہینا (وظیفہ سرکاری) تھی۔

۴۔ ظاہر ہے اس قلیل آمدنی میں یہ شاہ خرچیاں ممکن نہ تھیں ان اخراجات کو پورا کرنے میں غالب کے خسر (امراؤ بیگم کے والد) نواب الٰہی بخش خاں، آگرے سے غالب کی والدہ، فتوحات سے غالب کا ہاتھ بٹاتے رہتے تھے۔ باقی قرضہ لے لیا جاتا تھا۔

۵۔ پنج آہنگ (مطبوعہ ۱۸۵۳ء) میں ایک خط بنام انورالدولہ بہادر ہے۔ جس میں غالب لکھتے ہیں:

"سی سال است کہ خانہ و کاشانہ فروختہ کوبکوی گردم و مقامے معین ندارم۔ "

یہ خط پنج آہنگ کی اشاعت اوّل (۱۸۴۹ء) میں نہیں ہے اس لیے ظاہر ہے کہ ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۳ء کی درمیانی مدت میں لکھا گیا ہے۔ اگر اسے ۱۸۵۳ء ہی کا لکھا ہوا مان لیا جائے اور اس میں سے تیس سال نکال دیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ غالب ۱۸۲۳ء تک (بہ عمر ۲۶ سال) ان کے پاس ان کا اپنا گھر تھا جو اسی سال یا اس سے دو تین سال قبل فروخت کر دیا گیا۔ اس کے بعد غالب کی زندگی میں انھیں کبھی یہ استطاعت نہیں ہوئی کہ وہ اپنے مکان میں رہ سکیں اور وہ ہمیشہ کرائے ہی کے مکان میں رہا کیے۔ ویسے اس مکان کی فروخت سے پہلے بھی وہ کبھی اس قابل نہ تھے کہ دہلی میں خود اپنا مکان بنوا سکتے یا خرید سکتے۔ قیاس غالب ہے کہ یہ آبائی مکان ہوگا جو ان کے دادا قوقان بیگ خاں نے اپنے قیام دہلی کے دوران میں خریدا ہوگا اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں کی ولادت اسی مکان میں ہوئی تھی۔

امراؤ بیگم اور غالب کی شادی ۱۹/ اگست ۱۸۱۰ء کو ہوئی۔ غالب دو تین برس اور آگرہ میں رہ کر ۱۸۱۲ء ۔ ۱۸۱۳ء میں مستقل طور پر دہلی چلے آئے۔ یہاں دلّی میں وہ اپنے علاحدہ مکان میں رہے۔" (ذکر غالب۔

پانچواں ایڈیشن ص ۴۴) یعنی اپنے سسرال میں نہیں رہے۔ ظاہر ہے جس مکان میں یہ میاں بیوی شادی کے بعد دلّی آکر رہے تھے وہ بھی آبائی مکان تھا جسے غالب نے ۱۸۲۳ء میں فروخت کردیا اور اس طرح اپنے حصے کی رقم سے کچھ قرض چکایا جو جوانی کی رنگ رلیوں نے ان پر لاد دیا تھا۔

۶۔ غالباً اسی گھر میں غالب اور امراؤ بیگم کی سات اولادوں میں سے دو یا تین بچوں کا جنم ہوا ہوگا اور یہیں انھیں ان بچوں کی موت کا غم سہنا پڑا ہوگا۔

۷۔ جیسا کہ ان کے پنشن کے مقدمے کی عرض داشت سے ظاہر ہے، غالب لگ بھگ تیس سال کی عمر تک اپنے والد اور نانا کا ترکہ بیچ باچ کر تقریباً برابر کر چکے تھے۔ نواب احمد بخش خاں نہ صرف یہ کہ اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے بلکہ جیتے جی اپنی ریاست کے بٹوارے کا پلان بھی مکمل کر چکے تھے۔ صرف عمل در آمد باقی تھا۔ چنانچہ غالب کے لیے فتوحات کا یہ دروازہ بھی بند ہو گیا۔ والدہ گھٹنوں گھٹنوں قرض میں پھنسی ہوئی تھیں۔

۸۔ اسی اثنا میں (۱۸۲۶ء) غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف (والد امراؤ بیگم) نے وفات پائی۔ ظاہر ہے کہ غالب ان کے جنازے کو کندھا بھی نہ دے سکے کیوں کہ وہ اپنے سفر کلکتہ پر نکل چکے تھے۔ دوران سفر ہی میں انھیں اپنے خسر کے انتقال کی خبر ملی ہوگی۔

مندرجہ بالا سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ غالب کے خط سے لیے ہوئے جملے کا حرف حرف غالب کے حالات کی عکسی تصویر ہے۔ "غالب ناکام" کی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں۔ "غم خانہ، بدتر از ویرانہ" کا اطلاق گھر پر پورے طور پر اس لیے ہوتا ہے کہ امراؤ بیگم کے والد کے انتقال کو ابھی چند ہی ماہ گزرے ہیں اور کہ وہ دلّی کے کرایہ کے نئے مکان میں تن تنہا رہ رہی ہیں جب کہ ان کی عمر ابھی ۲۷۔۲۸ سال سے زیادہ نہیں۔

ان ۱۵۔۱۶ برسوں میں امراؤ بیگم نے اپنے شوہر کے عشق و محبت کے افسانے سنے، قلیل آمدنی میں گزارہ کیا جب کہ وہ خود نازوں میں پلی تھی۔ آبائی گھر سے ہاتھ دھوئے۔ بیوی کو اپنے گھر سے جو محبت ہوتی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، بچے جنے اور ان سے اپنی گود سونی کر کے موت کی گود بھر دی، پھر عظیم المرتبت باپ (معروف) کا انتقال ہو گیا وہ بھی ایسے وقت جب کہ شوہر برسوں کے سفر پر گھر سے جا چکے تھے۔ اگرچہ خط کے اس جملے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اپنی اہلیہ کے دکھوں میں برابر شریک رہتے تھے اور ان کے بارے میں فکر مند رہتے تھے تاہم ان حالات سے امراؤ بیگم کی ازدواجی زندگی کے ابتدائی ۱۵۔۱۶ سالوں کے جو نقوش ابھرتے ہیں وہ نہایت مایوس کن ہیں۔ ان حالات نے اگر بقیہ زندگی بھر کے لیے ان کے مزاج کو تلخ بنا دیا تو کوئی عجب نہیں۔

حواشی

(۱) اس خط میں ایک قطعہ ہے جس کے دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط غالب نے بنارس پہنچنے پر لکھا تھا۔ شعر یہ ہے:-

گویند، زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است
مارا بریں گیاہ ضعیف ایں گماں نہ بود

(۲) دیکھیے پنج آہنگ

(۳) غالب، مثنوی چراغ دیر میں، جو انھوں نے بنارس میں کہی تھی، لکھتے ہیں :- زار باب وطن جویم سہ تن را۔ کہ رنگ و رونق اندایں نہ چمن را (اہل وطن میں سے مجھے تین آدمیوں کی تلاش رہتی ہے) ایک مولوی فضل حق (ہم از حق فضل حق را باز خواہم) دوسرے حسام الدین حیدر خاں (حسام الدین حیدر خان نویسم) تیسرے امین الدین احمد خاں (امین الدین احمد خاں طراز م)۔ شاید امین الدین احمد خاں اس وقت لوہارو میں ہوں گے یا ان کے نام الگ سے خط لکھا ہوگا۔

غالب بنام امراؤ بیگم

غالب ۹ یا ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ کلکتہ پہنچ کر یہ شاید دوسرا خط تھا جو انھوں نے رائے چھج مل کو بھیجا۔ قیاس ہے کہ مارچ ۱۸۲۸ء میں لکھا ہوگا۔ پہلا خط جیسا کہ اس خط میں درج ہے، انھوں نے درود کلکتہ کے فوراً بعد راجہ سوہن لال کے توسط سے بھیجا تھا۔ اس کا جواب نہ پا کر یہ دوسرا خط بھیجا۔ لکھتے ہیں:

"اینک مکتوبے بے لفافہ در لف خط غمخانہ ی رسد۔ راقم راتا ایں زمان حالے کہ در خور تحریر باشد، روے نداده ..."

(اب ایک بے لفافہ (کھلا) خط غمخانے (میرے گھر) کے خط میں لپٹا ہوا پہنچتا ہے۔ راقم کو (مجھے) آج تک کے قابل تحریر حالات نہیں پہنچے۔)

ظاہر ہے کہ ان قابل تحریر حالات میں گھر اور سرکار دربار دونوں کے حالات شامل ہیں۔ غالب نے اپنے گھر کو اب کے بھی "غمخانہ" ہی لکھا ہے۔

اس خط کے بعد تقریباً تیس سال تک ہمیں غالب کے خطوط میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس سے ان کے اور امراؤ بیگم کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہو۔ ہاں ایسے فقرے کہیں مل جائیں تو مل جائیں جیسے "اپنے گھر میں اور اپنے بچوں کو میری اور میرے گھر کی طرف سے دعا کہہ دینا اور تم کو بھی تمھاری استانی دعا کہتی ہیں" یا حکیم غلام نجف خاں کو جن کو وہ اپنے بیٹے کی طرح جانتے تھے لکھتے ہیں "تمھاری ماں دعا کہتی ہے" یا "تمھاری استانی تم کو ... دعا کہتی ہیں" وغیرہ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس لمبے عرصے کے دوران میں غالب نے کوئی ایسا لمبا سفر

نہیں کیا جس میں انھیں اپنے گھر کی خیر خبر دریافت کرنے کی ضرورت پڑتی۔ یہ لمبا عرصہ امراؤ بیگم کے لیے بڑا مایوس کن تھا، پہلے ۱۶ سال سے بھی زیادہ۔ انھوں نے سات بچوں کو جنم دیا ان میں سے کچھ اس عہد میں بھی پیدا ہوئے ہوں گے مگر ان میں سے کوئی زندہ نہ بچا۔ ان کے امیر کبیر فقیر منش والد نواب الٰہی بخش خاں معروف، بہن بنیادی بیگم، بہن کے بیٹے عارف، سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ گویا امراؤ بیگم گھر میں غالب کے ساتھ جو بیشتر مردانے میں رہا کرتے تھے تنہا زندگی گزارتی رہیں۔ البتہ عارف کے انتقال (۱۸۵۲ء) کے بعد جب عارف کے دونوں بچے ان کی پرورش میں آئے تو امراؤ بیگم کے یہاں پھر سے بہار آ گئی اور گھر میں غالب کی دلچسپی بھی دوچند ہو گئی، اگرچہ وہ قلیل آمدنی کی وجہ سے اکثر گھبرا کر کہہ اٹھتے تھے:

> "تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ خدا نے لاولد رکھا تھا۔ شکر بجالاتا تھا۔ ... یہ (تاہل) قید جاودانی ہے ... اگر میں تنہا ہوتا تو اس وجہ قلیل (پنشن) میں کیسا فارغ البال اور خوش حال رہتا ... "
>
> مکتوب بنام حکیم غلام نجف علی خاں (۱۸۵۸ء)

تاہم اس میں شک نہیں۔ ان بچوں کی رفاقت میں غالب کو ایک نئی زندگی کا تجربہ ہوا اور ان کا خانگی بندھن مضبوط ہو گیا۔

جنوری ۱۸۶۰ء میں غالب کو رام پور کا سفر درپیش ہوا۔ وہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو دتی سے روانہ ہوئے۔ ۲۱ جنوری کو میرٹھ سے حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

> "لڑکوں کے ہاتھ کے دو خط لکھے ہوئے ان کی دادی کو بھجوادیے ہیں۔ تم اس اپنے نام کے خط کو لے کر ڈیوڑھی پر جانا اور اپنی استانی جی کو پڑھ کر سنا دینا اور خیر و عافیت کہہ دینا۔"

غالب ۲۷ جنوری کو رام پور پہنچے۔ وہاں سے ۳ فروری کو پھر حکیم صاحب کو لکھتے ہیں:

> "اب تم ایک کام کرو۔ آج یا کل ڈیوڑھی پر جاؤ اور جتنے خط جمع ہیں، وہ لو اور مان سنگی مضبوط کاغذ کا لفافہ کرو اور بیرنگ لکھ کر کلیان کے ہاتھ

ڈاک گھر میں بھجوادو "

پھر اسی خط میں وہ اپنا حال الگ لکھتے ہیں۔ حقیقت میں یہ حال حکیم صاحب کے لیے نہیں، اپنی بیوی امراؤ بیگم کے لیے ہے۔ ذرا تفصیل ملاحظہ کیجیے:

> اب میرا حال سنو۔ تعظیم و توقیر بہت ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔ ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل ہے رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر تو دوا کو بھی میسر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں۔ کچی دیواریں اور کھپریل، سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے۔ مجھ کو جو مکان ملے ہیں وہ بھی ایسے ہیں۔
>
> ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں آئی۔ میں خود ان سے ابتدا نہ کروں گا۔ وہ بھی مجھ سے بالمشافہ نہ کہیں گے۔ مگر بہ واسطہ کار پردازان سرکار۔ دیکھوں کیا کہتے ہیں اور کیا مقرر کرتے ہیں؟ میں سمجھا تھا کہ میرے پہنچنے کے بعد جلد کوئی صورت قرار پائے گی لیکن آج تک جمعہ آٹھواں دن میرے پہنچنے کو ہے، کچھ کلام نہیں ہوا۔
>
> کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے "کوسی" سبحان اللہ اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا، ہاضم، سریع النفوذ اس آٹھ دن میں قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے۔ لڑکے بھی تندرست آدمی بھی توانا مگر ہاں ایک عنایت اللہ دو دن سے کچھ بیمار ہے۔ خیر، اچھا ہو جائے گا۔ والدعا۔

امراؤ بیگم کا جواب بھی بالکل وہی ہے جو ایک وفادار بیوی اپنے خاوند کو دے سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے حکیم صاحب سے کہہ دیا ہوگا کہ لکھ دیجیے کہ اپنا حال لکھنے میں تاخیر سے کام نہ لیا کریں، خط جلد جلد لکھا کریں۔ غالب ۱۴ فروری کو اس کا جواب یوں لکھتے ہیں اور شبہہ کرتے ہیں کہ شاید حکیم صاحب امراؤ بیگم کو ان کا پورا خط پڑھ کر نہیں سناتے:

"یہ تم کیا لکھتے ہو کہ گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو۔ تم کو جو خط لکھتا ہوں
گویا تمھاری استانی جی کو لکھتا ہوں۔ کیا تم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ جاؤ اور
پڑھ کر سناؤ؟ اب ان کو خیال ہوگا کہ اس انگریزی خط میں کیا لکھا ہے۔
تم یہ خط میرا ہاتھ میں لیے جاؤ اور حرف بہ حرف پڑھ کر سناؤ۔
لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں کبھی مجھ کو
ستاتے ہیں۔ بکریاں، کبوتر، بٹیریں، تکل، کنکوا۔ سب سامان درست
ہے۔ فروری مہینے کے دو دو روپے لے کر دس دن میں اٹھا ڈالے۔
پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے کہ دادا جان کچھ ہم کو قرض حسنہ
دو۔ ایک روپیہ دونوں کو قرض حسنہ دیا گیا۔ آج چودہ ہے، مہینا دور
ہے۔ دیکھیے کے بار قرض لیں گے۔
یہاں کا رنگ نواب صاحب کے آنے پر جو ہوگا اور جو قرار پائے گا وہ
مفصل تم کو لکھوں گا اور تم اپنی والدہ کو سنا دینا اور ہاں بھائی، یہ بھی گھر
میں پوچھ لینا کہ کیدار ناتھ نے اندر باہر کی تنخواہ بانٹ دی؟ میں نے تو
وفادار اور حلال خوری تک کی بھی تنخواہ بھیج دی ہے۔

غالب کا ارادہ تھا کہ وہ گرمی اور برسات کا موسم رام پور ہی میں گزاریں۔ وہاں انھیں نواب محمد یوسف علی خاں ناظم نے ہر طرح کا آرام دے رکھا تھا مگر بچوں (باقر علی خاں وحسین علی خاں، فرزندان عارف) نے واپس دلی آنے کی ضد کی۔ ان کی کم عمری کے سبب مرزا نے مناسب نہ سمجھا کہ انھیں تنہا دلی بھیجیں۔ آخر وہ بھی واپس آگئے اور رام پور سے ۱۷مارچ ۱۸۶۰ء کو چل کر ۲۴مارچ ۱۸۶۰ء کو دلی پہنچ گئے۔ اسی دن روزوں کا چاند ہوا۔

۳۱/اپریل ۱۸۶۵ء کو نواب محمد یوسف علی خاں ناظم کا انتقال ہو گیا اور نواب کلب علی خاں نے مسند سنبھالی۔ غالب، نواب مرحوم کی تعزیت اور نواب حال کی تہنیت کے لیے پھر رام پور گئے۔ ملازموں کے علاوہ دونوں لڑکے بھی ساتھ تھے۔ ۷/اکتوبر ۱۸۶۵ء کو دلی سے روانہ ہوئے اور جیسا کہ ذیل کے خط بنام مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب سے ظاہر ہوتا ہے، دوسرے دن ہاپوڑ پہنچے۔ یہ خط وہیں سے لکھا ہے، ۸/اکتوبر ۱۸۶۵ء کو۔ خط حقیقت میں

امراؤ بیگم کے نام ہے:

اچھی طرح ہو؟ غازی آباد کا حال شمشاد علی سے سنا ہو گا۔ ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخودار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گئی۔ شراب پی لی کباب کھائے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔ بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے۔ آپس کے صلاح و مشورت سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے۔ دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں۔ آج میں نے تمھارے والد کی نصیحت پر عمل کیا۔ چار بجے پانچ کے عمل میں، ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڑھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ چارپائی بچھائی، اس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دونوں گھوڑے کوتل آ گئے، دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں۔ اب وہ آئے اور کھانا کھالیا اور چلے۔ تم اپنی استانی کے پاس جا کر یہ رقعہ سراسر پڑھ کر سنا دینا۔ شمشاد کو کتاب کے مقابلے اور تصحیح کی تاکید کر دینا۔

۱۱/ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو لکھتے ہیں:

برخودار حکیم غلام نجف خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ بدھ کا دن، سہ پہر بھر دن چڑھا ہو گا کہ میں فقط پالکی پر مراد آباد پہنچا۔ بیس جمادی الاوّل کی اور گیارہ اکتوبر کی ہے۔ دونوں لڑکے دونوں گاڑیاں

اور رتھ اور آدمی سب پیچھے ہیں۔ اب آئے جاتے ہیں۔ رات بہ خیر گزرے، بہ شرط حیات کل رام پور پہنچ جائیں گے۔ گھبرایا ہوا ہوں۔ تیسرا دن ہے، پاخانہ پھرے کو۔ لڑکے بخیر و عافیت ہیں۔ اپنی استانی سے کہہ دینا۔

۱۲/ اکتوبر کو غالب رام پور پہنچ گئے وہاں سے ۲۱/ اکتوبر کو ایک خط بھیجتے ہیں جس میں رہنے، کھانے پینے کی تکمیل تفصیل ہے۔ خاوند کی طرف سے ایسا خط بیوی کے لیے یقیناً اطمینانِ قلب کا باعث ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اقبال نشاں، عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں کو غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ تمھارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم میں یہاں خوش اور تندرست ہوں۔ دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، تنجن، پسندے، دونوں وقت روٹیاں خمیری، چپاتیاں، مربّے، اچار۔ میں بھی خوش، لڑکے بھی خوش۔ کلو اچھا ہو گیا ہے۔ سقّا، مشعلچی، خاکروب، سرکار سے متعیّن ہے۔ حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔ آج تک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ تعظیم، تواضع، اخلاق کسی بات میں کمی نہیں۔

ظہیر الدین خاں بہادر کو دعا پہنچے۔ یہ خط لے کر تم اپنی دادی صاحب کے پاس جاؤ اور یہ خط پڑھ کر سناؤ اور ان سے یہ کہہ دو کہ وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی وہ غلط ہے، اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔ باقی خیر و عافیت۔

حکیم غلام نجف خاں جو غالب کی غیر حاضری میں برابر امراؤ بیگم کی ضروریات کا خیال رکھے ہوئے تھے، نے پے در پے دو خطوں میں دوسرے امور کے علاوہ امراؤ بیگم کی بیماری کا حال بھی غالب کو لکھا۔ غالب ۱۲ نومبر ۱۸۶۵ء کے خط میں اس کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں:

"تمھارے دو خط متواتر آئے۔ ظہیرالدین کا آگرے جانا میرا خط اس کا موسومہ تمھارے پاس پہنچنا اور اس کا آگرے کو روانہ ہونا۔ ظہیرالدین کی دادی کا بہ عارضہ سرقہ وسعال رنجور ہونا۔ کدارناتھ کا مجھ سے خفا ہونا۔ مکان کو روکنے کی اجازت کا مانگنا۔ فضل حسن سے میرے واسطے دریوزۂ تفقد کرنا۔ یہ مدارج و مطالب معلوم ہوئے۔ ظہیرالدین کا خط تم نے کیوں کھولا۔ وہ مغلوب الغضب ہے، تم پر خفا ہوگا۔ اس کی دادی اس موسم میں ہمیشہ ان امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایک نسخہ اس کے پاس ماءاللحم کا ہے، وہ کھچوادو اور ذرا خبر لیتے رہو۔ کدارناتھ لڑکا ہے، وہ مجھ سے کیا خفا ہوگا؟ روپیہ جو خزانے میں جمع ہوگا آخر وہی لائے گا۔ خفا میں ہوں کہ روپیہ دام دام پایا اور میرا تمسک نہ دیا اور چھتیس روپے آٹھ آنے کا نہ بانٹا۔ مکان کے روکنے کو اور کس طرح لکھوں؟ شہاب الدین خاں کو لکھا۔ شمشاد علی بیگ کو لکھا، اب تم کو لکھتا ہوں۔ ستمبر کے پانچ روپے آٹھ آنے دے آیا ہوں۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر یہ سولہ روپے آٹھ آنے آکر دوں گا بلکہ اگر موقع بنے گا تو یہ سہ ماہا یہاں سے بہ طریق ہنڈی بھیج دوں گا۔
اسمٰعیل خاں صاحب کو میری دعا کہو اور کہو کہ ڈیوڑھی کی سیڑھی بنوادیں اور حویلی کے پائے خانے کی صورت درست کروادیں۔ ہائے قسمت! اس قسمت پر لعنت کہ میاں فضل حسن میرے مربی و محسن بنیں اور پھر وائے محرومی کہ مطلب بر آری نہ ہو، خدا کرے نہ ہو۔ لونڈوں کا احسان زہر قاتل ہے۔ فضل اللہ خاں میرا بھائی ہے۔ اس کا احسان مجھ کو گوارا، سو بار اس سے کہا اور ہزار بار کہوں گا۔ خیر، جو ہوا سو ہوا۔ اب آپ اس سے زنہار نہ کہیے گا، نہ لکھیے گا۔ اگر کچھ کہو تو فضل سے کہو تفضل سے کہو۔ والدعا۔
نواب صاحب دورے سے یا آج شام کو یا کل آجائیں گے، جشن

جمشیدی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

غالب ۲۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو رام پور سے واپس دلّی کے لیے روانہ ہوئے اور ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دلّی پہنچے۔

باقر علی خاں کامل بڑا ہو کر بیس برس کی عمر (اواخر ۱۸۶۷ء) میں الور راج میں ملازم ہو گیا۔ اس کے نام کا بھی ایک خط پڑھ لیجیے۔ جو غالب نے اوائل ۱۸۶۸ء میں اسے لکھا ہو گا۔ خط کے آخری دو جملوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اب گھر واقعی گھر بن گیا ہے، امراؤ بیگم کے لیے بھی اور غالب کے لیے بھی۔ باقر علی خاں کی شادی ہو چکی ہے اور ان کے دو سال کی ایک بچی بھی ہے۔ چوں کہ شادی (۱۸۶۴ء) کے بعد باقر علی خاں الگ مکان میں یا اپنے خسر نیر و رخشاں کے ساتھ رہنے لگا تھا اس لیے لکھتے ہیں کہ بچی "کبھی روز، کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آجاتی ہے۔" حسین علی خاں ان کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ دادا اور دادی دونوں کا دل خوب لگا ہوا ہے۔ خط ملاحظہ ہو۔ غالب کا انتقال اس خط کے سال بھر بعد ہوتا ہے اور امراؤ بیگم کا دو سال بعد:

> اقبال نشاں مرزا باقر علی خاں کو غالب نیم جاں کی دعا پہنچے۔ تمھارا خط آیا۔ تمھارے روزگار کی درستی آگے سن چکا تھا، اب تمھارے لکھنے سے دیکھ بھی لی۔ دل میرا خوش ہوا اور تم خاطر جمع رکھو جیسا کہ مہاراج نے تم سے کہا ہے، تمھاری ترقی انشاءاللہ تعالیٰ جلد ہو گی۔
>
> مجھ سے جو تم گلہ کرتے ہو خط کے نہ بھیجنے کا۔ بھائی! اب میری انگلیاں نکمی ہو گئی ہیں اور بصارت میں بھی ضعف آگیا ہے۔ دو سطریں نہیں لکھ سکتا۔ اطراف و جوانب کے خطوط آئے ہوئے دھرے رہتے ہیں۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے، میں اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ پرسوں کا تمھارا خط آیا ہوا دھرا تھا۔ اب اس وقت مرزا یوسف علی خاں آگئے، میں نے ان سے یہ خط لکھوا دیا۔
>
> تمھاری دادی اچھی طرح ہے، تمھارا بھائی اچھی طرح ہے۔ تمھارے گھر میں سب طرح خیر و عافیت ہے۔ تمھاری لڑکی اچھی طرح ہے۔

کبھی روز کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آجاتی ہے۔

غالب نے رام پور کے پہلے سفر میں جو ۱۶ جنوری سے [1] ۱۷ جنوری ۱۸۶۰ء تک تقریباً دو ماہ کا احاطہ کرتا ہے، امراؤ بیگم کو جو معلوم ہوتا ہے پڑھی لکھی نہ تھیں، کم از کم تین خط لکھے۔ یہ ہمارے مطالعے میں ہیں۔ غالب کا دوسرا سفر رام پور سے ۷/اکتوبر ۱۸۶۵ء سے [2] ۲۸ دسمبر ۱۸۶۵ء تک تقریباً پونے تین ماہ پر محیط رہا۔ اس مدت میں جو خط انھوں نے امراؤ بیگم کو لکھے وہ کم از کم چار ہیں۔ ان کے علاوہ جو خط لکھے ہوں گے وہ ہماری دسترس میں نہیں۔ ایک وفاشعار بیوی اور فرض شناس خاوند کے مابین اس سے بہتر تعلقات کیا ہو سکتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ امراؤ بیگم اور غالب میں ان بن کا سبب اختلاف مزاج تھا۔ جو ہمیشہ جھنجھلاہٹ کے سبب ہوا کرتا ہے۔ امراؤ بیگم کے والد نامدار نواب الٰہی بخش خاں معروف کی زندگی (وفات ۱۸۲۶ء) میں، غالب ضرور عیش کوش اور غیر محتاط رہے۔ بعد ازاں انھوں نے کبھی ان فرائض کے نباہنے میں کوتاہی نہیں کی جو ایک شوہر پر واجب ہیں۔ ان کے ذہن میں طلاق، علاحدگی، دوسری شادی وغیرہ کا گزر ہی نہیں ہوا۔

حواشی

(۱) ۲۴مارچ ۱۸۶۰ء کو دلّی پہنچے تھے۔

(۲) ۸ جنوری ۱۸۲۶ء کو دلّی پہنچے تھے۔

غالب اور امراؤ بیگم

میں اَن بن کتنا جھوٹ کتنا سچ

ا۔ چند عینی شاہد

(الف) سرور الملک سرور الدولہ نواب آغا مرزا بیگ خاں (ولادت ۱۸۴۸ء) غالب کے بھانجے مرزا جواد علی بیگ عرف مرزا مغل بیگ کے صاحبزادے تھے۔ وہ اپنے "سوانح خودنوشت" کارنامہ سروری میں لکھتے ہیں:

> "الغرض خاندان لوہارو سے ہمارے دو رشتے ہوئے یعنی پھوپھی امانی خانم کا نکاح نواب علی بخش خاں (امراؤ بیگم کے بھائی) سے ہوا گو زن و شوہر میں ہمیشہ نااتفاقی رہی اور دادا مرزا نوشہ (غالب) کا نکاح دختر نواب الٰہی بخش خاں (امراؤ بیگم) سے ہوا۔ بچپن میں جب میں اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ ان (غالب، امراؤ بیگم) کے ہاں جایا کرتا تھا تو دادی (امراؤ بیگم) مجھ کو ایک دونی دیا کرتی تھیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں میاں بی بی میں بھی ہمیشہ اَن بن رہی۔ بیبیاں اس خاندان کی نہایت مہذب و شائستہ مگر کمال درجہ مغرور و متکبر تھیں۔"

(ب) نواب خضر مرزا (نبیرہ بنیادی بیگم، بزوجہ غلام حسین خاں مسرور، دختر الٰہی بخش خاں معروف) سے بذریعہ حمید احمد خاں صاحب ذیل کی باتیں معلوم ہوئیں۔ خضر مرزا حسین علی خاں سے عمر میں چھوٹے تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۸۵۵ء کے لگ بھگ ہے اور حسین علی خاں کا

۱۸۵۰ء۔ حمید احمد خاں صاحب لکھتے ہیں:

"نواب خضر مرزا مرحوم (جنھوں نے لڑکپن میں غالب اور امراؤ بیگم کو دیکھا تھا) راقم الحروف سے اس زمانے کی ایک حکایت ان الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ میں ایک دن مرزا صاحب کے دیوان خانے میں کھڑا تھا کہ وہ اوپر سے اترے۔ مرے کھوے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ آ تیری دادی کے گھر چلتا ہوں (دادی سے مراد امراؤ بیگم تھیں) اندر جا کر بستی ماما سے دادی کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہیں۔ معلوم ہوا کہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ کہنے لگے ہیں یہ کیا! جب آ ؤ نماز! ارے خضر تیری دادی نے تو گھر کو فتح پوری کی مسجد بنا دیا!"

"خضر مرزا کہتے تھے کہ مرزا صاحب کا انتقال دیوان خانے میں ہوا۔ دادی اس وقت زنان خانے میں تھیں۔ اسی عرصہ میں دار وغہ کلو کو انھوں نے باہر کی خبر پوچھنے کے لیے کئی دفعہ بلایا۔ میں ایک دو دفعہ گیا، گریہ ان پر طاری تھا۔ سفید دوپٹہ اوڑھے تخت پر بیٹھی رو رہی تھیں۔"

(ج) غالب کے دوست نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر ور خشاں کی بیٹی اور مرزا زین العابدین خاں عارف کی بہو نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم کی شادی باقر علی خاں کامل سے ۱۸۶۴ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت بگا بیگم کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔ حمید احمد خاں صاحب نے جولائی ۱۹۳۸ء میں ان سے ملاقات کی تھی۔ ذیل میں حمید احمد خاں صاحب کے مضامین سے وہ اقتباسات درج کیے جاتے ہیں جو حمید احمد خاں صاحب اور بگا بیگم کی زبان سے ہیں اور امراؤ بیگم سے متعلق ہیں:

خود بگا بیگم صاحبہ کی موجودگی میں میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی۔ امراؤ بیگم خفا ہوتی تھیں مگر خاموش ہو جاتیں۔ ان سے کہتی تھیں: "بیٹی تو تو بچہ ہے بڑھے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر، بڑھا تو دیوانہ ہو گیا ہے۔"

اسی قسم کا ایک واقعہ بگّا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ (مرزا صاحب) پچھلے پہر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز عصر کے بعد وہ واپس آئے ہیں اور میری ساس عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ دونوں بھی اسی تخت پر ٹکڑ پر ہو بیٹھے۔ جب ہم نے سلام پھیرا تو کہنے لگے: "واہ وا! خوب! بہو کو بھی اپنا سا کر لیا۔ کمہاری بونٹ کا کیڑا اپنے گھر لے جاتی ہے تو چالیس دن میں اسے اپنا سا کر کے نکال دیتی ہے!"

ایک اور لطیفہ بگّا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ برسات کے دن تھے۔ مینہ بہت برسنے لگا۔ پوتوں (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) نے کھانا کھایا اور چلے گئے۔ نیاز علی (ملازم) بھی چلا گیا۔ (مرزا صاحب) بیٹھے بیوی سے باتیں کرتے تھے۔ میں یوں بیٹھی تھی، گاؤ تکیے کے کونے سے لگی ہوئی۔ کہنے لگے: "ایک بیوی، دو میں، تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا! بہو میں اور میری بیوی بیٹھے ہیں، تم کیوں بیٹھی ہو؟" اس پر میری ساس بولیں: "اے توبہ! بڈھا تو دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھٹھے کے لیے کوئی چاہیے۔ اب بہو ہی مل گئی۔" میں اتنے میں اٹھ کر ایک کونے میں جا چھپی۔ اب انھیں یہ فکر کہ برسات کے دن ہیں اور کیڑے پتنگے کا موسم مجھے ڈھونڈتے پھریں اور کہتے جائیں: "مجھے کیا خبر تھی بہو اس بات کو اتنا برا مانے گی!"

میرے بیاہ کے بعد کی بات ہے کہ چنے کی دال سالن میں پڑی ہوئی میرے سامنے بھی آئی۔ مجھے پسند نہیں تھی۔ مغلانی نے میری ساس سے شکایت کی کہ بہو نہیں کھاتیں چنے کی دال۔ مرزا صاحب یہ بات سن رہے تھے کہنے لگے: "ددا، یہاں تو آ"، ددا گئیں تو ان سے کہا، "پیسے نہیں تھے تیرے پاس" بہو کی پسند کی چیز پکالی ہوتی۔" ددا نے جواب دیا: "نہیں، بہو چنے نہیں کھاتی ہیں۔" بولے: "اوہو، خدا سے بھی بڑھ گئیں بہو؟ توبہ توبہ!" پھر میری ساس سے کہنے لگے: "بیوی

سنو" وہ بولیں: "میں نہیں سنتی!" اس پر مجھ سے کہا: "بیٹی برا نہ ماننا۔ ایک بات سناتا ہوں۔ خدا کے آگے چنا گیا اور فریاد کی کہ باری تعالیٰ یہ کیا بات ہے مجھ کو لوگ طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ بھونتے ہیں، تلتے ہیں، یا ابالتے ہیں، پیستے ہیں۔ آخر میرا گناہ کیا ہے؟ خدا نے چنے کی طرف دیکھا اور کہا "دور ہو۔ نہیں میں بھی تجھے کھا جاؤں گا!"
"جب میں بیاہی گئی تو وہ (امراؤ بیگم) اچور کی پھانک تھیں۔ جانماز پر بیٹھ کر کہا کرتیں: "اے اللہ! تو کب بلائے گا۔" ایک روز میں نے پوچھا: پھپھی جان، آپ کو قبر سے ڈر نہیں لگتا؟ کہنے لگیں: بیٹی، تھکا بیل سرا کو دیکھتا ہے۔"

بقول ان کے مرزا صاحب غصے میں آتے تو ان کی زبان سے اس قسم کے کلمات نکلتے تھے:

"میرا تو ناک میں دم کر دیا!" "حضرت موسیٰ کی بہن!" دوسری طرف بیگم غالب خفا ہوتی تھیں، مگر خاموش ہو جاتی تھیں۔ "اپنی بھتیجی (معظم زمانی بیگم) سے کہتی تھیں: "تو تو بچہ ہے۔ بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کر۔ بڈھا تو دیوانہ ہو گیا ہے۔"

(د) مولانا حالی (ولادت ۱۸۳۷ء) پہلی مرتبہ ۱۸۵۴ء میں دلی آئے اور غالب سے بھی ملاقات ہوئی۔ غالب کی مشہور زمانہ سوانح عمری یادگار غالب (جس میں سوانح عمری کم اور غالب کی شعری اور ادبی حیثیت نمایاں کرنے کا مقصد زیادہ کار فرما ہے) ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی جو آج تک بہت مشہور ہے۔ حالی اس میں لکھتے ہیں:

خانگی تعلقات

مرزا کی بی بی، جو الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں، وہ نہایت متقی، پرہیزگار اور روزے نماز کی سخت پابند تھیں۔ جس قدر مرزا مذہبی معاملات میں بے مبالات تھے، اسی قدر ان کی بی بی احکام مذہبی کی پابند

تھیں، یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے باسن الگ اور شوہر کے الگ ہوتے تھے۔ باینہمہ بی بی شوہر کی خدمت گزاری اور خبر گیری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے۔ مگر ان کے کھانے پینے اور دواخنذائی اور جزاول وغیرہ کا انتظام سب گھر میں سے ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی، ہمیشہ وقت معین پر وہ ایک بار گھر میں ضرور جاتے تھے اور بی بی اور ان کے تمام رشتہ داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ رکھتے تھے اور اپنی جان سے بڑھ کر ان کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا۔ مگر چوں کہ شوخی اور ظرافت ان کی گھٹی میں پڑی تھی، ان کی زبان و قلم سے بی بی کی نسبت ایسی باتیں نکل جاتی تھیں، جن کو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔

لطیفہ: کسی نے امراؤ سنگھ نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ اس کے ننھے ننھے بچے ہیں، اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی! تیرے بچوں کو میں پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے!" وہ ہمیشہ تعلقات خانگی کو جدا یا جزاً ایک سخت مصیبت بتایا کرتے تھے۔

لطیفہ: جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرہ سامنے رکھا تھا۔ طوطا سردی کے سبب پروں میں منھ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھ کر کہا: "میاں مٹھو! نہ تمھارے جورو، نہ بچے، تم کس فکر میں یوں

سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہو؟"

لطیفہ: ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھ کر آئے، اس کا دیوان خانہ تو پسند آگیا، مگر محلسرا خود نہ دیکھ سکے۔ گھر پر آکر اس کے دیکھنے کے لیے بی بی کو بھیجا۔ وہ دیکھ کر آئیں، تو ان سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ انھوں نے کہا: اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔ مرزا نے کہا: "کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟"

موت کی آرزو: مرزا یا تو اس وجہ سے کہ ان کی زندگی فی الواقع مصائب اور سختیوں میں گزری تھی اور یا اس لیے کہ ان پر نالائم حالتوں کا بہت زیادہ اثر ہوتا تھا، آخر عمر میں موت کی بہت زیادہ آرزو کیا کرتے تھے۔ ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے کہ اس سال ضرور مر جاؤں گا۔

لطیفہ: ۱۲۷۷ھ میں انھوں نے اپنے مرنے کی یہ تاریخ کہی کہ "غالب مرد" اس سے پہلے کئی مادّے غلط ہو چکے تھے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص جو مرزا صاحب کے مخصوصین میں سے تھے، ان سے مرزا صاحب نے اس مادّے کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا: "حضرت! انشاءاللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا!" مرزا نے کہا: "دیکھو، صاحب! تم ایسی فال منھ سے نہ نکالو، اگر یہ مادّہ مطابق نہ نکلا، تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔"

لطیفہ: ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پڑی۔ میر مہدی حسین مجروح نے دریافت کیا کہ حضرت! وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے؟ اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "بھئی، کیسی وباء؟ جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکے، تو تف بریں وبا"۔ اسی قسم کی بہت سی باتیں اور حکایتیں ان سے منقول ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آخر عمر میں مرنے کے کس قدر آرزومند تھے۔

۲۔ کلامِ غالب سے شہادت

ذیل میں وہ اشعار دیے جاتے ہیں جو حالؔی اور حمید احمد خاں کی رائے میں غالب اور امراؤ بیگم میں ان بن کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ میں نے ان سب کا تاریخی تعین بھی کردیا ہے۔

(الف) اردو

I

آرزوے خانہ آبادی نے ویراں تر کیا
کیا کروں، گر سایۂ دیوار سیلابی کرے[1]

(ب) فارسی

II

بہ کاشی لختے از کاشانہ یاد آر — دریں جنت ازاں ویرانہ یاد آر
دریغا در وطن و ماندۂ چند — بہ خون دیدہ زورق راندۂ چند
ہوس را پاے درو دامن شکستہ — بہ اُمید تو چشم از خویش بستہ
بہ شہر از بے کسی صحرا نشیناں — بہ روے آتش دل مبا گزیناں
مگر کاں قوم را و ہر آفریدہ — ز سیماب بر آتش آرمیدہ
ہمہ در خاک و خوں افگندۂ تو — بہ حکم بے کیہا بندۂ تو
چو شمع از داغِ دل آذر فشاناں — بہ بزم عرض دعوئ بے زباناں
سرو سرمایہ غارت کردۂ تو — ز تو نالاں دلے در پردۂ تو

III

اے آنکہ براہ کعبہ روے داری — دانم کہ گزیدہ آرزوے داری
زینگونہ کہ تند می خرامی، دانم — در خانہ زن ستیزہ خوے داری

IV

بہ آدم زن بہ شیطاں طوق لعنت — سپروند از رہ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم — گراں تر آمد از طوق عزازیل

۷

گیر کہ در روزِ حشر چوں تو بیفتی — بر سر دوزخ نہند تیرہ نہنبن
لیک نباشد دراں مضیق مصیبت — در طلب نان و جامہ کشمکش از زن
لیک نباشد دراں مقام صعوبت — شور تقاضاے ناروائے مہاجن

☆☆☆

۳۔ اب اوپر کیے ہوئے اندراجات (چند عینی گواہ اور کلام بطور گواہ) کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ایک بات جو عینی گواہوں میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ حالؔی کے سوا ۱۸۴۸ء سے پہلے ان میں سے کسی کا وجود ہی نہ تھا اور حالؔی بھی ۱۸۵۴ء سے پہلے کبھی غالب سے نہیں ملے تھے۔ آغا مرزا بیگ (ولادت ۱۸۴۸ء) کو بھی ہوش میں آنے کے لیے کم از کم پانچ سال کا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح ان کے لیے بھی غالب اور امراؤ بیگم کی باتیں سننے اور یاد رکھنے کا زمانہ ۵۴ / ۱۸۵۳ء سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام آنکھوں دیکھے واقعات غالب کی ۵۷ / ۵۶ سال اور امراؤ بیگم کی ۵۵ / ۵۴ سال کی عمر کے یا اس کے بعد ہی کے ہو سکتے ہیں۔

آغا مرزا بیگ کہتے ہیں کہ "ان دونوں میاں بی بی میں بھی ہمیشہ ان بن رہی۔ بیبیاں اس خاندان کی نہایت مہذب و شائستہ مگر کمال درجہ کی مغرور و متکبر ہوتا تھا اور جب بگا بیگم، امراؤ بیگم کی زبانی بتاتی ہیں کہ وہ (غالب کو مخاطب ہو کر) کہتی تھیں "بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر، بڈھا تو دیوانہ ہو گیا ہے۔" تو امراؤ بیگم کا "مہذب و شائستہ" ہونا بھی مشکوک ہو جاتا ہے۔

خضر مرزا کو غالب کا (امراؤ بیگم کو خطاب کر کے) کہنا (ایسا ایک قصہ بگا بیگم نے بھی بیان کیا ہے) "یہ کیا! جب آؤ نماز! ارے خضر! تیری دادی نے تو گھر کو فتح پوری کی مسجد بنا دیا ہے۔" ایک ٹھٹھا بھی ہے مگر اختلاف مزاج کو بھی ظاہر کرتا ہے کیوں کہ مذہب کے لیے غالب کا رویہ عام طور پر معلوم ہے۔ خضر مرزا کا دوسرا بیان کہ مرزا کے انتقال پر امراؤ بیگم نے باہر کی خبر پوچھنے کے لیے داروغہ کلو کو کئی دفعہ بلایا اور کہ انھوں نے دیکھا کہ امراؤ بیگم پر "گریہ ---- طاری تھا۔ سفید دوپٹہ اوڑھے تخت پر بیٹھی رو رہی تھیں۔" ظاہر کرتا ہے کہ اس بڑھاپے میں بھی امراؤ بیگم کو غالب سے کتنی محبت تھی اور اس موت کا انھیں کتنا غم تھا۔ یقیناً

یہ بات کسی شدید ان بن کی روایت کی نفی کرتی ہے۔

بیگم، امراؤ بیگم اور غالب ایک ہی جگہ بیٹھے تھے۔ غالب کو مذاق سوجھا "ایک بیوی، دو میں، تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا....." امراؤ بیگم بولیں "اے توبہ! بڑھا تو دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھٹھے کے لیے کوئی چاہیے۔ اب بہو ہی مل گئی" اب اگر غالب کی یہ بات ٹھٹھا ہے تو امراؤ بیگم کے فقرے کو "بڈھے" کی باتوں کا خیال نہ کیا کر، بڈھا (غالب) تو دیوانہ ہو گیا ہے" تہذیب اور شائستگی کی کسوٹی پر کیوں کسا جائے۔ اسے بھی تو ٹھٹھا ہی کہا جائے گا اور چنے والی کہانی کے لیے جب امراؤ بیگم سے کہا کہ "سنو! وہ بولیں میں نہیں سنتی" سے بھی کسی ان بن کی طرف خیال نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت میں بگا بیگم نے اس کا فیصلہ خود ہی کر دیا ہے۔ ذرا ان کے آخری بیان کو دوبارہ دیکھیے۔ فرماتی ہیں:

"میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی..... مرزا صاحب غصے میں آتے تو ان کی زبان سے اس قسم کے کلمات نکلتے تھے:
'میرا ناک میں دم کر دیا'
'حضرت موسیٰ کی بہن'
دوسری طرف بیگم غالب خفا ہوتی تھیں مگر خاموش ہو جاتی تھیں۔ کہتی تھیں تُو تو بچہ ہے۔ بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کر۔ بڈھا تو دیوانہ ہو گیا ہے۔"

میاں بیوی میں ایسی باتیں کس گھر میں نہیں ہوتیں؟ ایک جگہ بگا بیگم فرماتی ہیں:

"(امراؤ بیگم) جانماز پر بیٹھ کر کہا کرتیں، اے اللہ! تو کب بلائے گا، ایک روز میں نے پوچھا پھپھی جان، آپ کو قبر سے ڈر نہیں لگتا؟ کہنے لگیں، بیٹی تھکا بیل سرا کو دیکھتا ہے۔"

یہ بات بھی کسی خانگی نزاع کا ثبوت نہیں ہو سکتی کیوں کہ حالی نے لکھا ہے کہ آخر عمر میں غالب بھی موت کی آرزو کیا کرتے تھے۔ اس پر یہ لطیفہ دیکھیے جو کچھ اور ہی کہانی کہہ رہا ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پڑی۔ میر مہدی مجروح نے دریافت کیا

کہ حضرت! وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے؟ اس کے
جواب میں (غالب) لکھتے ہیں بھئی کیسی وبا؟ جب ایک ستر برس کے
بڈھے اور ستر برس کی بڑھیاں کو نہ مار سکے، تو تف بر ایں وبا......"

یہ باتیں پیرانہ سالی کی جھنجھلاہٹ کو ظاہر کرتی ہیں، کسی خانگی نزاع کی دلیل نہیں بن سکتیں۔ غالب اگر گھر سے عاجز آئے ہوئے ہوتے تو یا تو ستر برس کے بڈھے (یعنی اپنی موت) کی دعا مانگتے یا پھر ستر برس کی بڑھیا (یعنی امراؤ بیگم) کی، مگر وہ تو دونوں کو بڑھاپے کے عذاب سے چھٹکارا دلانا چاہتے ہیں۔ یہ نزاع کی نہیں بلکہ دونوں کے تعلق خاطر کی دلیل ہے۔

جو دانشور، نقاد اور محقق یہ مان کر چلتے ہیں کہ غالب اور امراؤ بیگم میں سخت خانگی نزاع تھا وہ سچائی کے طرف دار نہیں ہیں بلکہ ان کا پورا زور اس بات پر صرف ہوا ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کے موقف کی تصدیق ہو جائے کہ غالب کے گھر میں ہر وقت خانہ جنگی کا بازار گرم رہتا تھا لیکن یہ بات حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ جو ناکامیاں امراؤ بیگم نے اپنی ازدواجی زندگی کے پہلے ۴۲/۴۰ میں دیکھی ہیں، ان سے کسی بھی بیوی کا مزاج چاہے وہ کتنی بھی وفادار کیوں نہ ہو، چڑچڑا ہو سکتا ہے۔ خاص کر ایسے حالات میں جب کہ خاوند اپنی مایوسی کا مداوا شاعری میں ڈھونڈھ سکتا ہو اور بیوی (اس سے قطع نظر کہ وہ فطرتاً تند مزاج ہو) کہیں بھی اپنا دل کھول کر نہ رکھ سکتی ہو۔ اوپر دیے ہوئے اشعار سے حالی اور حمید احمد خاں نے خانگی نزاع ہی کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالی نے دبے لفظوں میں اور حمید احمد خاں نے کھل کر۔ حقیقت حال ابھی آپ کے سامنے آئی جاتی ہے۔

I آرزوئے خانہ آبادی ..

اس اردو شعر کے معنی صرف یہ ہیں کہ میں نے گھر کو آباد تر کرنے کی آرزو کی اور وہ ویران تر ہو تا گیا۔ دیوار تو گھر بنانے کے لیے تعمیر کی جاتی ہے مگر جب دیوار کے سائے سے ہی سیلاب پھوٹ پڑے تو پھر میں کیا کروں۔

یہ غزل غالب نے ۱۸۱۶ء (بہ عمر ۱۹ سال) یا اس سے پہلے کہی تھی۔ اس کے چھ شعر ہیں، یہ غزل کا دوسرا شعر ہے۔ عموماً واقعاتی اشارے مقطع ہی میں کیے جاتے ہیں۔ اس غزل کا

مقطع بھی وقت کی صحیح ترجمانی کر رہا ہے۔ دیکھیے ۔

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو، غالب، تو پھر
کیوں نہ دلّی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

II یہ کاشی لختے از.....

یہ ۸ شعر مثنوی چراغ دیر کے ہیں، جو سفر کلکتہ کے دوران میں بنارس پہنچنے کے بعد ۱۸۲۷ء میں کہی تھی۔ اس وقت انھیں گھر سے نکلے سال بھر سے اوپر ہو چکا تھا۔ امراؤ بیگم کے والد نواب الٰہی بخش معروف کا انتقال ہو چکا تھا۔ چنانچہ یہ ۱۸ اشعار جو حمید احمد خاں صاحب نے پیش کیے ہیں حقیقت میں تعداد میں دس ہونے چاہیے تھے۔ مگر چوں کہ ایسا کرنے سے ان کا موقف کمزور ہو جاتا تھا اس لیے انھوں نے پہلا اور دسواں شعر چھوڑ دیا۔ ان دو اشعار کے بغیر مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں وطن سے دور اپنے اہل و عیال کی تکلیفوں کے احساس سے مضطرب ہوں اور میں جانتا ہوں کہ تمھارے دکھوں کا ذمہ دار میں خود ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو (امراؤ بیگم) مجھ سے نالاں ہے مگر تو میرا بھرم رکھتی ہے۔ لیکن اگر ان ۱۸ اشعار سے پہلے کا اور آخری یعنی دسواں شعر جوڑ دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا۔ پہلا شعر ۔

ازیں دعواے بہ آتش شوئی لب را
بخواں غمنامۂ ذوق طلب را

مصرع ثانی صاف بتا رہا ہے کہ امراؤ بیگم کی طرف سے خط آیا ہے گویا کہہ رہا ہے کہ بہت زمانہ بیت گیا ہے گھر آ جائیے۔ غم نامہ اس لیے کہا ہے کیوں کہ امراؤ بیگم کے والد کا انتقال ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے ہوا ہے۔ شاعر کہتا ہے اے غالب "گھر سے آئے ہوئے بلاوے کے دکھ بھرے خط کو پڑھ اور کاشی میں رہتے ہوئے دور دلّی میں اپنے گھر کو یاد کر.... تجھ سے وہ (امراؤ بیگم) نالاں سہی مگر وہ ہمیشہ تیرا بھرم رکھتی ہے۔ اس سے تغافل برتنا اچھا نہیں اس کا دل افسوس زدہ ہو اور تو پھولوں کی تمنا کرے یہ ناروا ہے" آخر دو جملے دسویں شعر کا ترجمہ ہیں ۔

از آنانت تغافل خوشنمانیست
بداغِ شاں ہواے گل روانیست

ان اشعار میں ہر دو جانب سے محبت و شفقت کے سوائے کسی اور مفہوم کا شائبہ تک نہیں ہے۔

III اے آنکہ براہِ کعبہ.....

یہ رباعی ۱۸۲۵ء اور ۱۸۴۵ء کی درمیانی مدت میں کہی گئی تھی۔ ۱۸۲۵ء کے لگ بھگ غالب نے فارسی گوئی باقاعدگی سے شروع کی تھی اور ۱۸۴۵ء میں مجموعہ کلامِ فارسی شائع ہوا تھا جس میں یہ رباعی شامل ہے۔

اس رباعی کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہے کہ تو جو اتنی تیز رفتاری سے کعبہ کی راہ پر گامزن ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تیری بیوی سخت جھگڑالو ہے اور تو خانہ داری سے بیزار ہے۔ کیا معترضین یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایسے اشعار وہی شخص کہہ سکتا ہے جو عملی طور پر اس راہ سے گزرا ہو؟

IV بہ آدم زن بہ شیطان.....

یہ قطعہ ۱۸۳۵ء اور ۱۸۶۳ء کے درمیان تخلیق ہوا۔ اس کا حال بھی بعینہ وہی ہے جو اوپر III کے تحت بیان ہوا ہے۔

V گیر کہ در روزِ حشر.....

یہ تین شعر کا قطعہ ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۷ء کے مابین کہا گیا اسی لیے سبد چیں میں شامل ہے جب قطعے کا عنوان "در بارۂ وام طلبان" ہو اور قطعہ "شور تقاضائے ناروائے مہاجن" پر ختم ہو تو اسے غالب کے خانگی نزاع کا شاہد کیوں کر سمجھا جا سکتا ہے۔

غالب کے تقریباً آٹھ ہزار اردو مصرعوں میں سے ایک اور تقریباً اٹھائیس ہزار فارسی مصرعوں میں سے چار مصرعے تلاش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ غالب اور امراؤ بیگم تمام عمر شدید قسم کے خانگی جھگڑوں میں مبتلا رہے ایک احمقانہ ورزش ہے۔ میاں بیوی میں لڑائی رہتی تھی مگر کس گھر میں نہیں رہتی؟

استدراک

فروری ۱۹۸۹ء میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی تصنیف "غالب کا علمی سرمایہ" چھپی

ہے۔ اس میں جناب جمیل الدین عالی کی تحریر کا ایک اقتباس (حرفِ چند ص ۱۵ تا ۱۹) اہم ہے۔ اسے بغیر کسی تبصرے کے شائع کیا جاتا ہے البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ اس طویل تحریر سے اس بات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی کہ غالب اور ان کی اہلیہ امراؤ بیگم میں کسی قسم کی ان بن رہا کرتی تھی:

"نہ اس نسبت پر فخر ہے نہ افسوس مگر، راقم کا تعلق خانوادہ لوہارو سے ہے۔ اس خاندان سے غالب کی سی اور علمی محبتانہ نسبت معروف ہے۔ ۱۹۴۲ء میں عمر تقریباً سترہ برس تھی۔ (سیکنڈ ائیر ختم کر رہا تھا) گرمیوں کی تعطیلات گزرنے شملہ جانا تھا، کچھ رقم کی ضرورت پڑی۔ مدد لینے نواب صاحب لوہارو (نواب امین الدین احمد خاں ثانی) کے پاس گیا۔ چند روز وہاں گزارے۔ بچپن سے غالب، غالب سنتا تھا، خاندان کے حوالے سے بھی۔ اب ایک دن لوہارو کے کتب خانے میں بیٹھا کہ کچھ نظر آئے۔ دوسرے نوادر اور مسودات وغیرہ کا ذکر غیر ضروری ہے۔ راقم نے غالب کے کوئی ایک سو بیس بہر حال ایک سو سے زیادہ خطوط فارسی اور اردو دو چھوٹی چھوٹی بوریوں میں بند پائے۔ بوریاں ٹاٹ کی نہ تھیں، موٹے سفید کپڑے کی تھیں۔ تھیلے سمجھ لیجیے۔ وہ یقیناً ایک طرف محفوظ سی رکھی تھیں۔ کتب خانہ بہت چھوٹا تھا، اس کی صفائی ہو رہی تھی۔ میں سب خط پڑھ نہ سکا۔ فارسی تو اس وقت بالکل سمجھ میں نہ آئی، اردو بھی پوری طرح نہ پڑھی گئی کہ اس وقت دور سم الخط پڑھنے کی عادت نہ ہوئی تھی، ہاں اکثر مطالب صاف سمجھ لیے۔ غزلیں شاید تھی ہی نہیں۔ کہیں کہیں کوئی شعر فارسی اور اردو کا ضرور آ جاتا تھا۔

اردو کے بیشتر خط غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم کے چچازاد بھائی اور والی لوہارو میرے پردادا نواب امین الدین خاں کے نام تھے اور ان میں سے تقریباً سب ہی کافی مختصر تھے۔ ان میں اکثر خطوط جوئے والے معاملے سے متعلق تھے۔ مقدمہ لڑنے کے لیے مالی امداد طلب کی گئی تھی۔ جیل کے خطوط بھی تھے۔ جیل کے بعد سخت برہمی کا اظہار بھی تھا ایک دو میں صاف صاف یہ تھا کہ تم نے میری خبر خود آ کر نہ لی، لوگوں کو بھیجا۔ معلوم ہوتا ہے یہاں سے یہ لکھا جاتا تھا کہ تم نے خاندان کو بدنام کیا وغیرہ وغیرہ۔ کیوں کہ ایک میں واضح طور پر یہ تھا کہ اگر تم بھی اس مقدمے کی کارروائی کو سچ سمجھتے ہو اور میری سزا کو حق جانتے ہو اور خاندان کے

لیے میری رشتے داری کو بدنامی کا باعث تو اپنی بہن کو بلالو۔ معلوم ہوتا ہے یہاں سے لکھا گیا کہ اچھا انھیں بھیج دو۔ ایک فرستادہ کا بھی ذکر تھا۔ غالب کا خط کہتا تھا کہ تمھارے آدمی خط لے کر آئے، تمھاری بہن جانے سے انکاری ہیں۔

فارسی کے کئی خطوط علاء الدین خاں علائی میرے دادا کے نام بھی تھے اور کسی اور بزرگ (غیر خاندانی) کے نام جو اس وقت لوہارو میں رہتے تھے۔ علائی کے نام اکثر خط تعلیمی لگتے تھے۔ مگر ان میں کچھ اذکار خاندانی ضرور تھا۔ اردو کے کئی خطوط میں محض طلب زر یعنی صرف طلب زر اور عذر گاہ گاہ پر سرزنش، رامپور کی تعریف، مرزا تفتہ اور شیفتہ کی حالیہ اور سابقہ خدمتوں بطور خاص "فتوح" کی تعریف، کچھ احباب کی شکایت بس مجھ کو اتنا یاد ہے۔

میں نے ادبانواب صاحب مرحوم کی توجہ اس طرف دلائی۔ انھیں استحصار نہ تھا۔ اس وقت وہ ایک نوجوان والی ریاست تھے۔ ریاست بہت چھوٹی سی (آج کے تناظر میں حالات سمجھنا مشکل بھی ہے) مگر تھے تو والی ریاست۔ صاحب تصنیف ہو چکے تھے (ایک ناول) شعر بھی رسمایا شوقیہ گاہ گاہ کے طور پر کہہ لیتے تھے۔ (بعد میں آزادی کے بعد بہت لکھا) مگر اس وقت ان کا مزاج ادب دوست تو کسی حد تک تھا، اتنا غالب پرست نہ تھا، نہ وہ اتنے روشن خیال تھے۔ انھوں نے سرسری طور پر فرمایا۔ جی ہاں مجھے علم ہے کہ ان خطوط میں کیا ہے ان کی اشاعت ہمارے خاندانی وقار کے خلاف ہے۔ پچھلے زمانے میں بھی دو خطوط آپ کے (میرے) والد اور دادا نے دے دیے دیکھ بھال کر دینے چاہیے تھے۔ مرزا مرحوم سے ہمارے قبیلے کی ایک خاتون کیا بیاہی، ان کی تمام فضولیات میں ہمارا خاندان ضرور ملوث ہوتا ہے آپ رہنے دیجیے میں سوچوں گا۔ (نواب امین الدین خاں اوّل اور ان کے چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین خاں نیر درخشاں کی اولاد کے مابین آدمی کی تقسیم پر تنازعہ رہ چکا تھا۔ اس کے آوازے باہمی شادی بیاہ کے باوجود اس زمانے تک گشت کرتے تھے۔ نواب ضیاء الدین خاں کی صاحبزادی بگہ بیگم کو غالب اپنی منھ بولی بہو بنا کر لائے تھے۔)

سچ کہ میں بھی نہ تو کوئی حیثیت رکھتا تھا، نہ اس وقت اس موضوع کا اتنا دیوانہ تھا۔ بعد میں ہمارے تعلقات میرے نظریات اور رویّوں کی وجہ سے کسی حد تک ناخوش گوار ہو گئے۔ میرے خیالات بھی بدلتے رہے۔ میں نے ان سے مزید گفتگو کی نہ ضرورت سمجھی نہ جرأت

کی۔ پھر ریاست (۱۹۴۷ء میں) ختم ہوگئی۔ وہ جے پور چلے گئے بھاگ کر جانا پڑا۔ قلعے پر کئی حملے ہو چکے تھے۔ ریاست میں اس وقت (۱۹۴۷ء میں) کوئی مسلمان نہ رہا تھا، سب بے سروسامان بھاگ گئے تھے۔

۱۹۵۷ء میں (پہلی بار) ہندوستان گیا اور ان سے ملنے اور اجمیر شریف کی زیارت کرنے جے پور پہنچا تو ان کا مزاج بھی بدل چکا تھا اور ملں بھی بڑا ہو گیا تھا۔ ان خطوط کی یاد دلائی۔ فرمایا سارا کتب خانہ رامپور کتب خانہ میں چلا گیا ہے، وہاں زیادہ محفوظ رہے گا۔ لوہار و کوئی آتا ہے نہ جاتا ہے۔ قلعہ بند، محلات تباہ، کتب خانہ تھا ہی کیا، تباہ بھی ہوا اور قلعہ وغیرہ حکومت ہند کی تحویل میں آگیا۔ وہ اسے تحصیل کے دفتر کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ اب آپ ان خطوط کو یاد دلا رہے ہیں تو میں خود رامپور لکھ کر دیکھوں گا، کیا بنا کیا ہوا۔ اس وقت تک ان کی صاحبزادی نور بانو نواب رضا علی خاں مرحوم والی رامپور کے چھوٹے صاحبزادے نواب زادہ ذوالفقار علی خاں ممبر پارلیمنٹ کو بیاہ چکی تھیں۔ رامپور سے تعلق گہرا ہو گیا تھا۔

پھر ان سے اس موضوع پر گفتگو تو کیا، کوئی خاص خط کتابت بھی نہ ہوئی۔ میں ۱۹۸۲ء تک ہندوستان بھی نہ گیا۔ اس دوران میں ہندوستانی فضلا آتے تھے اور ملاقات ہو جاتی تھی تو میں ذکر کر تا تھا۔ مخدومی عرشی صاحب سے خاص طور پر کہا۔ یہ کوئی بیس برس کی بات ہے۔ انھوں نے واپس جاکر مجھے خط لکھا (وہ محفوظ نہیں) کہ انھیں نہیں ملا۔

۱۹۸۲ء میں مخدومی مالک رام صاحب سے کہا۔ انھوں نے بڑی دلچسپی لی فرمایا کہ اب میں جستجو کروں گا۔ خود نواب صاحب کو یاد دلایا۔ وہ اس وقت پنجاب (ہند) کے گورنر تھے۔ انھیں یاد ہی نہیں رہا تھا۔ فرمایا آپ خود رامپور چلے جائیے اور تلاش کیجیے۔ لیکن یہ گفتگو انھوں نے سرسری کی، گو دلچسپی بہت دکھائی۔ اب وہ اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ غالب کے وہ خطوط بھی ادب کا ایک عجیب و غریب سرمایہ ہوں گے اور خاندانی وقار وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پھر میں نے عرشی زادہ صاحب کو لکھا۔ اُن کا جواب بھی وہی آیا کہ وہ دستیاب نہیں۔ میں رامپور کبھی گیا نہیں۔ اب جاتا بھی تو کیا مل جاتا۔ اب تو وہ کتب خانہ زیر تنقیح بھی بند ہے۔

گویا وہ خط ضائع ہو گئے، ضائع نہ ہو گئے ہوتے تو اب تک کسی نہ کسی کو مل جاتے لیکن یہ

بات ریکارڈ ہے کہ غالب کے وہ خط راقم الحروف نے دیکھے ہیں۔ کیوں ضائع ہوئے، کب ضائع ہوئے، اب یہ بحث لاحاصل ہے۔

اپنے چچا سے سنتا تھا کہ غالب کے سب سے زیادہ عاشق میرے دادا علاء الدین خاں علائی تھے جو ان کے درس و سخن کے شاگرد بھی رہے۔ ان کے بعد میرے والد نواب امیر الدین فرخ مرزا لیکن ان کے زمانے میں یہ خطوط کیوں عام اشاعت کے لیے نہ گئے۔ اس کی وجہ بھی وہی خاندانی وقار ہوگا جو ان کے پوتے (اور میرے بھتیجے نواب امین الدین خان ثانی آخری والی لوہارو کو ملحوظ تھا) واللہ اعلم بالصواب۔ اس ضمن میں اس وقار کی نسبت سے ایک اور واقعہ یہیں ریکارڈ کردوں کہ بہر حال یہ تمام اشاعت غالب سے متعلق ہے۔

غالب شناس جانتے ہیں کہ غالب نے اپنی سالی کے بیٹے زین العابدین خان عارف کے دولڑکے پالے تھے۔ ان میں سے ایک باقر علی خاں کامل تھے۔ ان کی شادی نواب ضیاء الدین خاں نیر ورخشاں کی صاحبزادی معظم زمانی عرف بگہ بیگم سے ہوئی (خطوط غالب میں ان کا ذکر آتا ہے اور ان کی بڑی صاحبزادی جندو بیگم کا بھی، جنھیں غالب مرزا جیون بیگ کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ نیر ورخشاں کے پوتے نواب شجاع الدین خاں تاباں برادر بزرگ نواب سراج الدین خاں سائل سے بیاہیں (بگہ بیگم کے نواسے، ان کی چھوٹی صاحبزادی کے بیٹے، فخر الدین علی احمد مرحوم ایک وقت میں صدر ہندوستان ہوئے) آزادی سے پہلے ان بگہ بیگم سے پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے ایک تفصیلی انٹرویو لے کر شائع کیا تھا۔ وہ رشتے میں میرے والد کی پھوپھی ہوتی تھیں۔

ہم عید بقر عید پر ان کے سلام کو جاتے تھے۔ بالکل پھونس ہوگئی تھیں۔ میری شادی کے بعد غالباً ۱۹۴۵ء میں وفات پائی۔ بصارت تقریباً جاچکی تھی، ساعت جارہی تھی، ایک بار میں نے ان سے خوب کھود کھود مرزا غالب کی شراب نوشی پر پوچھا (وہ ان کے آخری زمانے میں بہت چھوٹی عمر میں بیاہ کر آئی تھیں) بہت برافروختہ ہوئیں۔ فرمایا کم بخت میرے سسر کو شرابی کہتا ہے۔ شراب سے کیا تعلق ان کا ..... میں نے جوئے اور جیل کا ذکر کیا تو اور بھی زجر و توبیخ کی۔ یقیناً یہ واقعہ، ان کی پیدائش سے بہت پہلے کا تھا اور مرد بزرگوں نے ممکن ہے انھیں نہ بتایا ہو لیکن یہ تو ناممکن ہے کہ دادی امراؤ بیگم نے جو نہایت وفادار بیوی ہونے

کے باوجود اپنے ہی خاندان کی ایک فرد، اپنی بہو کے سامنے (جو آخر ش اسی خاندان سے تھیں) کبھی مرزا صاحب کے یہ واقعات بیان نہ کیے ہوں۔

بہر حال میں نے ایک بار سے زیادہ یہ بات چھیڑی (اس وقت "ہیر نگ ایڈز" نہ تھیں مگر ہم ان کے کانوں پر ایک نلکی یا کپّی الٹی رکھ کر بات ان تک خوب پہنچا دیتے تھے) انھوں نے کبھی اس امر کی تصدیق نہ کی بلکہ الٹا ڈانٹا۔ یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب میں انیس برس کا ہو چکا تھا، سب خوب یاد ہے۔

اس ماحول اور ان اقدار میں اگر وہ خطوط، نواب صاحب لوہارو مرحوم نے خود نہیں تو کسی اور خاندانی نے ضائع کر دیے ہوں تو کچھ عجب نہیں۔"

حواشی

(۱) "دیوان غالب کامل تاریخی ترتیب سے" مطبوعہ ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۶۔

غالب کے سفر کلکتہ کی توقیت

۱۸۲۵ء (تقریباً جون):	سفر کلکتہ (آغاز نومبر ۱۸۲۵ء) سے پہلے آخری بار نواب احمد بخش خاں سے ملنے (بسلسلہ پنشن) فیروز پور گئے۔ نواب صاحب نے کہا قدرے اور تحمل کرو کیوں کہ جنرل اختر لونی سے ان کے تعلقات خوش گوار نہیں۔ اس پر غالب ناکام دہلی واپس آگئے۔ لارڈ ایمرسٹ، گورنر جنرل نے جنرل اختر لونی کا ریاست بھرت پور میں دخل دینا پسند نہیں کیا۔ اس پر اختر لونی نے استعفیٰ دے دیا۔ سر چارلس منکاف کی نامزدگی۔
۱۸۲۵ء (۱۵/جولائی):	اختر لونی (آکٹرلونی) ریذیڈنٹ دہلی کا ضعیفی اور بیماری کی وجہ سے انتقال۔
۱۸۲۵ء (۲۶/اگست):	سر چارلس منکاف نے دہلی کے ریذیڈنٹ، سول کمشنر اور گورنر جنرل کے ایجنٹ برائے راجپوتانہ کا عہدہ سنبھالا۔
۱۸۲۵ء (۲۱/اکتوبر)	منکاف کلکتہ سے دہلی پہنچے (قیاس ہے کہ انھیں ایام میں نواب احمد بخش خاں بھی پیشوائی کے لیے دہلی آگئے ہوں گے) اس سے پہلے ۱۸ ستمبر کو لارڈ ایمرسٹ کی طرف سے منکاف کو ہدایت ہو چکی تھی کہ وہ جس طرح چاہیں بھرت پور کا قضیہ نبٹائیں۔

۱۸۲۵ء(۲۵/نومبر)	منکاف کا بھرت پور پر چڑھائی کی تیاری کا اعلان
۱۸۲۵ء(۲۸/نومبر)	غالب، کی نواب احمد بخش خاں کی معیت میں، سر چارلس منکاف اور ان کی فوجوں کے ساتھ دہلی سے بھرت پور کی طرف روانگی (اسے سفر کلکتہ کا آغاز کہنا چاہیے کیوں کہ اب جو دہلی سے نکلے تو غالب سفر کلکتہ ختم کر کے ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء ہی کو دہلی واپس آسکے)
۱۸۲۵ء(۶/دسمبر)	متھرا پہنچے۔
۱۸۲۵ء(۱۰/دسمبر)	قلعہ بھرت پور کا محاصرہ (یہ لڑائی لارڈ کمبر میر کی کمانڈ میں لڑی گئی تھی۔ کمبر میر کو ۷/اکتوبر ۱۸۲۵ء کو ہندوستان میں انگریزی فوجوں کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا تھا۔ (ولادت ۱۷۷۳ء)
۱۸۲۵ء(۱۸/دسمبر)	انگریزی فوجوں کی فتح۔
۱۸۲۶ء(اواخر اپریل)	منکاف کی بھرت پور سے دہلی کی طرف واپسی۔ موسم گرما شروع ہو گیا تھا۔ دہلی سے راجپوتانہ کے دورے پر روانہ ہوئے۔
۱۸۲۶ء(۳/اگست)	گورنر جنرل (لارڈ ایمرسٹ) کی کلکتے سے شمالی ہند کے دورے پر روانگی۔
۱۸۲۶ء(اواخر اگست)	قیاس ہے کہ انھیں دنوں فیروزپور میں غالب کو گورنر جنرل کے دورے کی اطلاع ملی ہوگی۔
۱۸۲۶ء(تا اواخر ستمبر)	غالب فیروز پور ہی میں رہے (ملاحظہ کیجیے رائے چھج مل کے نام کا خط محررہ تقریباً اگست ۱۸۲۶ء)
۱۸۲۶ء(اوائل اکتوبر)	غالب کی فرخ آباد کے راستے کان پور کو روانگی۔
۱۸۲۶ء(اوائل نومبر)	کان پور پہنچے اور وہاں پہنچتے ہی سخت بیمار پڑ گئے اور گورنر جنرل کے کان پور پہنچنے سے پہلے ہی لکھنؤ منتقل ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔

۱۸۲۶ء(۱۸/نومبر)	لارڈ ایمرسٹ (گورنر جنرل، کا کان پور میں ورود......)
۱۸۲۶ء(۲۰/نومبر)	بادشاہ اودھ (غازی الدین حیدر) کی گورنر جنرل کے حضور میں باریابی۔ غالب اس وقت بیماری کی حالت میں لکھنؤ میں مقیم تھے۔ دوسرے دن انگریز حکام نے شاہ اودھ سے جوابی ملاقات کی۔
۱۸۲۶ء(یکم دسمبر)	انگریزی پارٹی لکھنؤ پہنچی اور سال کے آخر میں واپس انگریزی علاقے میں آگئی
۱۸۲۷ء(۸/جنوری)	آگرے میں گورنر جنرل کا ورود۔
۱۸۲۷ء(۲۲/جون)	غالب لکھنؤ سے کان پور کو روانہ ہوئے (گویا لکھنؤ میں کم و بیش آٹھ ماہ مقیم رہے اگرچہ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ لکھنؤ میں انھوں نے یہ مدت کیوں کر گزاری)۔
۱۸۲۷ء(۲۵/جون)	کان پور روانگی۔
۱۸۲۷ء(۲۷یا۲۸/جون)	کان پور سے باندہ کے لیے روانگی۔ قیاس ہے کہ جولائی کے پہلے ہفتے میں باندہ پہنچے ہوں گے۔ باندہ کے سفر کا مقصد کلکتہ کے سفر کے لیے زاد راہ فراہم کرنا تھا۔ باندہ آکر بیمار پڑگئے تقریباً ساڑھے چار ماہ باندہ ہی میں رہے۔
۱۸۲۷ء(تقریباً ۱۳/نومبر)	کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے
۱۸۲۷ء(۱۵/نومبر)	مودہا پہنچے۔ ۱۸/نومبر تک آرام کیا۔ ۱۹/نومبر کو وہاں سے روانہ ہو کر رات ایک گاؤں میں بسر کی۔
۱۸۲۷ء(۲۰/نومبر)	چلہ تارا پہنچے۔ اسی روز "لڑھیا" بیل گاڑی چھوڑ کر کرائے کی کشتی میں الہ آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔

۱۸۲۷ء(۲۷/نومبر)	الہ آباد پہنچے۔ یہ شہر غالب کے لیے انتہائی وحشت خیز ثابت ہوا اس لیے علی الصباح کشتی ہی کے ذریعے بنارس کا سفر اختیار کیا۔
۱۸۲۷ء(یکم دسمبر)	بنارس پہنچے۔ یہ شہر انھیں بہت پسند آیا (خیر بہوروی مرحوم نے فروغ اردو غالب نمبر مطبوعہ ۱۹۶۹ء میں بنارس میں مرزا غلام احمد وغیرہ کو غالب کا میزبان قرار دیا ہے مگر یہ زاجعل ہے۔ نامہ ہائے غالب و فارسی مرثیہ ترمذی میں خود غالب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ بنارس میں وہ پہلے سرائے نیرنگ آباد (نورنگ آباد) میں چار پانچ روز مقیم رہے تھے۔ پھر اسی سرائے کے عقب میں مٹھالی اور میاں رمضان کی حویلی میں کرائے پر رہنے لگے تھے۔ اسی حویلی سے ملی ہوئی گوسی خانساماں کی حویلی تھی۔)
۱۸۲۷ء(۲۹/دسمبر)	بنارس سے کلکتہ کے لیے روانگی کشتی کی سواری مہنگی ہونے کی وجہ سے مسافت خشکی کے راستے گھوڑے کی سواری سے طے کرنی پڑی۔
۱۸۲۸ء(جنوری)	نواب احمد بخش خاں کا انتقال اکتوبر ۱۸۲۷ء میں ہوا تھا۔ یہ خبر غالب کو سفر کلکتہ کے دوران میں مرشد آباد میں ملی تھی۔ قیاس ہے کہ غالب جنوری ۱۸۲۸ء میں مرشد آباد پہنچے ہوں گے۔
۱۸۲۸ء(۱۹ یا ۲۱/فروری)	کلکتے پہنچے (غالب نے سہ شنبہ چہارم شعبان (۱۲۴۳ھ) لکھا ہے۔ سہ شنبہ ۲ شعبان کو پڑتا ہے جو مطابق ہے ۱۹/فروری کے اور ۴ شعبان پنج شنبہ تھا جو مطابق ہے ۲۱/فروری کے)

۱۸۲۸ء(۲۲/فروری)	ہگلی کے نواب علی اکبر خاں سے ملنے گئے۔
۱۸۲۸ء(۶/اپریل)	انثائی میں سراج الدین علی خاں مرحوم (باندہ کے مولوی محمد علی خاں کے بھائی اور سابق قاضی القضاۃ کلکتہ) کی بیگم کے ہاں گئے۔
۱۸۲۸ء(۲۸/اپریل)	گورنر جنرل کے پرشین سکریٹری مسٹر انڈریو سٹرلنگ اور گورنمنٹ کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سکریٹری مسٹر سائمن فریزر سے ملاقات ہوئی۔ عرض داشت داخل کی۔
۱۸۲۸ء(۳۰/اپریل)	ایک خط میں لکھتے ہیں کہ چھوٹے بھائی مرزا یوسف کے ہاتھ کا ۱۳/اپریل کا لکھا ہوا خط ملا۔ معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت پہلے سے بہت اچھی ہے اور اب وہ "زن و دختر و مادر" کو "زن و دختر و مادر" سمجھنے لگے ہیں۔ گویا غالب اور مرزا یوسف کی ماں بھی ان دنوں آگرے سے دہلی آئی ہوئی تھیں اور مرزا یوسف کے یہاں رہ رہی تھیں۔
۱۸۲۸ء(یکم جون)	کلکتہ میں ایک مشاعرے میں شمولیت۔
۱۸۲۸ء(۸/جون)	پھر مشاعرے میں شمولیت مرزا حسین علی وکیل رئیس ہرات کی اشعار غالب کی ستائش مگر حامیان قتیل کی اشعار غالب پر نکتہ چینی۔
۱۸۲۸ء(۱۵/جون)	ایک اور مشاعرے میں شمولیت اور اپنے معترضین کے اعتراضات کا جواب۔
۱۸۲۸ء(۲۰/جون)	سپریم کونسل کی ہدایت کہ ریذیڈنٹ دہلی کے توسط سے عرضی دیں۔ باندہ کے مولوی محمد علی خاں کو لکھا کہ وہ ایک ہزار روپیہ قرض لے کر کلکتہ بھجوانے کا بندوبست کریں۔

۱۸۲۸ء(۱۵/ستمبر)	اہتمام پر مختار نامہ تیار کر کے دہلی کو روانہ کیا۔
۱۸۲۸ء(۹/اکتوبر)	مولوی محمد علی خاں (باندہ) سے مبلغ دوصد روپے کی ہنڈی موصول ہوئی۔
۱۸۲۸ء(۲۶/اکتوبر)	دہلی سے کلکتہ تک کے سفر میں ایک گھوڑا، ایک سائیس، ایک چر کٹا، تین ذاتی خدمت گار اور ایک کہار، غالب کے ساتھ تھے۔ انھوں نے اخراجات کے پیش نظر ۲۶ اکتوبر سے پہلے گھوڑا ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کر دیا اور سائیس اور چر کٹے کو چھٹی دے دی۔ واپسی کا سفر کشتی سے طے کیا۔
۱۸۲۸ء(۲۵/دسمبر)	کرسمس کے موقع پر مسٹر فریزر سے ملاقات۔
۱۸۲۹ء(۱۰/فروری)	دہلی ریذیڈنسی میں عرضی داخل کی۔
۱۸۲۹ء(۱۶/فروری)	گورنر جنرل کے دربار میں شمولیت۔ نواب علی اکبر خاں کے ساتھ دسویں نشست۔
۱۸۲۹ء(۱۰/مارچ)	پھر مولوی محمد علی خاں (باندہ) سے ہزار روپے کا قرض مہیا کرنے کی درخواست کی۔
۱۸۲۹ء(مئی)	مولوی محمد علی خاں کی طرف سے ۔/۲۰۰ روپے کی شاہ جوگ ہنڈی موصول ہوئی
۱۸۲۹ء (جون)	آگرہ سے ۔/۵۷۴ روپے کی ہنڈی ملی۔ ظاہر ہے والدۂ غالب نے بھیجی ہوگی۔ شاید مرزا یوسف کے ٹھیک ہونے پر والدۂ غالب و یوسف واپس آگرہ چلی گئی ہوں گی۔
۱۸۲۹ء(یکم اگست)	پھر گورنر جنرل کے دربار میں حاضری۔ معلوم ہوا کہ گورنر جنرل ہندوستان کے دورے پر نکلیں گے، سو غالب نے بھی دہلی پلٹ آنے کی ٹھانی۔

۱۸۲۹ء(۱۵/اگست)	کلکتہ سے ایک خط مورخہ ۱۴/اگست ۱۸۲۹ء میں غالب نے لکھا ہے کہ وہ کل ۱۵/اگست کو بہر حال کلکتہ سے روانہ ہو جائیں گے۔
۱۸۲۹ء(۳۰/اکتوبر)	باندہ واپس پہنچے (۱۵/اگست کا سفر ملتوی ہو گیا۔ وسط اکتوبر تک کلکتہ سے روانہ ہوئے ہوں گے۔)
۱۸۲۹ء(۷/نومبر)	باندہ سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔
۱۸۲۹ء(۲۹/نومبر)	دہلی واپس پہنچے۔

عارف اور فرزندیِ غالب؟

غلام [1] حسین خاں مسرور (پ: ۸۷/۱۷۸۶ء) (و : ۱۸۵۴ء اکتوبر)

محمد اسد اللہ بیگ خاں غالب (پ: ۱۷۹۷ء ۲۷ دسمبر) (و : ۱۸۶۹ء ۱۵ فروری)

زین [2] العابدین خاں عارف (پ: ۱۸/ ۱۸۱۷ء) (و : ۱۸۵۲ء اپریل)

ا۔ غالب، میاں داد خاں سیاح کو ۲۵/اگست ۱۸۶۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:
"تمھارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو [3] کہ ۷۴ برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی......"

امراؤ بیگم غالب سے دو سال چھوٹی تھیں۔ اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان ساتوں بچوں کی ولادت اور وفات ۵۰/۱۸۴۹ء سے پہلے ہو چکی تھی۔

ذکر غالب کے پانچویں ایڈیشن کے ص ۱۳۶ پر درج ہے۔

۲۔ "..... جب مرزا غالب کا اپنا کوئی بچہ زندہ نہ رہا تو انھوں نے زین العابدین خاں (عارف) کو متبنّی کر لیا..... مگر افسوس کہ انھیں عارف کی جوانا مرگی کا داغ اٹھانا پڑا۔ اس جوان صالح کا..... عین عالم شباب میں نکسیر سے بہ کثرت خون ضائع ہو جانے اور اسہال کے مرض سے اپریل ۱۸۵۲ء (جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ) میں انتقال ہوا۔ انتقال کے

وقت [4] عمر صرف ۳۶ برس کی تھی۔"

خسرو مرزا لکھتے ہیں:

۳۔ "بس ان (غالب) کا رجحان محبت، بوجہ لاولدی، اولاد بنیادی بیگم (دختر الٰہی بخش خاں معروف، زوجہ غلام حسین خاں مسرور) سے ایسا والہانہ ہوا کہ انھوں نے زین العابدین خاں عارف کو اپنا بیٹا بنالیا [5] ....."

"......زین العابدین عارف...... کو مرزا غالب نے متبنّٰی بنایا اور ان کی اولاد کو اپنے گھر کا فرد سمجھا [6] ......"

غالب کے عارف کو متبنّٰی بنالینے کی بات اوروں نے بھی کہی ہے مگر ان میں سے کوئی ایسا نہیں جس نے غالب یا عارف کو دیکھا ہو اور جو ان کے ہم عصر ہیں وہ اس بات کا قطعاً ذکر نہیں کرتے۔ چنانچہ مولوی کریم الدین گلدستۂ [7] نازنیناں میں عارف کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

۴۔ "عارف تخلص نواب زین العابدین خاں بہادر، بیٹے نواب غلام حسین خاں بہادر، خلف الرشید جناب نواب فیض اللہ بیگ سہراب بیگ کے، اور خواہر زادہ [8] اور شاگرد نواب اسداللہ خاں غالب معروف بہ مرزا نوشہ کے..... اصلاح شاہ نصیر سے لیتے تھے لیکن بعد ایک مدت کے جب کہ نواب اسداللہ خاں بہادر وارد شہر ہذا ہوئے نسبت تلمذ بھی ان سے حاصل کی اور طرز طرح اول کو طرح دی ..... ان روزوں میں اس عاجز (کریم الدین مولف تذکرہ) کے مکان پر محفل مشاعرہ جو منعقد ہوتی ہے۔ یہی صاحب (عارف) میر مشاعرہ ہیں ..... دیوان..... معرض طبع میں آیا چاہتا ہے....."

انھیں مولوی کریم الدین نے تین سال بعد ایک اور تذکرہ تالیف کیا جس کا نام طبقات شعرائے ہند رکھا۔ یہ تذکرہ ۱۸۴۷ء میں مکمل ہوا اور ۱۸۴۸ء میں چھپا۔ اس کے صفحات

۳۹۹تا۴۰۱پر عارف کا ترجمہ درج ہے۔ لکھتے ہیں:

۵۔ "عارف تخلص، نام زین العابدین خاں خواہر زادہ۹ نواب اسد اللہ خاں مرزا نوشہ غالب کے۔ ... جن ایام میں کہ میرے چھاپہ خانہ میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا، یہی شاعر میر مجلس اور میر مشاعرہ مقرر تھا۔... اب ان ایام میں بسبب حدت ذہن اور تیزی فکر سخن کے سوکھ کر مثل کانٹے کے ہو گیا ہے، بہت دبلا پتلا سا قد ہے۔ داڑھی بھر کر نہیں نکلی۔ ٹھوڑی ہی پر کچھ بال ہیں۔.....اس سال میں کہ ۱۲۶۳ھ ہیں، عمر اس کی قریب تیس برس کے ہے۔"

اسی تذکرے کے ص ۳۱۹ پر عارف کے والد غلام حسین خاں مسرور کا ترجمہ بھی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

۶۔ مسرور۔ نواب غلام حسین خاں بہادر مسرور، والد نواب زین العابدین عارف کے۔ میری ان کی ملاقات ایک دفعہ اس طور پر ہوئی تھی کہ نواب زین العابدین عارف یعنی ان کے بیٹے، جو میرے بہت دوست اور مہربان ہیں، ان کی بیماری کی خبر کو ان کے گھر گیا تھا۔ اس جاے میں نے ان کو دیکھا، قریب ساٹھ برس ان کی عمر ۱۲۶۱ھ میں تھی ... جن ایام میں میرے مکان پر مشاعرہ ہونا شروع ہوا، انھوں نے بھی ایک دفعہ ایک غزل اپنے خلف الصدق عارف مذکور کے ہم دست روانہ کی تھی....."

مرزا قادر بخش صابر تذکرہ گلستان سخن میں جو انھوں نے ۱۸۵۵ء میں تالیف کیا تھا، لکھتے ہیں:

۷۔ "عارف تخلص، نواب زین الدین خاں مرحوم، خلف رشید نواب غلام حسین خاں مبرور مسرور تخلص، شاگرد مرزا اسد اللہ خاں غالب...... سن بارہ سو ارسٹھ ہجری میں رخصت سفر باندھ کر گلشن جناں کی طرف راہی ہوا ... "

حالی، یادگارِ غالب میں "اولاد" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

۸۔ "مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی۔ ابتدا میں سات بچے پے درپے ہوئے، مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔ اس لیے ایک مدت سے وہ اور ان کی بی بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے مگر غدر کے چند سال پہلے جب ان کی بی بی کے بھانجے زین العابدین خان عارف کا انتقال ہو گیا...... تو مرزا اور ان کی بی بی نے چھوٹے لڑکے حسین علی خاں کو جو اس وقت بہت کم عمر تھا، اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا ... جب زین العابدین خاں کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو حسین علی خاں کے بڑے بھائی باقر علی خاں کو بھی مرزا نے اپنی سرپرستی میں لے لیا......"

اب اس سے پہلے کہ غالب کے مختلف خطوں کے ذریعے یا دوسرے شواہد و دلائل سے جائزہ لیا جائے کہ غالب اور عارف کے تعلقات حقیقت میں کیا تھے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی ان تین تحریروں کا ذکر کر دیا جائے جن سے ظاہراً اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ عارف واقعی غالب کے متبنّیٰ تھے۔

پہلی۔ غالب کے "مرثیہ عارف کا ایک شعر دیکھیے:

۹۔ "تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور"

دوسری۔ عارف کے انتقال سے تقریباً دو مہینے بعد ۱۸ جون ۱۸۵۲ء کو لکھتے ہیں":

۱۰۔ "سنو صاحب، یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں۔"

۱۱۔ تیسری۔ غالب کا وہ قطعہ جو غالب کے کلیات نظم فارسی کے ص ۴۰ پر درج ہے۔

یہ مجموعہ کلام پہلی بار ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ عارف کے متعلق غالب کی

تحریر اوپر دی گئی دونوں تحریروں سے پہلے کی ہے۔ ۱۵/اشعار کے اس قطعے سے چند اہم شعر پیش کیے جاتے ہیں:

"آں پسندیدہ خوے عارفؔ نام کہ زخش شمع دو دمان منست

☆☆☆

آنکہ در بزمِ قرب و خلوت انس غم گسار و حزاجدان منست

☆☆☆

بتولا فدائے نام علی ست چوں بناشدہ چنیں کہ جانِ منست

☆☆☆

اے کہ میراث خوارِ من باشی اندر اردو کہ آں زبانِ مست

☆☆☆

۲

غالب کے کلام پر نظم ونثر میں پہلے پہل عارف کا ذکر ان کے ایک فارسی خط بنام آزردہ میں آیا ہے۔ یہ خط پنج آہنگ کے مخطوطہ محررہ ۱۸۳۵ء میں شامل ہے۔ لہٰذا یہ جب کا ذکر ہوا جب عارف کی عمر ابھی ۱۸ سال سے بھی کم تھی۔ [۱۲]اس کا مفہوم یہ ہے:

۱۲۔ آپ نے مشفقی مرزا اسد بیگ کے لیے جو چارہ سازی کی، اس پر رشک آیا۔ اقبال نشاں مرزا زین العابدین خاں کی۔ سفارش کا جو جواب مجھ تک پہنچا ہے، اس نے زخموں پر نمک پاشی کی۔ اب جیسے تیسے مکری مرزا فاضل بیگ کا کام کر دیں۔

پنج آہنگ میں ایک خط [۱۳]مورخہ ۲۳ مارچ (۱۸۴۳ء) بنام شیفتہؔ شامل ہے۔ عارف کی عمر اس وقت ۲۵ سال کے قریب ہو گی۔ مفہوم حسب ذیل ہے:

۱۳۔ جمعہ کی رات کو بزم سخن آراستہ ہوئی مگر چوں کہ میں نے غزل نہیں کہی تھی اس لیے اس میں شامل ہونے سے گریز کر رہا تھا کہ ضیاء الدین خاں

نے زین العابدین خاں عارف اور غلام حسین خاں محو کو ہاتھی دے کر
میرے یہاں بھیج دیا اور یہ دونوں مجھے اپنے ساتھ ہی لے کر چلے......
میرے دوستوں میں (ازیاران بندہ) سے مرزا زین العابدین خاں
عارف اور جواہر سنگھ جوہر نے طرحی زمین میں دو غزلیں پڑھ کر
نغز گوئی اور ندرت فکر کو آسمان تک پہنچادیا......

پنج آہنگ ہی میں ایک [14] خط بنام ضیاء الدین احمد خاں ہے جو غالب نے دتی سے آگرہ بھیجا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ضیاء الدین احمد خاں آگرہ کسی کام سے گئے ہوئے ہوں گے۔ خط پنج آہنگ کی اشاعت اول (۱۸۴۹ء) میں شامل ہے۔ لہٰذا ۱۸۴۹ء سے پہلے کا ہے۔ مگر ۱۸۴۸ء یا اس کے بعد کا ہے کیوں کہ بقول کریم [15] الدین، عارف لڑکپن سے ۱۸۴۷ء تک دتی ہی میں رہے تھے کہیں کا سفر نہیں کیا تھا اور کہ ان دنوں ضیاء الدین احمد خاں اور عارف کی گاڑھی چھنتی تھی۔ خط کے اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اس سفر میں عارف، ضیاء الدین احمد خاں کے ساتھ تھے۔

۱۴۔ "حالیا از ہمدمان شایہ اقبال نشان مرزا بن العابدین خاں دعای رسانم......"

اب چند خط اردو [16] معلی سے دیکھیے:

ص ۵۷ مورخہ ۲۳/ دسمبر ۱۸۵۹ء بنام تفتہ۔

۱۵۔ "وہ عزیزداری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں، اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے...... اگر دیکھو تو مجھ کو اس شخص (عبدالرحمٰن) سے خس کے برابر علاقہ عزیزداری کا نہیں۔ از راہ حسنِ اخلاق اگر عزیز لکھ دیا تو کیا ہوتا ہے...... زین العابدین خاں عارف میری سالی کا بیٹا، یہ شخص اس کی سالی کا بیٹا۔ اس کو جو چاہو سمجھ لو......"

ص ۳۹۲ مورخہ ۲۲ جون (۱۸۶۵ء) بنام امین الدین احمد خاں:

۱۶۔ "بھائی غلام حسین خاں مرحوم کے تتبع ہو کہ زین العابدین وحیدر حسن اوران کی اولاد کو کبھی منھ نہ لگایا......"

۳

خمخانۂ[۱۷] جاوید میں درج ہے۔

۱۷۔ "عارف۔ نواب زین العابدین خاں۔ نواب غلام حسین خاں..... مسرور مرحوم کے خلف الصدق۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں کے بھانجے، مرزا غالب کے شاگرد رشید اور سسرال کے رشتہ سے ان کے بھی بھانجے تھے......

عارف ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ۳۵ سال تک دنیا کی ہوا کھائی۔ ۱۲۶۸ھ میں عالم قدسی کو سدھارے۔ حالت نزع میں جب حضرت غالب عیادت کو تشریف لائے تو بستر پر پڑے پڑے یہ شعر پڑھا۔

آنکھوں میں دم ہے مثل چراغ سحر ہوں میں
لو لگ رہی ہے جان کو کیا انتظار ہے

مولوی کریم الدین[۱۸] لکھتے ہیں:

۱۸۔ "نواب ضیاء الدین خاں بہادر سے کمال ارتباط اور صحبت اس (عارف) کو رہتی ہے......"

کلیات عارف میں عارف کا ایک ۷ اشعر کا قطعہ ہے جو غالب سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے۔ لکھا ہے۔

۱۹۔

قطعہ

قبلۂ جان و دل ترا فدوی   تجھ کو کہوے برا، یہ طاقت ہے؟
اسد اللہ نام ہے تیرا   اس بزرگی کی کچھ نہایت ہے
ورد نامِ بزرگ کا تیرے   اس میں کچھ شک نہیں عبادت ہے

حق نے سب پر کیا تجھے غالب　　تجھ سے روکش ہو کس کی طاقت ہے؟
مجھ کو زیبا ہے جتنا ناز کروں　　مجھ پہ جب یہ تری عنایت ہے
نظر منشی فلک کی مجھے　　کچھ نہ پروا ہے کچھ نہ حاجت ہے
عرض کرتا ہوں شکوہ ٔ حساد　　گرچہ میری خلاف عادت ہے
وہ سبب میں بیان کرتا ہوں　　ان کی جس وجہ یہ شرارت ہے
فیض صحبت سے تیری تیرا غلام　　جو بدل قائلِ امامت ہے
سُنّی اس زمرۂ خوارج میں　　ہدفِ ناوکِ ملامت ہے
تبرّ و محو ہیں مرے دشمن　　آسماں کی انھیں نیابت ہے
بات ان کی لگے ہے پتھر سی　　دل میں ان کے زبس قساوت ہے
ان کی کیا کیا صفت کروں تحریر　　ایک آفت ہے اک قیامت ہے
ایک جلتا ہے رشک سے دائم　　بس کہ عزت اسے نہایت ہے
دوسرا محوِ کینہ جوئی ہے　　یہ ہمیشہ سے اس کی عادت ہے
زور کرتے ہیں ناتوانوں پر　　ذوق ہے ، گر یہی شجاعت ہے
ہیں وہ سارے جہاں کے جھوٹے　　قول میں ان کے کب صداقت ہے؟

☆☆☆

۴

'۱' و '۸' سے ظاہر ہے کہ غالب کے ساتھ اولاد ہوئیں، لڑکے بھی لڑکیاں بھی۔ غالب یہ بھی بتاتے ہیں کہ "۴۷ برس کی عمر میں" ہوئیں۔ جس سے صرف یہ مراد ہے کہ آج (۲۹/اگست ۱۸۶۷ء) تک (یا دوسرے لفظوں میں جب تک امراؤ بیگم بچہ پیدا کرنے کے اہل رہیں، یعنی تقریباً پچاس برس یا ۱۸۴۹ء تک) ان کی سات اولادیں ہوئیں۔ اس بیان سے حالی کے قول کی نفی ہو جاتی ہے کہ غالب کے ابتدا میں سات بچے پے درپے ہوئے۔" بالفرض یہ بچے پے درپے بھی پیدا ہوئے ہوں اور ابتدا ہی میں پیدا ہوئے ہیں تو بھی ایسے

حالات میں غالب کو متبنّیٰ کرنے کا خیال پچاس سال کی عمر سے پہلے نہیں ہو سکتا کیوں کہ بیوی بانجھ نہیں اور اس کی بچہ پیدا کرنے کی عمر ابھی باقی ہے۔ غالب ۱۸۴۳ء میں پچاس سال کے اور ۱۸۵۲ء میں پچپن سال کے ہوئے اور اسی سال اپریل ۱۸۵۲ء میں ۳۵ سال کی عمر میں عارف کا انتقال ہوا۔ لہٰذا غالب کا عارف کو باقاعدہ گود لینا ایک مفروضے کے سوائے کچھ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ:

۱۔ '۲' میں مولوی کریم الدین لکھتے ہیں کہ عارف یعنی ان (مسرور) کے بیٹے جو میرے بہت دوست اور مہربان ہیں، ان کی بیماری کی خبر کو ان کے گھر گیا تھا، اس جاے میں نے ان (مسرور والد عارف) کو دیکھا، قریب ساٹھ برس ان کی عمر ۱۲۶۱ھ میں تھی...... میرے مکان پر مشاعرے (میں) انھوں نے بھی ایک دفعہ ایک غزل اپنے خلف الصدق عارف مذکور کے ہمدست روانہ کی تھی۔

۳۔ '۷' میں ہے کہ حالت نزع میں، جب حضرت غالب، (عارف کی) عیادت کو تشریف لائے تو بستر پر پڑے پڑے (عارف نے) یہ شعر پڑھا:

آنکھوں میں دم ہے مثل چراغ سحر ہوں میں
لو لگ رہی ہے جان کو کیا انتظار ہے

ان ہر دو بیانات سے ظاہر ہے کہ عارف جو مسرور کے خلف الصدق تھے کبھی غالب کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے گھر میں نہیں رہے۔ وہ مرتے دم تک اپنے گھر یا اپنے باپ کے ساتھ رہے۔ اگر وہ غالب کی فرزندی میں ہوتے تو غالب کے ساتھ غالب کے گھر میں رہتے۔

۱۔ '۱۰' میں غالب کا تفتہ کو لکھنا کہ "زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا" محض اس کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ غالب، عارف کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور مثل فرزند کے سمجھتے تھے ورنہ عارف سے اپنا حقیقی رشتہ انھوں نے تفتہ ہی کے نام ایک اور خط میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

۲۔ ۱۵' "مجھ کو اس شخص (عبدالرحمٰن) سے خس برابر علاقہ عزیزداری کا نہیں۔ از راہ حسن اخلاق اگر عزیز لکھ دیا تو کیا ہوتا ہے۔ زین العابدین خان عارف میری سالی کا بیٹا، یہ شخص (عبدالرحمٰن) اس کی سالی کا بیٹا۔ اس کو جو چاہو سمجھ لو۔"

۵

نواب الٰہی بخش خاں معروف کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ بنیادی بیگم [۱۹] اور امراؤ بیگم۔

بنیادی بیگم کا نکاح نواب غلام حسین مسرور سے ہوا اور امراؤ بیگم کا مرزا غالب سے۔ بنیادی بیگم اور مسرور میں زیادہ دن نہ بنی تاہم اس تھوڑی سی مدت میں ان کے دو صاحبزادے پیدا ہوئے۔ زین العابدین خاں (عارف) اور حیدر حسن خاں۔ جب میاں بیوی میں علاحدگی ہو گئی تو مسرور نے ایک مکان بنیادی بیگم کے نام ہبہ کر دیا اور دونوں بچوں کے ساتھ اس میں رہنے لگیں (مسرور نے بعد میں ایک عورت سنگی بیگم سے نکاح کر لیا تھا، غلام حسین خاں محو اسی دوسری بیوی کے بطن سے تھے۔ محو بھی غالب سے اصلاح لیتے تھے۔) چند وجوہات کی بنا پر غالب، عارف کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ کیوں؟ یہ ملاحظہ کیجیے:

(الف) دونوں بھائیوں میں زین العابدین خان زیادہ ہوشیار اور لائق تھے اور بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ حیدر حسن خاں کو شعر و سخن سے شغف نہ تھا، دوسرے ان کی شادی ان کی والدہ بنیادی بیگم کی حقیقی چچازاد ہمشیرہ ماہ رُخ بیگم (دختر نواب احمد بخش خاں) سے ہوئی تھی۔ اس طرح ماہ رُخ بیگم زوجہ حیدر حسن خاں، بنیادی بیگم کی بہو بھی تھیں اور سگی چچازاد بہن بھی۔ وہ بنیادی بیگم کی اطاعت کماحقہ نہیں کرتی تھیں [۲۰]۔ ساس بہو میں جھگڑا رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ غالب نے بنیادی بیگم ہی کا (جسے وہ مظلوم سمجھتے تھے) ساتھ دیا ہوگا اور حیدر حسن خاں کے رویے کو ناپسند کیا ہوگا۔

(ب) عارف، غالب کے شاگرد تھے [۲۱]۔

(ج) '۱۱' میں دیئے گئے اشعار غالب کے کلیات نظم فارسی میں شامل ہیں جو ۱۸۴۵ء

میں شائع ہوئی تھی۔ اس قطعے میں یہ شعر خاص اہمیت کا حامل ہے ۔

بتولا خدائے نام علی ست
چون نباشد چنیں کہ جان من ست

یہ قطعہ عارف کے نام ہے اور قیاس ہے کہ ۱۸۴۰ء میں یعنی شاگردی غالب کے کچھ ہی عرصے کے بعد کہا گیا ہوگا۔ اس شعر میں غالب نے بڑے ناز سے کہا ہے کہ عارف نہایت عقیدت سے حضرت علی کے نام پر فدا ہے اور ایسا کیوں کر نہ ہو تا وہ میری جان ہے (اس لیے ہر حال میں میری پیروی ہی کرتا۔)

(د) ۳ '۱۹' یہ قطعہ عارف کا فکر کردہ ہے جو غالب کو مخاطب ہو کر کہا گیا ہے۔ اس قطعے کے کئی شعر اہمیت کے حامل ہیں یہاں صرف ایک شعر درج کیا جاتا ہے۔ باقی اشعار پر آگے چل کر بحث ہوگی:

فیض صحبت سے تیرے غلام
جو بدل قائل امامت ہے

یعنی اے غالب! تیرا غلام (یعنی عارف) جو تیرے فیض صحبت سے بدل وجاں امامت کا قائل ہو چکا ہے۔ یعنی شیعہ بن چکا ہے...... یہ شعر گویا غالب کے مندرجہ بالا فارسی شعر کی تصدیق و تائید ہے۔

اب اس بحث کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ غالب عارف کو کیوں بمنزل فرزند سمجھتے تھے اگرچہ وہ ان کے باقاعدہ متبنٰی نہ تھے۔

۶

(ا) جب عارف اپریل ۱۸۵۲ء میں انتقال کر گئے تو ان کے چھوٹے بیٹے مرزا حسین علی خاں (شاداں وخیالی) صرف دو برس کے تھے۔ چوں کہ ان کی والدہ یعنی زوجہ عارف چند ماہ پہلے انتقال کر چکی تھیں اس لیے غالب کی بیوی امراؤ بیگم انھیں اپنے پاس لے آئیں۔ عارف کی والدہ بنیادی بیگم اور امراؤ بیگم سگی بہنیں تھیں۔ حسین علی خاں کے بڑے بھائی باقر علی

خاں (باقر و کامل) جو حسین علی خاں سے تین برس بڑے تھے، عارف کی وفات کے بعد اپنی دادی بنیادی بیگم ہی کے پاس رہے تھے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد وہ بھی غالب ہی کے پاس آگئے۔ مندرجہ بالا روایت اب عام طور پر تسلیم کرلی گئی ہے۔ لیکن غالب کے خط بنام تفتہ محررہ ۱۸ جون ۱۸۵۲ء سے کچھ اور شبہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "(عارف) کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں میرے پاس آرہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں...... مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے۔ مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں تنگ نہیں آتا۔"

اب یہ مسلمہ ہے کہ عارف نے اپریل ۱۸۵۲ء (جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ) میں وفات پائی۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ وہ یکم اپریل ۱۸۵۲ء (۱۰ جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ) کو مرے تو غالب کے مندرجہ بالا اب خط تک انھیں انتقال کیے صرف دو ماہ سترہ دن ہوتے ہیں۔ اس خط کی روشنی میں لگتا ہے کہ اس عرصے میں دونوں بچے غالب کے سایۂ عاطفت میں آچکے تھے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ ایسا عارضی طور پر ہوا ہو گا کیوں کہ باقر علی خاں مستقل طور پر اپنی دادی بنیادی بیگم کے انتقال کے بعد ہی غالب کے پاس لائے گئے تھے اور بنیادی بیگم کا انتقال ۱۴ جون (۲۸ رمضان) ۱۸۵۵ء کو ہوا تھا[۲۲]۔

(II) ۳ '۱۹' کے تحت قطعہ عارف کی نثر کچھ اس طرح ہوگی (اے غالب) اے قبلۂ جان و دل! تیرا فدوی (یعنی عارف) تجھ کو کس طرح برا کہہ سکتا ہے۔ تیرا نام اسد اللہ (یعنی شیر خدا) ہے۔ جس کی بزرگی کی کوئی انتہا نہیں۔ تیرے نام کا ورد، عبادت کے برابر ہے۔ تجھے (اے شیر خدا) خدا نے سب پر غالب کیا ہے اس لیے کس کی مجال جو تجھ سے رُوکش ہو۔ بلکہ مجھے تو جتنا ناز کروں زیبا ہے کہ تو مجھ پر مہربان ہے۔ مجھے منشی[۲۳] فلک کی نظر کرم کی نہ ہی پروا ہے نہ حاجت۔ اگرچہ یہ میری عادت نہیں تاہم میں حاسدوں کی شکایت کیا

چاہتا ہوں اور وہ سبب بیان کیا چاہتا ہوں جو وجہ شرارت بنا ہوا ہے۔
(اے غالب) تیرا غلام (یعنی عارف) جو تیرے فیض صحبت سے دل و جان سے امامت کا قایل ہو گیا ہے (یعنی شیعہ ہو گیا ہے) وہ ان خارجیوں [۲۴] کے زمرے میں تیر ملامت کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ نیر اور تحو [۲۵] میرے دشمن ہیں اور وہ اپنے آپ کو خدا کا قائم مقام سمجھتے ہیں۔ وہ اتنے سنگدل ہیں کہ ان کی بات پتھر کی طرح لگتی ہے۔ ان کی صفت یہ ہے کہ ایک کو آفت کہا جائے اور دوسرے کو قیامت۔ اگرچہ ایک (نیر) انتہائی معزز انسان ہے مگر دایم رشک سے آتش بجاں ہے اور دوسرا (تحو) کینہ جوئی میں محو ہے جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتا آتا ہے۔ وہ کمزوروں پر زور کرتے ہیں، لعنت ہے ایسی شجاعت پر، اور جہاں بھر کے جھوٹے ہیں ان کے کسی قول میں صداقت نہیں۔"

قطعے کا مطلب تو واضح ہے یہاں صرف یہ اضافہ کرنا ہے کہ یہ جھگڑا عارف کے تبدیل مسلک کے فوراً بعد اٹھ کھڑا ہوا ہوگا، غالب کو بھی شاید لپیٹ میں لے لیا گیا ہوگا۔ اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ قطعہ ۱۸۴۱ء کے لگ بھگ کا فکر کردہ ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ طبیعتیں دو ایک سال ہی کے بعد کافی حد تک صاف ہو گئی تھیں۔ اس سلسلے میں نامۂ غالب بنام شیفتہ (۲ ص ۴۱۳) مورخہ ۲۳ مارچ ۱۸۴۳ء اور نامۂ غالب بنام ضیاء الدین احمد خاں نیر (۲ ص ۴۱۳) مشمولۂ پنج آہنگ اشاعت اوّل ۱۸۴۹ء پیش کیے جا سکتے ہیں۔ پہلے میں نیر کا عارف اور تحو کو ہاتھی دے کر غالب کے گھر بھیجے اور مشاعرے میں شامل کرنے کا ذکر ہے اور دوسرے سے پتا چلتا ہے کہ نیر، عارف کی ہمراہی میں آگرہ گئے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کریم الدین (۳ ص ۱۸) ۱۸۴۷ء میں لکھتے ہیں کہ "نواب ضیاء الدین خاں بہادر (نیر) سے کمال ارتباط اور صحبت اس (عارف) کو رہتی ہے۔" تاہم معلوم ہوتا ہے کہ دلوں میں کچھ نہ کچھ چبھن ضرور رہ گئی تھی ورنہ غالب، عارف کے مرنے پر یہ نہ لکھتے:

مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سہو کے محض اس محبت کے کرب کی وجہ سے ہوں جو دل وجاں سے غالب کو عارف سے تھی۔

حواشی

(۱) کریم الدین تذکرۂ طبقات شعرائے ہند (ص ۴۱۹) میں لکھتے ہیں کہ غلام حسین خاں مسرور والد...... زین العابدین خان عارف...... میں نے ان کو دیکھا، قریب ساٹھ برس کے ان کی عمر ۱۲۶۱ھ میں تھی...... "اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مسرور ۱۲۰۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔ ۱۲۰۱ھ مطابق ہے ۸۷/۱۷۸۶ء کے۔

(۲) اسی تذکرے کے ص ۴۰۰ پر درج ہے "اس سال میں کہ ۱۲۶۳ھ میں عمر اس (عارف) کی قریب تیس برس کی ہے کہ یہ اشعار مذکور کے ہیں...... "گویا ولادت ۱۲۳۳ھ میں ہوئی تھی۔

(۳) یہ غالب کا سہو ہے۔ یہ خط اردوئے معلیٰ پہلا ایڈیشن ۱۸۶۹ء کے ص ۲۱/۲۰ پر درج ہے۔

(۴) سن ولادت ۱۲۳۳ھ (۱۸/ ۱۸۱۷ء) قرار پاتا ہے۔ انتقال اپریل ۱۸۵۲ء میں ہوا۔ اس طرح عارف نے عمر عزیز کے ۳۵ سال بھی پورے نہیں کیے۔

(۵) اصہار الغالب ص ۶۴۔ مطبوعہ فروری ۱۹۶۹ء

(۶) اصہار الغالب ص ۸۰۔ مطبوعہ فروری ۱۹۶۹ء

(۷) یہ تذکرہ اواخر ۱۸۴۴ء میں تالیف ہوا اور ۲۹ جولائی ۱۸۴۵ء کو مولف ہی کے مطبع رفاہ عام سے شائع ہوا۔

(۸) یہ غالب کے خواہر زادے نہیں بلکہ ان کی بیوی امراؤ بیگم کے خواہر زادے یعنی بھانجے تھے۔

(۹) "خواہر زادہ زوجہ نواب اسد اللہ خاں مرزا نوشہ غالب کے" ہونا چاہیے۔

(۱۰) خسرو مرزا لکھتے ہیں "بقول نانی اماں معظم زمانی بیگم صاحبہ (زوجہ باقر علی خاں کامل خلف عارف) مرثیہ، مرزا غالب، جنازہ (عارف) کے ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے تھے اور لوگوں کو رلاتے تھے۔" (اصبہار الغالب ص ۶۵) یہ کہانی محض بیانِ ماتم میں شدت لانے کے لیے گھڑلی گئی ہے۔

(۱۱) اردوئے معلّٰی ص ۶۷ پہلا ایڈیشن ۱۸۶۹ء خط بنام تفتہ۔

(۱۲) خط کا شروع اور آخر یہ ہے "قبلہ حاجات، اگر ایں بندہ...... نماند عمر و دولت زحساب افزوں باد۔

(۱۳) خط کا شروع اور آخر یہ ہے "جان راز تن سپاس و خواجہ...... ابر قطرہ فشاں بود و ہوا تگرگ باد۔

(۱۴) خط کا شروع اور آخر یہ ہے "برادر، اشک د آہِ غالب نامراد...... بہ میر کرم علی صاحب سلام۔ والسلام خیر ختام۔"

(۱۵) مولف تذکرہ گلدستۂ نازنیناں اور طبقات شعرائے ہند۔ (دیکھیے طبقات شعرائے ہند۔ ص ۴۰۱۔ ۴۰۰)

(۱۶) پہلا ایڈیشن۔ ۱۸۶۹ء اکمل المطابع دہلی۔

(۱۷) جلد پنجم۔ ص ۵۰۹

(۱۸) تذکرہ طبقات شعرائے ہند مولفہ ۱۸۴۷ء، ص ۴۰۰

(۱۹) ذکر غالب (پانچواں ایڈیشن ص ۱۳۶) میں بنیادی بیگم کو بڑی صاحبزادی اور امراؤ بیگم کو چھوٹی صاحبزادی لکھا ہے مگر تلامذۂ غالب (بار دوم ص ۳۹۱) میں بنیادی بیگم کو چھوٹی صاحبزادی لکھا ہے۔

(۲۰) اصبہار الغالب۔ ص ۸۵

(۲۱) عارف پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ انھوں نے ایک دیوان بھی "مطلع مہر سعادت" کے نام سے مرتب کرلیا تھا جو سراسر شاہ نصیر کے اسلوب کا آئینہ دار تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں کا کہنا ہے کہ جب مرزا غالب نے دلّی کو اپنا مستقر بنالیا تب عارف نے شاہ نصیر کی شاگردی ترک کر کے غالب کی شاگردی اختیار کرلی، مگر یہ قطعی غلط ہے کیوں کہ

جب غالب مستقل طور پر دلی آئے ہیں اس وقت عارف کے وجود میں آنے میں ابھی لگ بھگ پانچ سال باقی تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ جب شاہ نصیر عازم دکن ہوئے تب عارف نے غالب سے استفادہ شروع کیا۔ یہ بھی درست نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ نصیر نے دکن کے کئی سفر کیے۔ آخری سفر میں حیدر آباد دکن میں ۳۹/۱۸۳۸ء میں انتقال کیا۔ اس وقت عارف بیس اکیس برس کے تھے۔ میری رائے میں عارف نے شاہ نصیر کی وفات کے بعد ہی غالب سے اصلاح کلام کے لیے رجوع کیا۔ وہ پہلے بھی غالب کے عزیز تھے مگر اب غالب اور عارف گویا یک جان ہو گئے۔ حتیٰ کہ غالب کی تقلید میں عارف شیعہ بھی ہو گئے۔

(۲۲) مکتوب بنام نبی بخش حقیر ۲۳ جون ۱۸۵۵ء۔ گویا باقر علی خاں مستقلاً غالب کے پاس ۱۴ جون اور ۲۳ جون ۱۸۵۵ء کے درمیان کسی روز لائے گئے تھے۔ عین ممکن ہے کہ ۱۴ جون کو ہی آگئے ہوں۔

(۲۳) عطارد۔ سبعہ سیارہ میں سے ایک ستارے کا نام۔ جیوتش میں اسے بدھ کہتے ہیں۔ اسے علم اور عقل کا نگہبان کہتے ہیں۔ فارسی میں منشی فلک کو دبیر فلک بھی کہتے ہیں۔

(۲۴) خارجی مسلمانوں کے اس فرقے کو کہتے ہیں جو اہل بیت اور خصوصاً حضرت علی کو برا کہتا ہے اور ان سے دشمنی رکھتا ہے۔ قطعے میں عارف نے یہاں خارجیوں کے مقابلے میں خود کو سنّی کہا ہے جسے سے مراد "سخت پر عامل" کے ہیں۔

(۲۵) ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں (اکتوبر ۱۸۲۱ء تا ۲۷ جون ۱۸۸۵ء) غلام حسن خاں محو ولادت تقریباً ۱۸۲۲ء۔ ۱۸۶۶ء تک زندہ تھے۔

غالب کا ملازم خاص
کلّو داروغہ

۱۔ غالب کی زندگی میں

غالب کے کم از کم ۱۹ خطوں میں کلّو کا ذکر آیا ہے۔ یہ سب غالب کے تلامذہ اور احباب کے نام ہیں۔ منشی نبی بخش حقیر (۳ خط) مجروح (۳ خط) حسین مرزا (۳ خط) یوسف مرزا (۳ خط) شفق (ایک خط) بے تجر (ایک خط) سالک (ایک خط) حکیم غلام نجف خاں (ایک خط) علائی (ایک خط) ثاقب (ایک خط منظوم) میاں داد خاں سیاح (ایک خط)۔

پہلا خط جس میں کلّو کا ذکر آیا ہے۔ حقیر کے نام ہے اور ۲۱ مئی ۱۸۵۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ غالب کہتے ہیں:

> "کل رات کو پا کھل کا مربہ مرتبان میں رکھ کر اور اس کو مومی جامہ سے بند کیا اور اس پر اپنی مہر کر کر کلّو کے ہاتھ مرزا (حسن علی بیگ) کے پاس بھجوا دیا۔ کلّو ان کو مربہ دے کر رات کو اپنے گھر رہا۔ اب صبح ہوئی اور کلّو آیا تو اس نے بیان کیا کہ مرزا حسن علی بیگ نے بندگی کہی ہے اور کہا ہے کہ میں کل نہ جاؤں گا، پرسوں جاؤں گا......" [۱]

اس خط سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ کلّو کوئی پانچ سات سالہ بچہ نہ تھا (اس وقت بوڑھا یا ادھیڑ عمر کا تو وہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، کیوں کہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا اس نے بہت لمبی عمر پائی) جو ایسا ذمہ داری کا کام کر سکتا۔ میرے خیال میں کلّو اس وقت ۲۰ یا ۲۲

سال کا ضرور ہوگا اور اس طرح اس کا سال ولادت ۱۸۳۰ء کے قریب ہونا چاہیے۔ دوسری یہ کہ کلو خاص دلّی کا رہنے والا تھا اور رات کو غالب کے مکان پر نہیں رہتا تھا بلکہ اپنے گھر سونے کے لیے چلا جاتا تھا۔ اس کی تصدیق[۲] ۱۶/دسمبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط بنام حسین مرزا سے بھی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں:

"پرسوں کلو جوتا لے آیا، کل دونوں طرف سے کھلا ہوا (پارسل) لے کر گیا۔ ڈاک کے کارپردازوں نے الٹا پھیر دیا اور کہا کہ پولندہ بناؤ۔ پولندہ بنا کر لے گیا۔ کہا، بارہ پر دو بجے لے جائے گا۔ (کلو وہاں) بیٹھا رہا۔ رات کے نو بجے (پارسل) اس (کلو) کے سامنے روانہ ہوا۔ رسید لے کر اپنے گھر گیا......"

یعنی وہ پارسل کی رسید لے کر غالب کے پاس نہیں آیا۔ بلکہ زیادہ رات ہو جانے کی وجہ سے اپنے گھر چلا گیا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ کلو کا یہ دستور کم از کم ملازمت کے پہلے سات سال تک ضرور قائم رہا۔

کلو کی عمر کے بارے میں بگا بیگم صاحبہ (باقر علی خاں کامل کی اہلیہ جنھوں نے غالب کی زندگی کا آخری دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا) کا قول[۳] ہے "کہ کلو چودہ برس کی عمر میں مرزا (غالب) صاحب کے پاس آکر رہے۔" چودہ برس کی عمر کے تعین میں حافظے کی غلطی بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کلو ۱۸۵۲ء (خط بنام حقیر) سے کئی برس پہلے غالب کی ملازمت میں آیا ہو۔ کلو جس کا اصل نام کالے خاں تھا، غالب کے خطوں میں پہلی بار ۱۵ ستمبر ۱۸۵۴ء کے خط میں داروغہ (یعنی غالب کے ملازمین کے عملے کا سربراہ) کہہ کر پکارا گیا۔ حقیر کو لکھتے ہیں:

"صاحب ایک تپ پیچلی ہے کہ کوئی گھر نہ ہوگا جس کے آدھے آدمی تپ میں مبتلا نہ ہوں۔ باری کی تپ تو بتہ۔ کلو داروغہ، اس کی ماں، مداری کی گھر والی، اس کے بچے، سب بیمار......"

اگر میرا قیاس کردہ سال ولادت ۱۸۳۰ء صحیح ہے تو داروغگی کا خطاب پانے کے وقت کلو ۲۴ سال کا قرار پاتا ہے۔ یوں بھی اس سے کم عمر کے ملازم کا داروغہ دیوان خانہ مقرر ہونا تسلیم

نہیں کیا جاسکتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ کلو کم از کم شروع میں اپنے دوسرے رُفقائے کار کی طرح صوم وصلوٰۃ کا پابند ہوتا تھا۔ ۴ جون ۱۸۵۴ء کے خط بنام حقیر میں غالب رقم طراز ہیں۔ "میرے چار خدمت گار ہیں۔ چاروں روزہ [۳] دار ہیں۔" ظاہر ہے کہ ان چار خدمت گزاروں میں ایک کلو ہے۔ یا پھر مئی ۱۸۶۱ء کا خط بنام مجروح...... "کلو، ایاز کے سر پر قرآن رکھو، کلیان کے ہاتھ میں گنگا جلی [۵] دو......" ایک منظوم خط ثاقب کے نام ملتا ہے۔ اس رباعی میں غالب نے کلو کو حاجی لکھا ہے۔ کیا کلو واقعی حج کر آیا تھا یا کلو کے مذہب سے لگاؤ کو دیکھتے ہوئے غالب نے ایسا لکھ دیا ہے؟

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
ثاقب حرکت یہ کی ہے بے جا تم نے
حاجی کلو کو دے کے بے وجہ جواب
غالب کا پکا دیا کلیجا تم [۷] نے

مگر کلو کے اس مذہبی شغف کے متوازی چند چشم دید بیانات بھی ہیں اور وہ اس قابل ہیں کہ انھیں راوی ہی کی زبان میں بیان کیا جائے۔ عارف کے بھتیجے مرزا محمد حسن خاں عرف خضر مرزا [۷] کہتے ہیں۔

"کلو داروغہ گلاس دھو کر آدھ پاؤ شراب اس میں ڈال دیتا اور گلاس ڈھانک کر ان (غالب) کے پاس رکھ دیا کرتا تھا...... یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے......"

حالی کہتے ہیں:

"جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں، اس کی کنجی (کلو) داروغہ کے پاس رہتی تھی...... داروغہ (کلو) نہایت خیر خواہ تھا (یعنی رات کو مانگنے پر بھی زیادہ شراب نہ دیتا تھا......" [۸]

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے آخری ۱۸ سال میں کلو ان کی زندگی کا جزو بن

گیا تھا۔ گھر میں، سفر میں، آلام میں، ستر میں ہر قدم پر غالب کا ہم قدم ہے۔ غالب بھی ہر طرح کلّو کا خیال رکھتے ہیں۔ بیماری میں اپنے بچوں کے ساتھ، اس کی صحت کے لیے بھی دعائیں مانگتے ہیں۔ خطوں میں سے ذیل کے اقتباسات اس کے شاہد ہیں۔

۱۵/جولائی ۱۹۵۹ء بنام یوسف مرزا	اس وقت کلّو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی اُمید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیچ کے قابل۔
۳۱/دسمبر ۱۸۵۹ء بنام حسین مرزا	میر منشی سے ملا۔ ان کے خیمہ میں بیٹھ کر صاحب سکریٹر، بہادر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ کلّو بھی گیا جواب آیا کہ ہمارا اسلام دو اور کہو کہ فرصت نہیں ہے۔
۱۸۶۰ء.....؟ - بنام شفق	میرے گھر میں دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں ایک بڑا لڑکا (باقر علی خاں) اور ایک میرا داروغہ (کلّو) خدا ان دونوں کو صحت دے۔
۲۲/ستمبر ۱۸۶۱ء- بنام مجروح	کلّو داروغہ بیمار ہو گیا تھا۔ آج اس نے غسل صحت کیا۔
۱۸۶۴ء- بنام بے خبر	اب دیوان خانہ میں ایک میں ہوں اور ایک داروغہ (کلّو) اور ایک بیمار خدمت گار۔
۱۱/جولائی ۱۸۶۴ء- بنام سالک	کلّو داروغہ کورنش عرض کرتا ہے اوروں کو یہ پایہ حاصل نہیں کہ وہ کورنش بھی بجالائیں۔
۲۱/اکتوبر ۱۸۶۵ء بنام حکیم غلام نجف خاں	(رام پور میں) میں خوش، لڑکے (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) بھی خوش۔ کلّو اچھا ہو گیا۔
۲۲/دسمبر ۱۸۶۵ء- بنام علائی	کلّو اور لڑکا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔
۱۷/جون ۱۸۶۶ء- بنام سیاح	اے لو! آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست (عبدالجمیل جنوں کی بھیجی ہوئی آئی، دو ٹوکرے، ہر ٹوکرے میں سو آم۔ کلّو داروغہ نے میرے سامنے وہ ٹوکرے کھولے۔ دو سو میں تراسی آم اچھے نکلے اور ایک سو سترہ آم بالکل سڑے ہوئے۔

اس طرح اور بھی خط ہیں، جن میں کلّو وارونہ اور اس کے ساتھی ملازموں کا نام اور کام موجود ہے ان میں سے ایک خط کا ذکر یہاں خاص طور پر کیا جاتا ہے، یعنی خط مورخہ ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء بنام یوسف مرزا لکھتے ہیں:

"اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلو، کلیان، ایاز، یہ باہر، مداری کے جورو بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔"

اس سے پہلے ۱۵ ستمبر ۱۸۵۴ء کے خط بنام حقیر میں تپ کا ذکر کرتے ہوئے غالب کہہ چکے ہیں کہ کلّو وارونہ، اس کی ماں، مداری کی گھر والی، اس کے بچے، سب بیمار پڑے ہیں۔ ۲۶ جولائی ۱۸۵۹ء کے خط بنام یوسف مرزا میں لکھا ہے کہ "باقر علی اور حسین علی، اپنی وادی کے ساتھ ہیں...... قطب صاحب گئے ہوئے ہیں، ایاز اور نیاز علی بھی ان کے ساتھ ہیں۔" ۱۸/اگست ۱۸۵۹ء کے خط بنام یوسف مرزا میں تحریر ہے "یا علی، یا علی، یا علی، وس بار ول میں کہا ہوگا کہ مداری کا بیٹا دوڑ ہوا آیا اور تین خط لایا۔ یعنی وہ نیچے حویلی میں تھا، ڈاک کے ہرکارے نے خط لا کر دیے۔ نیاز علی اوپر لے کر آیا" ۲۲ ستمبر ۱۸۶۵ء کے خط بنام علائی میں ہے۔ "کلّو اور لڑکا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔"

مداری (پورا نام مداری خاں) غالب کا ایک قدیم نوکر تھا۔ اس کا ذکر بطور ایک فعال نوکر کے پہلی بار پنج آہنگ قلمی مکتوبہ[9] ۱۸۳۵ء میں ایک خط میں آیا ہے۔ غالب دہلی سے مرزا علی بخش خاں کو لکھتے ہیں:... مداری خاں سے رسد و نامہ راہے رساند (یعنی مداری خاں میرے رقعے کے ساتھ آپ کے پاس پہنچتا ہے) غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط سفر کلکتہ سے بہت پہلے کا ہے یعنی ۱۸۲۶ء سے پہلے کا۔ گویا مداری ۱۸۲۶ء میں یا اس سے پہلے سے غالب کا ملازم تھا، مگر مجھے ۱۸۴۹ء کے بعد کسی جیتے جاگتے مداری کا نام نہیں ملا۔ ۱۸۵۴ء، ۱۸۵۹ء کے اوپر بیان کردہ خطوں میں مداری کی بیوی اور اس کے بچوں کا ذکر تو ملتا ہے مگر خود مداری کا نہیں۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۴ء کی درمیانی مدت میں مداری کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ لڑکا نیاز علی جس کا ذکر اوپر کئی خطوں میں آیا ہے۔ مداری ہی کا بیٹا تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۵ء سے پہلے مداری کی اہلیہ، یعنی نیاز علی کی والدہ کا

بھی انتقال ہو چکا تھا۔ بقول بگا بیگم صاحبہ (آئینہ غالب ص ۹) مداری خاں کے لڑکے نیاز علی کو "مرزا صاحب نے *لے لیا تھا" اور بیٹی آبادی کو کلو نے اپنی بیٹی بنالیا تھا۔" مداری کے غالباً یہی دو بچے تھے۔

اب مندرجہ بالا سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ غالب کے یہاں ملازمت کے زمانے میں کلو کی ماں زندہ تھی اور باپ شاید زندہ نہ تھا۔ کلو کی یا تو شادی ہی نہیں ہوئی تھی یا اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ جب ہی اس نے مداری کی بیٹی آبادی کو اپنی بیٹی بنالیا تھا۔

ایک جگہ عارف کے بیٹے حسین علی خاں کا غالب سے شوخیاں کرنے کا حال بیان کرتے ہوئے خضر مرزا فرماتے ہیں۔ (آئینہ غالب ص ۷) "کھیل تماشے کا تو انھیں (حسین علی خاں کو) لپکا تھا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے پر ایک دفعہ بیس روپے خرچ کر دیے اور پھر مرزا صاحب کے پاس منہ بسورتے ہوئے آئے کہ دادا جان بیس روپے دلوایئے۔ مرزا صاحب نے کلو کو بلا کر کہا۔ "بھئی انھوں نے ایک پتھر اور مارا، دے دے بیس روپے۔"

غالب کی زندگی میں کلو کا ذکر آخری بار غالب کے انتقال کی گھڑیوں میں آتا ہے۔ مالک رام رقم طراز ہیں۔ (ذکر غالب۔ بار پنجم ص ۱۳۳):

> "بگا بیگم فرماتی تھیں کہ موت سے ایک دن پہلے (مرزا صاحب کو) کچھ افاقہ ہوا تو کھانے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ پھر ملازم سے کہا کہ مرزا جیون بیگ (یعنی مرزا باقر علی خاں اور بگا بیگم کی تب سب سے بڑی صاحبزادی) کو بلا لاؤ۔ یہ عموماً انھیں کے پاس کھیلتی رہتی تھیں!"
>
> ملازم انھیں بلانے کے لیے محل سرائے میں آیا تو وہ آرام کر رہی تھیں۔ بگا بیگم نے کہا کہ سو رہی ہے۔ جونہی جاگتی ہے، بھیجتی ہوں۔ ملازم (کلو) نے واپس آکر یہی کہہ دیا۔ اس پر فرمایا کہ بہت اچھا، جب وہ آئے گی ہم کھانا کھائیں گے۔ اس کے بعد جونہی گاؤ تکیے پر سر رکھا، بے ہوش ہو گئے۔ . . اسی حالت میں اگلے دن ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دو پہر ڈھلے اس باکمال کا انتقال ہو گیا۔ . . "

۲۔ غالب کے انتقال کے بعد

ذکر غالب [۱۲] میں لکھا ہے کہ "مدارتی، کلو داروغہ اور کلیان تینوں بہت لمبے عرصہ تک ان (غالب) کے پاس (ملازم) رہے۔ بلکہ کلو کا انتقال بھی مرزا کے بعد اسی گھر میں ہوا" (جس میں مرزا غالب کا انتقال ہوا تھا۔)

چوں کہ کتاب میں اس بیان کے ماخذ کی نشان دہی نہیں کی گئی تھی۔ اس لیے میں نے جناب مالک رام سے ماخذ کے بارے میں اور کلو کی تاریخ وفات کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا [۱۳]۔

> "کلو کے بارے میں اطلاع بگا بیگم سے ملی تھی۔ افسوس کہ اس وقت میں نے زیادہ پوچھ گچھ نہ کی ورنہ ممکن ہے کہ اس کا سال وفات بھی معلوم ہو جاتا۔ وہ ٹھیک سال تو شاید نہ بتا سکتیں لیکن کچھ اتا پتا ضرور مل سکتا تھا۔ . . ."

پھر بھی رہ رہ کر ذہن میں یہی خیال آتا تھا کہ کلو امراؤ بیگم (اہلیہ غالب) ہی کی زندگی تک اس مکان میں رہ پایا ہوگا؟ کیا بیگم کے انتقال کے بعد بھی وہاں کلو کی سکونت کا امکان ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا امکان نہیں تو کلو زیادہ سے زیادہ ۱۸۷۰ء تک انتقال کر چکا ہوگا؟ مگر ہمارے پاس شہادتیں موجود ہیں کہ کلو ۱۸۷۰ء کے کافی عرصہ بعد تک زندہ رہا۔ چنانچہ ان وسوسوں کو ذہن میں رکھ کر میں نے پھر استفسار کیا۔ جناب مالک رام نے دیانت داری سے اس بات پر روشنی ڈالی [۱۴]۔

> ". . . آپ کے سوال کا جواب آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ جب اس سلسلے میں میری گفتگو مرحومہ بگا بیگم سے ہوئی ہے تو ان کے الفاظ تھے "کلو کی وفات اسی مکان میں ہوئی، ہم اس وقت نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں مرحوم کے مکان میں بیٹھے تھے۔ جہاں بگا بیگم اپنی بیوگی کے بعد سکونت پذیر ہو گئی تھیں اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوا۔ میں نے تفصیل دریافت نہیں کی کہ اسی مکان سے ان کی کیا مراد ہے۔

اس سے ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلو امراؤ بیگم کی وفات کے بعد
نیر ورخشاں کی ملازمت میں آ گیا تھا اور انھیں کے وہاں اس کی وفات
ہوئی، رہا یہ کہ تقریباً کون سے سال اس کا انتقال ہوا ہوگا۔ اس کے
بارے میں قیاس ناممکن ہے۔ یہ تک تو معلوم نہیں کہ غالب کی
وفات کے وقت اس کی عمر کیا تھی۔ اگر اس کا کچھ اندازہ ہوتا تو ممکن تھا
کہ کچھ قیاس آرائی کی جاسکتی۔"

محقق کا یہ فرض ہے کہ امر زیر تحقیق کے بارے میں جو کچھ بھی وہ جانتا ہو دیانت داری سے ظاہر کردے، اپنی طرف سے کوئی قیاسی اضافہ نہ کرے۔ یہی جناب مالک رام نے کیا۔ البتہ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مزید تحقیق سے کلو کے سال ولادت کی طرح اس کے سال وفات کا بھی کچھ سراغ مل گیا۔ مرحومہ بگا بیگم نے ملاقات کے دوران جو حمید احمد خاں نے ان سے جولائی ۱۹۳۸ء میں کی تھی، فرمایا تھا[15]۔

"کلو داروغہ کو مرے ہوئے پندرہ برس ہوگئے"۔...

گویا کلو کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہوا۔ اگر پندرہ سال کے بیان کو ایک ضعیف خاتون کا قیاسی بیان بھی مان لیا جاۓ تو بھی ۱۹۲۰ء کو سال وفات تسلیم کر لینا کچھ زیادہ بے جا نہ ہوگا۔ اسی طرح ۱۸۳۰ء کو سال ولادت مان کر یہ کہنا پڑے گا کہ کلو داروغہ نے سال دو سال ادھر ادھر ۹۰ برس کی لمبی عمر پائی وہ ۲۰ سال سے بھی کم عمر میں مرزا غالب کی ملازمت میں آیا، تقریباً ۲۰ سال ان کی ملازمت میں رہا اور ان کے انتقال کے بعد تقریباً ۵۰ سال زندہ رہا۔ بگا بیگم فرماتی ہیں[16]۔

"لوگ ان (کلو) کی زیارت کو بہت آتے تھے...... (وہ) پاؤں کی آہٹ
سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں ہیں بہوئیں ہیں یا بوڑھیاں۔"

خسرو مرزا لکھتے ہیں[17]۔

"(۱۸۹۵ء) کے بعد میں اپنے علی گڑھ کے دو استادوں کو ان کی
خواہش کے مطابق دہلی لایا اور دادا غالب مرحوم کے ملازم داروغہ کلو

سے جو ہماری محل سرا کے ڈیوڑھی باتوں میں شمار ہوتے تھے، ملاقات کرادی اور داروغہ کلو سے ان کی گفتگو ہوئی۔ ....داروغہ کلو نے یہ بھی بتایا کہ مرزا غالب دربار قیصری کے رکن بن گئے تھے اور ان کو ہفت پارچات کا خلعت معہ مالاے مروارید اور جیغہ مرصع عطا ہوا تھا۔ یہ گفتگو سن کر وہ ان کی ناخواندگی کی وجہ سے متحیر ہو کر عش عش کرنے لگے۔ یہ داروغہ وہ تھے جن کو بعد وفات دادا غالب ہماری محل سرا کی ڈیوڑھی پر ملازم رکھ لیا گیا تھا اور یہ ہمارے تمام ملازمین میں اس زمانہ کی تہذیب کے مطابق دادا کلو کے نام سے خطاب کیے جاتے تھے۔"

حمیدہ سلطان [۱۸] صاحبہ جن سے میں نے ۳۱/اکتوبر ۱۹۸۰ء کو علی منزل دہلی میں ملاقات کی تھی، فرماتی ہیں:

"کلو کا انتقال نانی اماں بگا بیگم صاحبہ کے قول کے مطابق محل سرا کی ڈیوڑھی میں ہوا۔ یہ محل سرا کا مکان نواب ضیاء الدین احمد خاں نے اپنی بیٹی بگا بیگم (نانی اماں) کے جہیز میں دیا تھا۔ نانی اماں فرماتی تھیں کہ کلو خاصی عمر کے آدمی تھے۔ شاید ۸۰، ۹۰ سال کی عمر کے۔ داروغہ جو تھے ڈیوڑھی میں پڑے رہتے تھے۔"

اب سید جالب دہلوی نے جو کچھ کلو سے سنا اور معتبر سمجھ کر درج کر دیا وہ بھی پڑھ لیجیے گا [۱۹]۔

"کلو نے ان (غالب) کی وفات کے بعد پھر کسی کی نوکری ہی نہیں کی اور ساری عمر ان کی یاد اور فاتحہ خوانی میں گزار دی [۲۰]۔ راقم الحروف نے کلو سے بارہا مرزا صاحب مرحوم کے حالات سنے ہیں مگر کبھی اس نے ٹھنڈا سانس لیے اور سخت حسرت ظاہر کیے بغیر ان کا ذکر شروع نہیں کیا۔ دیوان خانہ میں بیٹھنے والوں کی نسبت وہ کہا کرتا تھا کہ جناب مرزا صاحب بعض اوقات دنوں نیچے نہ اترتے تھے اور ان کی صورت

نہ دیکھتے تھے۔ مگر وہ غل غپاڑہ گویاان کی غذائے روح تھا، جس کے بغیر انھیں کل نہ پڑتی تھی۔ ان لوگوں سے اگر وہ کبھی کام لیتے تھے تو یہ لیتے تھے کہ جب کوئی نیا مضمون باندھتے تھے اور اس کی مسرت کے کیف میں بے خود ہو جاتے تھے تو نیچے تشریف لے آتے تھے اور وہ شعر لوگوں کو سناتے تھے اور داد لے کر پھر اُلٹے پاؤں واپس چلے جاتے تھے۔ کبھی ایسا موقع ہو تا تھا کہ دیوان خانہ میں چند ناخواندہ شخص جمع ہیں جو شعر کا مطلب تو درکنار اس کی ترکیب لفظی کو بھی نہیں سمجھ سکتے تھے مگر مرزا صاحب موصوف پر شوق کا وہ غلبہ ہو تا تھا کہ انھیں کو سناتے تھے۔ کلو کا بیان ہے کہ کئی مرتبہ ایسا بھی دیکھا کہ دیوان خانے میں چڑیا بھی نہیں، لیکن مرزا صاحب آئے اور دروازے میں کھڑے ہو کر آپ نے فرمایا"لو بھئی! سنو! کیا مضمون ہاتھ آیا ہے۔"اور پھر آپ نے شعر پڑھااور ضروری تشریح کی اور مطمئن ہو کر پھر کو ٹھے چلے گئے۔ ملازم چوں کہ ان حالتوں سے واقف تھے اس لیے خاموش رہتے تھے اور بعض اوقات کسی معمولی آدمی کو چپکے سے دیوان خانہ میں بھیج دیتے تھے کہ مرزا صاحب کی تکلیف رائیگاں نہ جائے اور وہ آزردہ نہ ہوں، حالانکہ اُنھی مرزا نوشہ کی نازک دماغی کا یہ حال تھا کہ بعض موقعوں پر جناب نواب ضیاء الدین خاں مرحوم نیر ورخشاں اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مبرور اور نواب علاء الدین خاں علائی مغفور جیسے رؤسائے بلندپایہ منتیں کرتے کرتے تھک جاتے تھے اور وہ ایک مصرع تک زبان پر نہ لاتے تھے۔ اللہ اللہ سچ کہا ہے کہ شاعر اپنے رنگ میں بادشاہ سے بڑھ کر ہو تا ہے۔"

اب اس بیان سے، زیادہ سے زیادہ یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ ان پڑھ اور وفادار نوکروں میں مبالغہ آرائی کی عادت میں بھی اضافہ ہو تا رہتا ہے۔

حواشی

(۱) نادرات غالب۔ ص ۲۳۔ خط نمبر ۱۹
(۲) خطوط غالب۔از: مہر، ص ۳۹۳۔ خط نمبر ۵
(۳) آئینہ غالب۔ ص ۹
(۴) نادرات غالب۔ ص ۶۳۔ خط نمبر ۴۶
(۵) نادرات غالب۔ ص ۵۳۔ خط نمبر ۴۰
(۶) خطوط غالب۔از: مہر، ص ۲۹۷۔ خط نمبر ۳۵
(۷) ادبی دنیا سالنامہ ۱۹۴۰ء۔ ص ۲۴۶
(۸) یادگار غالب (معیاری ادب) ص ۸۲
(۹) پنج آہنگ قلمی مکتوبہ ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۰ء میں بھی یہ خط شامل ہے اور پہلے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۳۹ء کے ص ۲۰۹ پر بھی۔
(۱۰) یعنی اپنے یہاں بطور ملازم رکھ لیا تھا۔
(۱۱) آئینہ غالب۔ ص ۱۱ پر یہی روایت درج ہے۔ مگر وہاں ملازم کا نام کلو کے بجائے احمد بیگ ہے۔ لیکن مالک رام صاحب کی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ حمید احمد خاں صاحب ایک ہی بار بگّا بیگم صاحبہ کی ملاقات کو گئے۔ جب کہ مالک رام صاحب اکثر ان سے ملاقات کیا کرتے تھے بلکہ بعد میں اس بزرگ بیگم نے ان سے پردہ کرنا بھی ترک کر دیا تھا۔
(۱۲) پانچواں ایڈیشن مطبوعہ فروری ۱۹۷۶ء، ص ۲۰۵
(۱۳) خط بنام راقم مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۸۰ء
(۱۴) خط بنام راقم مورخہ ۲۰/اکتوبر ۱۹۸۰ء
(۱۵) آئینہ غالب۔ ص ۹

(۱۶) آئینہ غالب۔ ص ۹

(۱۷) اصبہار الغالب۔ ص ۵

(۱۸) بگا بیگم صاحبہ رشتے سے حمیدہ سلطان صاحبہ کی سگی نانی تھیں۔ بگا بیگم صاحبہ کے انتقال (۱۹۴۵ء) کے وقت حمیدہ سلطان صاحبہ کی عمر ۳۰ سال سے اوپر تھی۔ اس لیے میں نے بطور خاص ان سے چند سوالات کیے تھے۔

(۱۹) مکتوبات آزاد۔ بار دوم۔ دیباچہ (۱۹۰۷ء) ص ۱۰

(۲۰) یہ قطعاً غلط ہے۔ کلو کو نواب ضیاءالدین احمد خاں کے یہاں باقاعدہ ملازم رکھ لیا گیا تھا۔

مرزا عباس بیگ

آج تک "دعاالصباح" کے فارسی منظوم ترجمۂ غالب کی اشاعت اوّل کا صرف ایک ہی نسخہ معلوم ہے جو غالب کی زندگی میں نولکشور سے حسب الایمائے مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ شائع ہوا[۱]۔ غالب کے اس ترجمے سے متعلق تو کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں[۲]۔ مگر مرزا عباس بیگ کے حالات ابھی تک تحقیق نہیں ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے غلط فہمیاں راہ پا گئی تھیں۔ اس مقالے میں مرزا عباس بیگ سے متعلق بہت سا مواد جمع کر دیا گیا ہے۔

۱۷۵۲ء کے لگ بھگ مرزا غالب کے دادا قوقان بیگ کے ساتھ قبیلہ برلاس کے ایک امیر زادے مرزا جیون بیگ خاں جو حضرت سبز پوش کی اولاد میں تھے اپنے خاندان سمیت وارد ہندوستان ہوئے[۳]۔ ان کی تین اولادیں تھیں مرزا اکبر بیگ، مرزا افضل بیگ[۴] اور امیر النساء بیگم۔ مرزا غالب کی بڑی بہن چھوٹی خانم (شاید غالب کی والدہ کو بڑی خانم کہہ کر پکارا جاتا ہوگا) کی شادی انھیں مرزا جیون بیگ کے بڑے صاحبزادے مرزا اکبر بیگ سے ہوئی۔ ان کے بطن سے تین صاحبزادے مرزا عاشور بیگ، مرزا عباس بیگ، مرزا جواد علی بیگ عرف مرزا مغل بیگ اور ایک صاحبزادی امانی خانم پیدا ہوئیں۔ اس مضمون کا موضوع مرزا اکبر بیگ کے منجھلے صاحبزادے اور مرزا غالب کے منجھلے بھانجے مرزا عباس بیگ ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت کا علم نہیں مگر اندازہ ہے کہ مرزا عباس بیگ (جنھیں آیندہ سطور میں ہم

صرف مرزا کہہ کر پکاریں گے) ۱۸۱۲ء کے لگ بھگ دلّی میں پیدا ہوئے۔ وہ ۱۸۶۷ء میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اگر ریٹائرمنٹ کے وقت ان کی عمر پچپن سال مان لی جائے تو ان کی ولادت کا سال ۱۸۱۲ء قرار پائے گا۔

مرزا نہایت حسین اور سرخ و سفید تھے۔ سانچے میں ڈھلا ہوا جسم، دراز قد اور نہایت قوی الجثہ۔ گو عیاشی، رنگین مزاجی اور احباب پرستی کے سبب پڑھنے کا شوق کم تھا، تاہم ذہین تھے۔ جب انگریزی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا تو اس قدر پڑھ لی کہ تحریر و تقریر بخوبی سرانجام دے سکتے تھے۔ فارسی کی لیاقت معمولی تھی اور عربی سے نابلد تھے۔ رنگین مزاجی کے باوصف شعر گوئی تو ایک طرف شعر صحیح پڑھ بھی نہ سکتے تھے[۵]۔ صاحب "کارنامہ سروری" کے مطابق کچھ عرصے ماسٹر رام چندر کے بھی شاگرد رہے تھے۔ مگر یہ قرین قیاس نہیں کیوں کہ ماسٹر رام چندر ۲۸ فروری ۱۸۴۴ء کو دلّی کالج میں ریاضی کے مدرس مقرر ہوئے تھے اور اس وقت ان کی عمر تیئس سال (سال ولادت ۱۸۲۱ء۔ سال وفات ۱۱/اگست ۱۸۸۸ء) تھی جب کہ ہمارے قیاس کے مطابق مرزا تیس سال کے تھے۔ اس کے علاوہ سکھوں کی پہلی لڑائی (دسمبر ۱۸۴۵ء) کے دوران مرزا فیروز پور (پنجاب) کے کوتوال یا تحصیل دار تھے۔ اور کئی سال پہلے دلّی چھوڑ چکے تھے۔ جس کا حال آگے آئے گا۔ ممکن ہے کبھی پرائیوٹ ٹیوشن سے پڑھا ہو۔ الغرض انگریزی تحریر و تقریر کی لیاقت پیدا کر کے مرزا وسیع تر میدان کی تلاش میں رہنے لگے۔ اتفاق سے یہ موقع بھی انھیں جلد ہی مل گیا۔ ہوا یہ کہ جب ان کے حقیقی چچا مرزا افضل بیگ سفیر سلطنتِ مغلیہ وائسرائے سے ان امور کا تصفیہ کرانے میں ناکامیاب رہے جن کے لیے انھیں کلکتہ بھیجا گیا تھا تو انھوں نے مشہور رفارمر رام موہن رائے کو راجا کا خطاب دلا کر تصفیہ امور کے لیے انگلینڈ روانہ کر دیا (۱۸۳۰ء) اور خود کچھ عرصے بعد دلّی واپس آگئے۔ آتے ہوئے اپنے ساتھ ایک بنگالن "ماہ لقا" کو بھی لے آئے مگر بوڑھے ہو چکے تھے۔ زندگی نے مزید ساتھ نہ دیا اور انتقال کیا۔ یہ جواں سال بیوہ مرزا کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گئی۔ جس کا ان کے والد ماجد مرزا اکبر بیگ نے بہت برا مانا۔ مآل کار مرزا اس عورت کو لے کر پنجاب کی طرف نکل کھڑے ہوئے[۶] اور ایک راجا کے ہاں مصاحب خاص کی حیثیت سے نوکری کر لی۔ مگر یہ نوکری جلد ہی چھوڑ دی، کیوں کہ راجا کے

دل میں اس کے مصاحبوں نے کچھ بدگمانی پیدا کر دی تھی جو اگرچہ بعد میں غلط نکلی تاہم مرزا نے وہاں رہنا گوارا نہ کیا۔

وہاں سے سبکدوش ہو کر مرزا انگریزی عملداری میں ستلج کے اس پار لدھیانہ اور فیروزپور کے نواح میں پہنچے[7] جہاں ان کی انگریزی سے واقفیت خاندانی اور ذاتی وجاہت و تمکنت کام آئی اور سر ہنری لارنس نے متاثر ہو کر ان کو "کوتوال شہر" (شاید فیروزپور) مقرر کر دیا[8]۔ اس کے بعد کا حال ان کے بھتیجے آغا مرزا بیگ مصنف "کارنامہ سروری" سے سنیے[9]۔

"چچا (مرزا عباس بیگ مرحوم) بیان کرتے تھے کہ سر ہنری ایک وحشی مزاج مگر ادائے فرض منصبی میں از حد پابند قواعد اور اپنے ماتحت عمال کے رفتار کردار کا نگران تھا۔ ایک روز مرزا بازار میں ایک دکان دار سے کسی امر پر بر سر حساب تھے اور خدمت گار ان پر چھتری لگائے ہوئے تھے کہ سر ہنری ادھر سے بگھی پر نکلا...... اور کہاں دل نواب صاحب ہم تم پر چھتری لگائے گا۔ مرزا اکڑ کر آگے ہو لیے۔ سر ہنری نے ... ان کو کوٹھی پر حاضر ہونے کا حکم دیا ... کوٹھی پر بھی انھوں نے جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ ان کی دلیری اور صاف گوئی پر ہنری نے بجائے سزا تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔

ایک روز ... سر ہنری ان کو اپنے ساتھ لے گئے راستے میں ایک جھیل پایاب واقع تھی۔ سر ہنری اس وقت ..... افہام و تفہیم کر رہا تھا۔ مرزا نے ... اختلاف رائے کیا۔ بگھی بیچ جھیل میں پہنچ گئی تھی۔ سر ہنری نے غصہ میں آ کر ان کو گاڑی سے اتر جانے کا حکم دیا۔ یہ بھی پانی میں کود پڑے۔ ان کی یہ حرکت بھی مفید ثابت ہوئی اور فیروزپور کے تحصیل دار مقرر ہو گئے۔ یہاں بھی انھوں نے سکھوں کے مقابلے میں بڑی خیر خواہیاں کیں اور جنرل ایبٹ[10] زخمی کو میدان جنگ سے اٹھا لائے۔"

اس کے بعد سر ہنری لارنس کے دل میں مرزا کی عزت یہاں تک بڑھ گئی کہ ہندوستانی افسروں کے علاوہ انگریز افسر بھی حسد کرنے لگے۔ ادھر دلی میں مرزا کے اہل خاندان بھی ان سے سخت ناراض تھے۔ سوا ان کے بھائی مرزا مغل بیگ اور بہن امانی خانم (غالب کا چھوٹا بھانجہ اور بھانجی) کے کوئی ان سے بات تک کرنا گوارا نہ کرتا تھا[11]۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کل خاندانی جاگیریں "بوجہ عدم ثبوت و اتلاف اسناد سرکار میں ضبط ہو گئی تھیں اور مرزا عباس بیگ نے اس سلسلے میں قطعاً تغافل برتا تھا"[12]۔

مرزا اپنے عہد اور رسوخ کے نشے میں کچھ ایسے چور ہوئے کہ شرافت کی تمام حدیں پھاند گئے۔ رشوت خوری کا یہ عالم تھا کہ (بقول خود) آٹھ آنے بھی قبول کر لیتے تھے۔ اسی طرح بہت سی دولت تو اکٹھا کر لی مگر بے شمار دشمن بھی پیدا کر لیے۔

انھیں ایام میں جب کہ مرزا مغل بیگ اور امانی خانم ان سے ملنے فیروز پور آئے ہوئے تھے۔ ایک ہمسایہ ایک چھوکری کو لایا اور کہا کہ آپ اس چھوکری کو رکھ لیں میں دو تین روز کے لیے باہر جاتا ہوں اور آکر اپنی چھوکری کو لے جاؤں گا۔ مرزا خود کچہری میں تھے۔ مرزا مغل بیگ سمجھے یہ مرزا کا کوئی بے تکلف دوست ہے انھوں نے چھوکری کو اندر زنانے میں بھجوا دیا۔ وہ شخص تو چلا گیا مگر سازش کے مطابق پولس آن پہنچی اور چھوکری کو برآمد کر کے لے گئی۔ ڈپٹی کمشنر موقع کا منتظر تھا۔ اس نے فوراً مرزا پر بردہ فروشی کا مقدمہ کھڑا کر کے انھیں معطل کر دیا۔ اس مقدمے نے اتنا طول کھینچا کہ مرزا کی تمام پونجی صرف ہو گئی۔ حتیٰ کہ وارنٹ گرفتاری جاری ہو گیا[13]۔ جیمز ایبٹ اس وقت (۱۸۴۷ء) انگریزوں کے پولیٹیکل ایڈوائزر کے طور پر ملتان کے علاقے میں متعین تھا۔ مرزا بھیس بدل کر اونٹ پر سوار ہو کر چھپتے چھپاتے رات کو ایبٹ کے پاس پہنچے اور کل ماجرا بیان کیا۔ میجر ایبٹ ان کو ساتھ لے کر ڈاک گاڑی سے لاہور پہنچا اور سر ہنری لارنس[14] ریذیڈنٹ پنجاب سے ملا جو خود بھی مرزا کا بڑا مداح اور خیر خواہ تھا۔ چنانچہ وارنٹ کی منسوخی کا حکم جاری ہوا اور اس نے مرزا کو وہیں ٹمپل[15] صاحب کے محکمہ بندوبست میں خدمت عطا کر دی۔

پنجاب کے انگریزی ایڈمنسٹریشن میں اس وقت دو بھائی ہنری لارنس اور جان لارنس

ممتاز ترین شخصیتیں تھیں۔ جان لارنس تلوار کے زور سے حکومت کرنا چاہتے تھے اور ہنری لارنس عوام کی رائے سے۔ دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ استعفیٰ دے دیا تاکہ لارڈ ڈلہوزی ان دونوں میں سے جس کا چاہے پنجاب میں تقرر کردے۔ ظاہر ہے ڈلہوزی ایسا جابر جان لارنس ہی کو پسند کرتا۔ اس طرح سر ہنری لارنس کو پنجاب چھوڑنا پڑا اور وہ وہاں سے اودھ آ گیا۔ مرزا بھی سر ہنری کے ساتھ ہی چلے آئے اور بدستور تحصیل داری کی خدمات انجام دیتے رہے۔ چنانچہ کارنامہ سروری (ص ۵۳) سے اطلاع ملتی ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء یعنی "ایام غدر میں ملاپور کے تحصیل دار تھے۔" جب "باغی" سپاہیوں نے اس تحصیل پر حملہ کیا تو انھوں نے بڑی بہادری سے خزانے کو اوٹرام[16] کے پاس روانہ کر دیا اور خود پاپیادہ بھیس بدل کر جنگل جنگل چھپتے ہوئے بلگرام پہنچ گئے۔ اہل بلگرام نے انھیں اپنے ہاں پناہ دی[17]۔ تاہم یہاں رہ کر بھی مرزا نے انگریزوں سے باقاعدہ خط و کتابت جاری رکھی اور "باغیوں" کی حرکات و سکنات سے ان کو برابر مطلع کرتے رہے۔ یہاں سے انھیں فرخ آباد بھیجا گیا۔ معلوم ہوتا ہے یہ واقعہ "غدر" فرو ہونے کے بعد کا ہے اور "غدر" کے دوران انگریزوں سے وفاداری کے صلے میں فرخ آباد میں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر ان کا تقرر ہوا تھا۔ پھر جلد ہی خیر خواہی سرکار میں لارڈ کیننگ نے علاقہ بڑاگاؤں کی جاگیر انھیں عطا کی اور چھ سو روپیہ ماہوار پر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر کر کے سیتاپور منتقل کر دیا[18]۔

اس کے بعد یعنی ملازمت سے ریٹائرمنٹ (۱۸۶۷ء) تک کے حالات بڑی حد تک پردۂ خفا میں تاہم مرزا غالب کے خطوط اور دوسرے ماخذوں سے جو کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے وہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

فتنہ و فساد فرو ہو جانے کے بعد جب صوبہ اودھ کی ضلع بندی ہوئی تو بلگرام کو ہردوئی ضلع میں شامل کر لیا گیا۔ چنانچہ چند سال سیتاپور میں رہنے کے بعد مرزا کا تبادلہ (۱۸۶۲ء کے آخر میں یا شروع ۱۸۶۳ء میں) ہردوئی ہو گیا۔ غالب قدر بلگرامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"برخوردار مرزا عباس کی بدلی کی خبر میں نے پہلے ہی سنی ہے مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے۔ اب دریافت ہوا کہ تمھارے ہمسائے

میں آئے ہیں۔اب ان سے ملیے خدا ان کو مروت کی توفیق دے۔"

قدر کے نام دوسرے خطوں سے بہ آسانی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط آخر ۱۸۶۲ءیا شروع ۱۸۶۳ء کا لکھا ہوا ہے اور قیاس چاہتا ہے کہ بلگرام ہی کو بھیجا گیا تھا۔ یہاں مرزا نے قدر کو صاحب ضلع سے سفارش کرکے ہردوئی اسکول میں مدرس فارسی کرادیا۔ قدر بلگرامی پر مرزا کی مہربانیاں آئندہ بھی جاری رہیں۔اس کی شروعات غالب کے ایک گم شدہ سفارشی خط سے ہوئی جس کے ثبوت میں غالب کا خط بنام قدر (محررہ ۱۸۶۰ء) پیش کیا جاسکتا ہے:

"برخوردار مرزا عباس کو دوبارہ تحریر کی حاجت نہیں اگر وہ سعادت مند ہیں تو وہی ایک خط کافی ہے..."(خطوط غالب۔از: مہر،ص ۵۴۹)

قدر بلگرامی کے نام غالب کا خط "محررہ صبح یکشنبہ ۳ رمضان۔ ۲۲ فروری سال حال (۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۳ء)اہم ہے۔لکھا ہے:

"....مرزا عباس میری حقیقی بہن کا بیٹا ہے تو پھر میں مرزا کی اولاد کا نانا کیوں کر بنا؟ مرزا کی بی بی میری بہو ہے بیٹی نہیں تم نے جو لکھا ہے کہ میرے نواسے کی شادی ہے کیا سمجھ کے لکھا؟ میں مرزا کی اولاد کا نانا کیوں کر بنا! بھانجے کی اولاد پوتا پوتی ہے نہ نواسا نواسی... مرزا کی استدعا سے قطع نظر میرا دل بھی تو پتھر لوہے کا نہیں جو اپنے بچوں کو دیکھنے کو نہ چاہے۔ایک بہن اس کی مجموع اولاد وہاں، میرا تو وہ خانہ باغ ہے۔"......

پہلے "ایک بہن اس کی مجموع اولاد وہاں" کی تشریح سن لیجیے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ چھوٹی خانم کے تین لڑکے تھے۔ یعنی مرزا عباس بیگ کے علاوہ ان کے بڑے بھائی مرزا عاشور بیگ جو اپنے لڑکے احمد بیگ کے ساتھ "غدر" میں شہید کردیے گئے تھے اور چھوٹے بھائی مرزا جواد علی بیگ عرف مرزا مغل بیگ جو ۱۸۵۷ء کی الور کی شورش میں مع اہل وعیال نکالے گئے تھے۔ یہ تمام افراد نیز مرزا عاشور بیگ مرحوم کی بیوی [19] اور بچے مرزا عباس بیگ کے پاس ہی رہنے لگے تھے [20]۔ شاید صاحبزادی (مرزا کی بہن) امانی بیگم کی اولاد میں سے بھی چند لوگ وہاں موجود تھے۔ غالب نے اسی لیے کہا ہے کہ چھوٹی خانم کی "مجموع اولاد" وہاں رہ

رہی ہے۔

اب خط کے اس جملے "میرے نواسے کی شادی ہے" پر غور کیجیے۔ ہمیں محمد رفیع الدین بیگ وحشی ابن عاشور بیگ صناعی، برادر زادہ مرزا عباس بیگ کے دیوان "غزلیات وحشی" میں دیے ہوئے شجرۂ نسب (ص ۷) سے خبر ملتی ہے کہ مرزا کی اولاد میں صرف ایک لڑکی تھی۔ (گویا ہوالڑ کا ۱۸۶۳ء میں محض چار سال کا تھا۔ لہٰذا اس کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اولاد سے متعلق تفصیلات آگے آئیں گی) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خط کے اس جملے "میرے نواسے [21] کی شادی" ہے کو میری نواسی کی شادی سے پڑھنا چاہیے۔ اتفاق سے خطوط غالب کے تمام مرتبین نے یہ غلطی دہرائی ہے۔ حالانکہ ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء کا خط صاف بیٹی کی شادی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"...... یہ (مرزا عباس بیگ) اپنے والدین کے خاندان کا فخر ہے اور چوں کہ اس کی ماں کا اور میرا لہو اور گوشت اور ہڈی اور قوم اور ذات ایک ہے پس وہ فخر میری طرف بھی عائد ہوتا ہے۔ وہ مرزا عباس بیگ اپنے جی میں کہتا ہوگا کہ ماموں میری بیٹی کے بیاہ میں نہ آیا اور صرف زر سے جی چرایا......"

چند سال ہردوئی میں رہنے کے بعد مرزا ۱۸۶۷ء میں یا اس سے پہلے اسی عہدے پر یعنی اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے طور پر لکھنؤ میں تبدیل ہوگئے۔ ۱۸۶۷ء میں ان کا لکھنؤ میں ہونا ثابت ہے۔ اس سلسلے کا ایک خط غالب بنام قدر بلگرامی دیکھیے:

"تم قدر اور نور چشم مرزا عباس قدرداں۔ خاطر جمع رکھو۔ نوکری تمہاری ہو جائے گی۔ صاحب کی اور راجا کی تعریف کے قصیدے واقعی گل دستے ہیں مگر مرزا کی مدح کے قصیدے کو گل دستہ نہ کہو یہ تو ایک باغ ہے سرسبز و شاداب جس میں گلبن ہزار در ہزار ہو اور درخت بے شمار زمین سراسر سبزہ زار۔ بہت حوض بہت نہریں، مٹی نظر نہیں آتی۔ سبزہ یا لہریں، فقیر غالب تمہارا خیر خواہ اور تمہارے

ممدوح کا دعاگو [۲۲] ہے۔

صاحب سے مراد ولیم ہینڈ فورڈ ڈائرکٹر تعلیمات اودھ اور راجا سے مہاراجا مان سنگھ قائم جنگ ہے۔ یہ قصیدے کلیاتِ قدر میں موجود ہیں۔ جو قصیدہ مرزا کی شان میں ہے اس کا نام گُلِ عباس ہے۔ کل اشعار ۱۵۱ ہیں۔ سر قصیدہ یہ عبارت ہے "در مدح ڈپٹی [۲۳] مرزا عباس بیگ خان بہادر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ ....." قصیدہ کا آخری شعر یہ ہے:

"گلِ عباس" رکھا نام ہم نے اس قصیدے کا
کریں تا میرزا عباس سن سن کر زرافشانی

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا ۱۲۸۴ھ یعنی ۱۸۶۷ء میں لکھنؤ میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ مگر یہی سال ان کی ملازمت کا بھی آخری سال معلوم ہوتا ہے۔ وہ ۱۸۶۷ء کے آخر میں پنشن پر ریٹائر ہو گئے۔ "کلیاتِ قدر" (ص ۱۶ ترجمہ المصنف) میں یہ جملہ دیکھیے:

"......(مرزا عباس بیگ) صاحب پنشن پا کر لکھنؤ میں کالج مزبور (کیننگ کالج) کے ممبر ہو گئے تھے......"

اور کیننگ کالج کا قیام نومبر ۱۸۶۷ء میں عمل میں آیا تھا۔ پڑھائی شروع ہی سے جاری تھی مگر عمارت کے مکمل ہونے میں گیارہ سال لگے اور وہ ۱۸۷۸ء میں تیار ہوئی۔ تاریخی قطعہ جس کے ہر مصرع سے تاریخ (۱۸۷۸ء) نکلتی ہے قدر بلگرامی نے کہا۔ یہ کلیاتِ قدر (ص ۲۳۹) میں موجود ہے۔ کل اشعار پندرہ ہیں۔ ان میں سے چند اشعار جو تاریخی شواہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نقل کیے جاتے ہیں:

گورنر جنرل عالی روش لارنس [۲۴] صاحب نے

بجہد وجہد کل اٹھارہ سو سڑسٹھ نومبر میں
قوی ڈالی بنائے خیر خود کیننگ کالج میں
مگر سدِ سکندر جس طرح وقتِ سکندر میں
عمارت بن چلی وہ بنتے بنتے بن گیا کالج
زمانِ عدل و رزیر وحشت سرجارج کوپر میں

سخی دل سر مہاراجہ بہادر مصنفِ لائق
ہے زیبائے شجاعت دگبیجے سنگھ اسم دفتر میں
ہمایوں بہر ڈپٹی میرزا عباس خان صاحب
ہیں سرکاری یہ ممبر بحر دانش جملہ ممبر میں
☆☆☆
مکمل نظم وہ لکھی ہے قدرؔ بلگرای نے
ہیں سالِ عیسوی مقصود ہر اک مصرعہ تر میں
☆☆☆

سرورالدولہ آغا مرزا بیگ مصنف "کارنامہ سروری" نے مئی ۱۸۷۲ء بہ عمر ۲۴ سال اپنے عم بزرگوار مرزا عباس بیگ کی اجازت سے لکھنؤ کو خیر باد کہا[۲۵]۔ اور عازم حیدر آباد ہوا۔ اب اس کے چند بیان متعلقہ کالج ملاحظہ کیجیے اور یہ حقیقت سامنے رکھیے کہ ہر بیان مئی ۱۸۷۲ء کے پہلے کا ہے:

(الف) "اسی زمانے میں جب کہ کیننگ کالج قائم ہوا جنرل ۲۶ بیرو چیف کمشنر اودھ نے مرزا عباس بیگ اور بابو دکھنار نجن مکرجی کو اپنے ہم رائے کر کے قیصر باغ میں تعلقہ داران و امرائے اودھ کی تعلیم کے واسطے ایک خاص تعلیم خانہ قائم کیا جس کا نام وارڈانسٹی ٹیوشن رکھا گیا اور تعلیم خانہ کیننگ کالج کی ایک شاخ مقرر کیا گیا..... (اس میں) مع راقم و محمود بیگ و خداداد بیگ، رفیع الدین بیگ ہم کوئی ۱۷، ۱۸ طلبا تھے۔ بابو انند لال رائے ہمارے گورنر اور دکھنار نجن اور عم مرحوم (مرزا عباس بیگ) وزیٹر یعنی نگران کار نامزد ہوئے... تعطیلات میں سب طلباء اپنے اپنے علاقوں پر چلے جاتے تھے ہم چار چوں کہ مقیم لکھنؤ تھے . ہر روز شام کو چچا صاحب مرحوم (مرزا عباس بیگ) کے ساتھ کھانا کھا کر فوراً واپس جاتے تھے۔ دن کا کھانا (مرزا عباس بیگ کے) گھر سے آجاتا تھا۔"

(کارنامہ سروری ص ۲۳-۲۴)

(ب) لکھنؤ میں جب ان (مرزا عباس بیگ) کا قیام ہوا تو جنرل بیرو چیف کمشنر یعنی امیر ملک اودھ اور مہاراجہ مان سنگھ قائم جنگ صدر الصدور تعلقہ داران اودھ تھے۔ ان تینوں کی رائے سے کیننگ کالج اور...... وارڈ انسٹی ٹیوشن قائم ہوا..... (اور) مجلس تعلقہ داران اودھ قائم کی گئی جس کے صدر...... مہاراجہ مان سنگھ .... قرار پائے اور بابو دکھنا رنجن معتمد یعنی سکریٹری نامزد ہوئے۔ جب مرزا (عباس بیگ) نے پنشن لیا تو بعد میں دکھنا رنجن بہ خود سکریٹری بنائے گئے...... کالج قائم ہوتے وقت تعلقہ داران کا ایک جلسہ شوریٰ منعقد ہوا۔ جس کے صدر خود کمشنر اودھ اور نائب الصدر مہاراجہ اور معتمد مرزا (عباس بیگ[۲۷]) تھے۔

(کارنامہ سروری۔ ص ۵۴)

مندرجہ بالا سے یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ مرزا ۱۸۶۷ء سے پہلے لکھنؤ میں بطور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر متعین ہو چکے تھے اور کہ کیننگ کالج کی تجویز ۱۸۶۶ء یا ۱۸۶۷ء میں مکمل ہوئی جس میں شروع ہی سے مرزا، چیف کمشنر آف اودھ کے صلاح کار رہے۔ ۱۸۶۷ء ہی میں جب کالج قائم ہوا تو مرزا ریٹائر ہو چکے تھے اور اس کے پہلے جلسہ شوریٰ میں انھوں نے معتمد یعنی سکریٹری کے فرائض انجام دیے۔ جب کہ بیرو اس کے صدر اور مہاراجہ مان سنگھ قائم جنگ نائب صدر تھے۔ مندرجہ بالا سے یہ بھی ثابت ہے کہ قیام کالج (۱۸۶۷ء) سے کالج کی عمارت کی تعمیر کے اختتام (۱۸۷۸ء) تک مرزا کالج کی مجلس شوریٰ کے خاص رکن رہے۔ خیال یہی ہے کہ وہ آخر تک کالج سے وابستہ رہے ہوں گے۔

مرزا نے تقریباً ۶۷ سال کی عمر پاکر یکشنبہ جمادی الاول ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) کو لکھنؤ میں انتقال کیا [۲۸]۔ قدر بلگرامی کے کلیات قدر (ص ۳۵۲-۳۵۳) میں ایک قطعہ اور ایک رباعی ملتی ہے۔

تاریخ وفات ڈپٹی مرزا عباس بیگ خان بہادر دہلوی

ماہ جمادی الاولیٰ یکشنبہ و دہم — شب آفتاب کے بربیں پے فسردہ وائے
یعنی بمرد ڈپٹی عباس بیگ خاں — ہے ہے گلے بباغ امارت فسردہ وائے
برخواند قدر مویہ تاریخ ہجریش — عباس بیگ خان بہادر بمرد وائے

۱۲۹۶ھ

ولہ رباعی

گور عباس جاں خرا شد اے دل — ازہم جگر قدر بپا شد اے دل
خاموش کتابہ در مسیحی سال است — شاید کہ پلنگ ہفتہ باشد اے دل

"ہے ہے گلے بباغ امارت فسردہ" اور "شاید کہ پلنگ خفتہ باشد" سے جو تصویر پیدا ہوتی ہے اسے غلام حسنین قدر بلگرامی نے مدتوں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اگرچہ مرزا نے اس وقت کے امیروں کی طرح انگریزی حکام کی دل و جان سے مدد کی اور اطاعت گزار رہے تاہم ان میں ایک فطری خودداری و تمکنت بھی تھی جو ہمیشہ امارت اور رعب داب میں اضافے کا باعث بنی رہی۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں مرزا کی اپنی اولاد صرف ایک لڑکی تھی۔ جس کی شادی ۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی۔ جس سے متعلق ہم غالب کے دو خطوط بھی پیش کر چکے ہیں۔ شادی کس کے ساتھ ہوئی[۲۹] اور صاحبزادی کا سال ولادت کیا ہے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۰ء تک یا کوئی اور سال کچھ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اولاد نرینہ چوں کہ نہیں تھی اس لیے مرزا نے اپنے بھائی مغل بیگ کے ایک بیٹے مرزا فیاض بیگ کو گود لے لیا تھا۔ یہ داستان فیاض بیگ کے بھائی آغا مرزا بیگ مصنف "کارنامہ سروری" (ص ۱۸) سے سنیے جو فیاض بیگ سے گیارہ سال بڑا تھا:

> "چچا صاحب (مرزا عباس بیگ) مرحوم نے کہ اولاد نرینہ نہ رکھتے تھے ایک روز والد (مغل بیگ) مرحوم سے کہا کہ اب جو بچہ تمہارے یہاں پیدا ہو مجھ کو اس طرح دے دو کہ پھر اس سے کچھ تعلق نہ

رکھو ..... الغرض فیاض بیگ مرحوم پیدا ہوا اور چچا نے اس کو اپنی
فرزندی میں لے لیا۔"

فیاض بیگ ۱۸۵۹ء میں سیتاپور میں پیدا ہوئے [۳۰]۔ قدر بلگرامی نے تاریخ کہی۔ قطعہ چار شعر کا ہے۔ پہلا اور آخری شعر دیے جاتے ہیں:

خان ذی رتبہ و ذی حوصلہ مرزا عباس
پسرے نام خدا یافتہ عالی نسبے
بشگفاں غنچۂ تاریخ ولادت اے قدر
برومید ایں گل عباس زنخل عجبے
۱۲۷۶ھ

مادہ تاریخ نہایت برمحل ہے اور فیاض بیگ کے متبنّٰی ہونے کی طرف صاف اشارہ کرتا ہے۔

فیاض بیگ کی شادی ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ "تاریخ کدخدائی..... بطریق سہرا" قدر نے کہی جس کا ہر مصرع تاریخی ہے۔ قدر اس وقت کیننگ کالج میں ملازم تھے۔ کل اشعار نو ہیں صرف چار شعر دیے جاتے ہیں:

حلقہ شوق ہے یہ ہاتھ میں کنگنا دلخواہ
دامن حسن ہے فیاض کا سر پہ سہرا
جس نے دیکھا نہ ہو خورشید زمین کرنوں میں
دیکھے ان کا رخ نایاب ہٹاکر سہرا
تاج ہے روشنی الفت مرزا عباس
دامن ظل علمدار دلاور سہرا
ایک اک مصرع تاریخی مسیحی سے ملا
کہیں اس زور کا اے قدر سخنور سہرا
(کلیات قدر۔ ص ۳۴۸)

۱۸۵۷ء کی لڑائی کے بعد تعلق داران اودھ مسلمان اور ہندو دونوں کو خاص قانون کے

تحت مستثنٰی لینے کا اختیار مل گیا تھا۔ اسی بناء پر مرزا نے فیاض بیگ کو ۱۸۵۹ء میں گود لیا تھا اور از روے قواعد علاقہ بڑا گاؤں کی جاگیر کا وارث اسی کو بنایا تھا[۳۱]۔ فیاض بیگ نے عین جوانی میں ۷ مئی ۱۸۸۲ء کو انتقال کیا۔

مرزا ابھی پنجاب ہی میں تھے کہ انھوں نے اپنے اہل خاندان کے برخلاف اپنا مذہب تبدیل کر لیا یعنی وہ سنی سے شیعہ ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ ایک شب انھوں نے خواب دیکھا کہ ایک چھینکے میں ایک سر بریدہ رکھا ہوا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ تم اہل بیت سے محبت رکھو[۳۲]۔ برسوں بعد جب وہ پنجاب سے لکھنؤ آئے تو مشہور مرثیہ گو دبیرؔ لکھنوی ابھی زندہ تھے۔ انھیں دیکھ کر مرزا کو فوراً یاد آ گیا کہ وہ سر بریدہ جو خواب میں انھوں نے چھینکے میں رکھا دیکھا تھا ہم شکل دبیر تھا۔ اس کے بعد تمام عمر مرزا کٹر شیعہ رہے جس کا ثبوت کئی ماخذوں سے بہ آسانی مل جاتا ہے[۳۳]۔

مرزا ملازمت کے آخری ایام میں اور ریٹائرمنٹ کے بعد لکھنؤ ہی میں مستقل طور پر رہے اور وہیں آخری سانس لی۔ ہمیں ان کی جائے قیام سے متعلق دو اندراج ملتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۱ء، ص ۲۵۱ کے حاشیے میں لکھا ہے۔

> "یہ جلسہ ڈپٹی عباس بیگ صاحب کی اس کوٹھی میں ہوا تھا۔ جو قیصر باغ کے دروازے کے بالکل سامنے تھی اور اب کھد کھدا کر سڑک میں آ گئی ہے۔"

ادبی خطوط غالب میں مرزا محمد عسکری نے بھی تقریباً یہی لکھا ہے۔ "..... ان (ڈپٹی عباس بیگ) کی کوٹھی روشن الدولہ کی کوٹھی کے سامنے واقع تھی جو ابھی حال ہی میں کھدی ہے....."

قدرؔ بلگرامی کے اس قصیدے میں بھی جو انھوں نے ۱۸۶۷ء میں "گل عباس" کے نام سے لکھا تھا مرزا کی کوٹھی، ان کی فیاضی اور ان کے مذہب سے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ (کلیات قدر۔ ص ۵۵-۵۶)

کہیں نہریں کہیں گلشن پھر آگے ہے وہی کوٹھی
جو ہے جنات بجری تحتہاالانہار کی ثانی

رفیع الدرجہ رفعت پست جس سے ہمت حاتم
وسیع الدرجہ وسعت تنگ جس سے عزم سلطانی
سجی اتنی دلہن بھی منہ چھپائے جس سے گھونگھٹ میں
ہزاروں کرسیاں میزیں چلو قصہ ہے طولانی
امیر وقت ڈپٹی میرزا عباس خاں صاحب
کہ جس کی ذات ہے عزت دہ نوابی و خانی
سخی ایسا کبھی رہنے نہ پائے گانٹھ میں پیسا
جو کچھ پائے بہالے جائے اس کا جوش فیضانی
غم شبیر کے نشے میں یہ مدہوش رہتا ہے
نہ آئے ہوش میں آنکھیں نہ چھڑکیں جب تک پانی

☆☆☆

مرزا کے حسن و جمال، رنگین مزاجی اور رعب داب کے قصے تو سن چکے مگر ان کی کوئی تصویر ہمارے علم میں نہیں۔ ایک تصویر مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاندان میں ۱۹۳۱ء تک موجود تھی۔ اب معلوم نہیں ہے کہ نہیں۔ یہ تصویر ہاتھی دانت کی بنی ہوئی تھی اور خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان نے بنائی تھی۔ (رسالہ اردو ۱۹۳۱ء، ص ۲۴۹)

اب ہم ذیل میں ان تمام باتوں کو اکٹھا کر رہے ہیں جو ہمارے خیال میں مرزا کے کیرکٹر اور ان کے مقام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

اقتباسات از "اردو" اپریل ۱۹۳۱ء

خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان مرحوم و مغفور۔ از مرزا فرحت اللہ بیگ۔

ا۔ ... (لکھنؤ) کے چند رئیسوں نے خواجہ امان کے بھائی ڈپٹی عباس بیگ مرحوم سے کہا کہ ہمیں کسی طرح خواجہ صاحب کا ستار سنوا دو اور اگر ممکن ہو تو یہاں کے استادوں سے ان کا مقابلہ بھی کرادو۔ مرزا عباس بیگ نے ... ترکیب یہ کی کہ ایک جلسہ کر کے لکھنؤ کے روسا

شہر کو مدعو کیا اور اس میں وہاں کے چار پانچ مشہور استادان ستار کو بھی بلوایا۔ خواجہ امان مرحوم وہیں تھے...... استادان فن نے کمالات دکھانے شروع کیے...... خواجہ صاحب...... کہنے لگے میاں عباس لاؤ ہم بھی بجائیں...... مگر...... ہم اکیلے نہیں بجائیں گے...... غرض ستار لایا گیا۔ انھوں نے ایک چیز چھیڑی دوسروں نے ساتھ دیا...... ساجد بیگ (سرور الدولہ آغا مرزا بیگ کے بھائی) مرحوم کہا کرتے تھے کہ چچا خواجہ امان کا ستار...... سن کر...... جلسہ کی یہ کیفیت تھی کہ گویا چینی کی مورتیں دم بخود بیٹھی ہیں۔ (ص ۲۵۰)

۲۔ ڈپٹی عباس بیگ مرحوم کے پاس (خواجہ امان) اکثر لکھنؤ جایا کرتے تھے۔ لکھنؤ کی مشہور طوائف مشتری جان کا تو یہ حال تھا کہ ادھر اس نے سنا کہ خواجہ صاحب آئے ہوئے ہیں اور ادھر شام کو وہ بن بلائے آموجود ہوئی۔ یہ ستار لے کر بیٹھے اور اس نے نیچے سروں میں گانا شروع کیا کوئی دو گھنٹے تک یہی صحبت گرم رہی۔ انھوں نے ستار رکھا اور وہ سلام کر کے رخصت ہوئی۔ جب تک یہ لکھنؤ میں رہتے ممکن نہیں تھا کہ شام کو مشتری کو بھی پر نہ آجاتی ہو۔ (ص ۲۵۳)

اقتباسات از ''کارنامہ سروری''

۳۔ اس ہی زمانے (تقریباً ۱۸۷۰ء) میں سید حسن بلگرامی (نواب عماد الملک) کالج میں اور بابو کیشب چندر و بابو کمار مکرجی ڈپٹی درجوں کے لیے مقرر ہوئے۔ چوں کہ اس وقت تک مسلمانوں میں بی اے پاس بہت کم تھے۔ سید صاحب کی قدر میرے چچا مرزا عباس بیگ بہت کرتے تھے...... اس وجہ سے بھی کہ ان کے چچا زمانہ غدر سے قبل نواب ضیاء الدین خاں، نواب امین الدین خاں و شمس الدین خاں...... کی تعلیم کے لیے ایک ہی جگہ ملازم تھے...... (ص ۷۷)

۴۔ ..... پنجاب (تقریباً ۱۸۴۵ء) میں ایک فقیر نے ان (مرزا عباس بیگ) کو ایک نقش دست غیب کا بخشا اور ان کا قول تھا کہ کل دنیاوی کامیابی ان کو اس نقش کی بدولت حاصل ہوئی تا زمانۂ وفات یہ نقش وبعد نماز ظہر ین لکھا کرتے تھے ۳۴ ۔ (ص ۵۲)

۵۔ "کالج (کیننگ) قائم ہوتے وقت (۱۸۶۷ء) ایک جلسہ شوریٰ منعقد ہوا جس کے صدر ..... کمشنر اودھ اور نائب صدر مہاراجہ مان سنگھ (قائم جنگ) اور معتمد مرزا تھے۔ اس جلسے میں ..... اس امر پر بھی بحث ہوئی کہ مدرسہ قرار پائے یا کالج اور ابتدا ہیڈ ماسٹر مقرر ہو یا پرنسپل ..... مرزا نے رائے پرنسپل کی دی۔ مہاراجہ نے طنز کیا کہ ہاں مرزا صاحب آپ کے بچے (یعنی بھتیجے وغیرہ) اس میں پڑھتے ہیں اس واسطے آپ نے یہ رائے دی ہے۔ مرزا کہ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے یکایک جامے سے باہر ہو گئے اور جواب دیا کہ "خود تو ایک دھوتی بند، سوربا (شوربہ) سکر (شکر) بولنے والا، تو معاملات تعلیم و تربیت کو کیا سمجھے" مہاراجہ اس مرتبہ کے آدمی تھے کہ تمام تعلقہ داران اودھ کیا ہندو کیا مسلمان مہاراجہ کی پوجا کرتے تھے۔ یہ الفاظ سن کر دنگ رہ گئے جنرل بیرو نے انگریزی میں بہ تشدد کہا مرزا کیپ یور ٹیمپر (Keep Your Temper) اپنے مزاج کو قابو میں رکھو۔

رضا: یہ قصہ طولانی ہے مختصر یہ کہ بعد میں مہاراجہ مرزا کے گھر پہنچے۔ مرزا بہت نادم ہوئے اور کہا "برائے خدا اب آپ مجھ کو زیادہ خود میری آنکھوں میں حقیر نہ کیجیے اور میری گستاخی معاف کیجیے اور مجھ کو اپنا ایک ادنیٰ خدمت گار سمجھیے۔" (ص ۴۵، ۵۵، ۵۶)

۶۔ راجہ امیر حسن خان (محمود آباد) ..... کے والد راجہ نواب علی خان (کا) غدر میں ..... انتقال ہو گیا ..... اس پر شبہہ بغاوت کا قائم ہو گیا تھا۔ رانی صاحبہ محمود آباد امیر حسن خان کمسن یتیم کو اپنے ساتھ

(۱۸۵۸ء۔ ۱۸۵۹ء) سیتاپور لے آئیں اور مرزا کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر فرمایا کہ مرزا صاحب اس یتیم کو آپ فرزندی میں لیجیے..... مرزا نے راجہ کو آغوش میں لے لیا..... مرزا نے بکمال کوشش ان کا علاقہ چھڑا لیا اور راجہ سرکاری وارڈ ہو گئے..... سیٹھ جسے دیال تعلقہ دار بسواں نے حال میں مجھ سے کہا کہ مرزا نے جو سلوک رانی صاحبہ (محمود آباد) کے ساتھ کیا اس کے کاغذات ان کے پاس اب تک موجود ہیں۔ (ص ۵۶)

۷۔ ..... (مرزا عباس بیگ نے) سید حسین بلگرامی کو دوسرے روز مع اپنے خط کے ان (میر تراب علی سالار جنگ مختار الملک) کی خدمت میں بھیج دیا۔ نواب کو ان کے خیالات پسند آئے اور تین سو روپیہ حالی مشاہرہ پر اپنے پاس ملازم رکھنا چاہا مگر چوں کہ تین سو روپے یعنی ڈیڑھ سو کالج سے اور ڈیڑھ سو چچا (مرزا عباس بیگ) مرحوم لکھنؤ کانمبر ۳۵ سے دیا کرتے تھے۔ سید صاحب نے انکار کر دیا..... (ص ۶۳)

۸۔ نواب وزارت پناہ (سالار جنگ) نے میرے عم بزرگوار مرزا عباس بیگ جاگیر دار بڑا گاؤں ملک اودھ جو منجانب گورنمنٹ اس دربار (دلّی دربار ۱۸۷۶ء۔ ۱۸۷۷ء) میں مدعو ہوئے تھے کی ملاقات و قدم بوسی حضور پرنور (آصف جاہ سادس اس وقت دس گیارہ برس کی عمر تھی) سے کرائی۔ مگر جو خلعت و جواہر نواب وزارت پناہ نے ان کے واسطے تجویز کیا۔ اس کو بلا اجازت سرکار (انگریزی) قبول کرنا ناممکن تھا اور اس کے واسطے عم بزرگوار (مرزا عباس بیگ) نے کوئی طویل کارروائی مناسب نہ سمجھی۔

۱۸۷۶ء۔ ۱۸۷۷ء کا دلّی دربار، ۱۸۷۷ء میں اپنے مستقلی مرزا فیاض بیگ کی شادی ۱۸۷۸ء کا جلسہ ختم تعمیر کیننگ کالج شاید آخری بڑی تقریبات ہیں۔ جن میں مرزا پوری شان سے شامل تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا۔

استدراک

۱۔ غالب نے ایک خط (بنام قدر بلگرامی) میں مرزا عباس بیگ کے نام کے ساتھ "خان بہادر" لکھا ہے۔

"سید صاحب۔ تم نے جو خط میں برخوردار کامگار مرزا عباس بیگ "خان بہادر" کی رعایت اور عنایت کا شکریہ ادا کیا ہے......"

قدر بلگرامی نے بھی مرزا عباس بیگ کے ساتھ "خان بہادر" کا اضافہ روا رکھا ہے۔ (دیکھیے کلیاتِ قدر بلگرامی ص ۵۴ اور ۳۴۸) ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ خان بہادر کا خطاب سرکار انگریزی کا عطا کردہ ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ لوگوں نے انھیں ایسا کہنا شروع کر دیا تھا۔ چوں کہ خان نام کا جز ہے اس لیے "بہادر" کے اضافے کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ انھیں "خان بہادر" کا سرکاری خطاب ملا ہو۔ "بہادر" محض تعظیمی لفظ ہے۔

۲۔ مرزا عباس بیگ کی صاحبزادی کا نام وجیہہ النسا بیگم تھا۔ شادی مرزا کے بھتیجے یعنی مرزا عاشور بیگ کے بیٹے محمود بیگ سے سیتاپور میں ہوئی مگر کوئی اولاد نہ تھی۔ (غالب نام آورم۔ ص ۱۹۶)

۳۔ مرزا کی جائے سکونت اور دیگر تعمیرات سے متعلق نادم سیتاپوری لکھتے ہیں کہ انگریزوں کے تسلط (۱۸۵۷ء) کے بعد مرزا نے سیتاپور کو مستقلاً اپنا وطن بنالیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن (چھوٹی لائن) کے قریب مہاراجہ کپور تھلہ کی کوٹھی خرید کر اسی میں رہ بس گئے تھے۔

(غالب نام آورم۔ ص ۲۰۴)

اس کے علاوہ ایک کوٹھی قیصر باغ لکھنؤ میں بھی تھی لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد جب قیصر باغ کا شمالی حصہ منہدم کیا گیا تو کوٹھی بھی کھد گئی۔ بعد ازاں انھوں نے "روشن الدولہ" کے جانب جنوب اس جگہ پر جہاں اب کوتوالی قیصر باغ ہے ایک شان دار کوٹھی اور امام باڑہ

تعمیر کرایا۔ کوٹھی کا بڑا حصہ تو کوتوالی قیصر باغ میں آگیا۔ لیکن شکستہ حالت میں امام باڑہ اب بھی موجود ہے۔ جہاں ہر سال محرم میں تعزیہ داری ہوتی ہے۔ (غالب نام آورم۔ ص ۲۰۵)

۴۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں نواب بر جیس قدر کا ساتھ دینے کے جرم میں انگریزوں نے لونے سنگھ راجہ متولی کا بہت بڑا علاقہ ضبط کر لیا تھا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے خیر خواہوں میں تقسیم کر دیا تھا جس میں سے علاقہ بڑا گاؤں مرزا کو عنایت ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلقہ بہت بڑا تو نہیں ہو سکتا تھا مگر مرزا نے اپنے تدبر اور ذہانت سے اسے ایسا بنادیا کہ وہ باقاعدہ تعلقہ داروں کی فہرست میں شامل کیا گیا۔

(غالب نام آورم۔ ص ۲۰۴)

۵۔ مرزا کے انتقال کے بعد یہ تعلقہ (مرزا کی تحریر کے مطابق جو انھوں نے اپنی زندگی ہی میں لکھ دی تھی) مرزا کے متبنّٰی مرزا فیاض بیگ کی ملک قرار پایا بعد ازاں مرزا فیض حسین بیگ بن مرزا فیاض بیگ اور پھر مرزا وقار علی بیگ بن مرزا فیض حسین بیگ کی طرف منتقل ہوا جو بقول نادم سیتاپوری (غالب نام آورم۔ ص ۲۰۶، مطبوعہ ۱۹۶۱ء) "بقید حیات ہیں اور وقار منزل سول لائن سیتاپور میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

۶۔ سرور الدولہ آغا مرزا بیگ مصنف "کارنامہ سروری" نے جون ۱۹۳۳ء میں بہ مقام علی گڑھ انتقال کیا۔ لاش دہلی لائی گئی۔ "قبر" مہندیوں میں یعنی ایوان غالب کے قریب ہی قبرستان حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ میں ہے۔

۷۔ سید افضل حسین ثابت (حیات دبیر۔ ص ۳۸۹، ۳۹۰) نے بھی مرزا عباس بیگ کا تذکرہ کیا ہے حاشیے میں لکھا ہے "یہ حالات کچھ میں اپنے نانا مرحوم سے کچھ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ سے سن کر لکھتا ہوں۔

میں خود بھی ڈپٹی عباس بیگ کی خدمت میں اپنے نانا مرحوم کے ساتھ بارہا گیا ہوں اور محرم کی مجلسوں میں جو ۸ بجے سے ۱۲ بجے رات تک ہوتی تھی اپنے نانا کی پیش خوانی میں کبھی کبھی سلام بھی میں نے پڑھا ہے ....'' ثابت کے مزید بیانات سے جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں۔

(الف) مرزا بعد غدر ۱۸۵۷ء اودھ میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو کر آئے اور لکھنؤ میں رہے۔

(ب) مرزا دبیر مغفور کے معتقد خاص تھے۔

(ج)[۳۶] مرزا شعر کہتے تھے غالباً اپنے ماموں مرزا غالب کے شاگرد تھے مگر جیسا کہتے تھے اس سے بہتر شعر کے حسن و قبیح کو سمجھتے تھے۔

(د) اکثر دبیر مرحوم کے روبرو مرزا غالب کے اشعار پڑھا کرتے تھے اور دبیر حسب مذکورہ داد دیتے تھے۔

(ہ) مرزا کے نام غالب جو خطوط لکھتے تھے وہ محفوظ نہیں رہ سکے ان میں ''مرزا دبیر کو سلام اور ایک نہ ایک پھڑکتا ہوا فقرہ بطور پیام وہ (غالب) ضرور تحریر فرماتے تھے۔''

(و) مرزا کے ''فرزند مرزا فیاض بیگ مرحوم حاتم تخلص (جو منصف بھی ہو گئے تھے) جناب استاذی حضرت اوج مدظلہ کے شاگرد تھے جن کے بعض سلام دفتر ماتم میں چھپے ہیں۔''

(ز) ۵ فروری ۱۸۷۸ء (ص ۸) کے اودھ پنچ میں ''رسید زر'' کے تحت ایک فہرست ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اخبار کی معاونت کی ان میں ''جناب ڈپٹی مرزا عباس بیگ صاحب دام اقبالہ'' کے نام کا اندراج بھی ہے۔

حواشی

(۱) یہ کتاب راقم کے ذخیرۂ غالبیات میں موجود ہے۔
(۲) دیکھیے راقم کا مقدمہ "دعائے صباح" غالب کا فارسی منظوم ترجمہ۔ مطبوعہ بمبئی۔ دسمبر ۱۹۷۷ء۔
(۳) اردو، اپریل ۱۹۳۱ء، ص ۲۳۶ "خواجہ امان مرحوم" از: فرحت اللہ بیگ۔
(۴) اکبر شاہ ثانی کی طرف سے انگریزی دربار میں سفیر ہو کر کلکتہ میں مقیم تھے۔ تفصیلات آگے علاحدہ مضمون میں آئیں گی۔
(۵) "کارنامہ سروری" ص ۴۸، از: نواب آغا مرزا بیگ سرور جنگ، سرور الدولہ، سرورالملک بہادر۔ یہ مرزا عباس بیگ کے چھوٹے بھائی مرزا مغل بیگ کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ پرورش مرزا عباس بیگ کے سائے میں پائی۔ بعد میں حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں بہت عروج پایا۔ میر محبوب علی خاں، آصف جاہ سادس کے اتالیق مقرر ہو کر مندرجہ بالا خطابات سے سرفراز ہوئے۔ "کارنامہ سروری" (مطبوعہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۳ء) ان کی خودنوشت سوانح ہیں جسے ان کے صاحبزادے نواب ذوالقدر جنگ بہادر بیرسٹر ایٹ لا نے ترتیب دیا تھا۔ مولوی عبدالحق ۸ مئی ۱۹۵۶ء کے خط میں مولوی نصیرالدین ہاشمی کو لکھتے ہیں "..... آپ کا کہنا صحیح ہے کہ "کارنامہ سروری" میں بہت سی باتیں غلط ہیں۔ شاید آپ کو اس کا علم نہیں کہ اس کتاب کے مسودے میں سے بعض حصے خارج کر دیے گئے تھے وہ ناقابل طبع سمجھے گئے غلط ہونے کے علاوہ ناشائستہ بھی تھے (مکتوبات عبدالحق، مرتبہ جلیل قدوائی ص ۳۵۲)۔ ہم نے جو مواد بھی "کارنامہ سروری" سے لیا ہے اسے دوسرے ماخذوں سے مقابلہ کر کے منتخب کیا ہے تاکہ حتی الوسع صحیح تصویر پیش کی جاسکے (اس ضمن میں "خلافت اندلس" مصنفہ نواب ذوالقدر جنگ کا باب سوانح

مصنف ص ۱۱تا۸۱،از: عنایت اللہ بھی ہمارے پیش نظر رہا ہے۔)
(۶) فی الحال یہ کہنا ممکن نہیں کہ مرزا وتی سے کب نکلے۔
(۷) "کارنامہ سروری" میں لاہور لکھا ہے اور کہا ہے کہ وہاں اس وقت سر ہنری لارنس "حاکم کل پنجاب" تھا مگر یہ درست نہیں کیوں کہ سر ہنری لارنس ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کو سکھوں کی پہلی لڑائی (مدکی فیروز شاہ سبراؤں) کے نتیجے کے طور پر لاہور دربار کا ریذیڈنٹ مقرر ہوا تھا جب کہ مرزا لڑائی کے دوران فیروز پور کے تحصیل دار تھے۔ ہنری لارنس یقیناً اکتوبر ۱۸۴۳ء میں ستلج کے اس پار ان علاقوں میں موجود تھا۔

(I) Sunset of the Sikhs.

(II) The History and Culture of Indian People. Vol.IX

(۸) یہ غالباً مولوی سید رجب علی (جو بعد میں ارسطو جاہ کے خطاب سے مشہور ہوئے) کی سعی و سفارش سے ہوا۔ دیکھیے مکتوب غالب نمبرے بنام جواہر سنگھ جوہر مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۸۴۸ء۔ باغ دودر (تحقیق نامہ) مرتبہ وزیر الحسن عابدی۔ ص ۲۴
(۹) کارنامہ سروری۔ ص ۵۰۔۵۱
(۱۰) میجر جیمز ایبٹ James Abbot یہ وہی ایبٹ ہے جس نے انگریزوں کی چال کے مطابق سکھوں کی دوسری لڑائی (۴۹۔۱۹۴۸ء) کرانے میں نہایت مکاری اور چابک دستی کا مظاہرہ کیا تھا اور اس طرح انگریز بالآخر پنجاب پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔
(۱۱) کارنامہ سروری، ص ۵۱
(۱۲) یہ ۱۸۵۷ء کی بات ہو گی، جب کہ اس وقت ہم ۱۸۴۷ء کے قریب کی بات کر رہے ہیں۔ "کارنامہ سروری" میں واقعات کے تقدم و تاخر کی طرف سے بہت بے پروائی برتی گئی ہے۔ اصل خفگی کا باعث تو مرزا کا اپنی جوان بنگالن چچی کو بھگا لے جانا تھا۔
(۱۳) کارنامہ سروری، ص ۵۲
(۱۴) سر ہنری لارنس ۴ جولائی ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ ریذیڈنسی کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا۔ اس کا بھائی جان لارنس ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۹ء گورنر جنرل اور وائسرائے ہند مقرر رہا۔ ریٹائر ہونے پر لارڈ بنا دیا گیا۔

(۱۵) ٹمپل Sir Richard Temple آصف جاہ پنجم کے زمانے میں حیدر آباد میں ریذیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ۱۸۷۶ء میں بنگال کا لیفٹیننٹ گورنر تھا۔ پھر بمبئی کا گورنر رہا۔ انڈیا کا فنانس منسٹر بھی رہا۔ اس نے تبت سے سری لنکا اور آسام سے قندھار تک سیاحت کی تھی اور تقریباً ہر سرکاری محکمے میں کام کیا تھا۔ India in 1880 Sir Richard Temple- Page V ۔۱۹۰۱ء میں انگلینڈ میں انتقال کیا۔ مرزا عباس بیگ سے کمال محبت تھی۔ (کارنامہ سروری۔ ص ۵۴)

(۱۶) اوٹرام Outram ریذیڈنٹ اودھ جو الحاق اودھ کے کاغذات لے کر ۴ فروری ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ کے پاس گیا تھا۔

(۱۷) غالب دسمبر ۱۸۵۸ء یا جنوری ۱۸۵۹ء کو چودھری عبدالغفور سرور کی معرفت صاحب عالم کو لکھتے ہیں! "ہاں حضرت سچ ہے میر امین حسن خاں میرے دوست ہیں اور مرزا عباس بیگ میرا بھانجا۔ فتنہ و فساد کے زمانے میں بلگرام میں رہا اور اب وہ فرخ آباد میں ڈپٹی کلکٹر ہے ۔۔۔" (خطوط غالب۔ از: مہر، ص ۴۷۲)
اس خط سے بعض محققین نے یہ سمجھ لیا کہ مرزا عباس بیگ ۱۸۵۷ء میں بلگرام میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ حالانکہ اس وقت تک وہ صرف تحصیل دار تھے۔ بلگرام میں ان کی حیثیت محض ایک پناہ گزیں کی تھی۔ مزید ثبوت کے لیے دیکھیے۔ "کلیات قدر" (۱۸۹۱ء، ص ۳۱ اور ادبی خطوط غالب (۱۹۴۰ء) ص ۳۱۴)۔

(۱۸) کارنامہ سروری۔ ص ۱۷ ۔ ۱۸

(۱۹) حکیم نواب رکن الدین وزیر وقت کی صاحبزادی اور نواب ضیاء الدولہ کی بہن۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد ضیاء الدولہ کی املاک ضبط ہو گئی تھی۔ یہ اپنے وقت کا بہت بڑا امیر تھا بامید استمداد مرزا عباس بیگ ہی کے ہاں رہ رہا تھا بلکہ چند سال یہیں مقیم رہا۔ (کارنامہ سروری۔ ص ۲۲)

(۲۰) و قتاً فوقتاً آتے رہتے تھے۔ (کارنامہ سروری۔ ص ۲)

(۲۱) نواسا (یہاں مراد پوتا ہے) بھی ٹھیک ہو سکتا ہے کیوں کہ مرزا عباس بیگ کی بیٹی کی شادی بھی مرزا عباس بیگ کے بھائی کے بیٹے ہی سے ہوئی تھی۔ مگر یہاں نواسی ہی

درست ہے کیوں کہ مرزا عباس بیگ کی ذات زیر بحث ہے۔

(۲۲) خطوط غالب، از: مہر۔ کے دونوں ایڈیشنوں میں ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۵ء چھپ گیا ہے۔ ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء ہونا چاہیے۔ خطوط غالب مہیش پرشاد میں اسی طرح ہے۔

(۲۳) مرزا عباس بیگ کو عرف عام میں ڈپٹی ہی کہا جاتا تھا۔

(۲۴) سر جان لارنس، گورنر جنرل اور وائسرائے (۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۹ء)

(۲۵) کارنامہ سروری، ص ۸۰

(۲۶) کیپٹن بیرو Barrow ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں سلون (اودھ) کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ چیف کمشنر آف اودھ بعد میں ہوا۔ The History and Culture of Indian People- Vol- IX

(۲۷) اس جلسے میں یہ طے کرتا تھا کہ ادارے کا نام مدرسہ رکھا جائے یا کالج اور ابتدا ہیڈ ماسٹر ہو یا پرنسپل (کارنامہ سروری، ص ۵۴)۔

(۲۸) انتقال کے بعد یہ حسب وصیت اپنے ہی تعمیر کردہ امام باڑہ لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔ (اردو ادب، شمارہ ۳، ۱۹۸۳ء۔ از: صفدر آہ مرحوم، ص ۹۶، مضمون "غالب اور سیتاپور")۔

(۲۹) دیکھو اسد راک

(۳۰) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا اس وقت سیتاپور میں متعین تھے۔

(۳۱) کارنامہ سروری ص ۷۱۔ جناب مشفق خواجہ نے اپنے خط مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۷۹ء میں راقم کو اطلاع دی کہ فیاض بیگ کا انتقال ۱۸ جمادی الآخر ۱۲۹۹ھ مطابق ۷ مئی ۱۸۸۲ء کو ہوا تھا۔

(۳۲) کارنامہ سروری، ص ۵۱

(۳۳) کارنامہ سروری، ص ۱۲۰، اسی صفحہ پر صاحب "کارنامہ سروری" نے مرزا غالب کے مذہب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

"۔۔ (نواب صاحب) نے فرمایا کہ آپ کے خاندان میں مرزا عباس بیگ کے علاوہ

مرزا غالب بھی تو شیعہ تھے۔ میں نے عرض کیا کہ نیم شیعہ تھے۔ حب اہل بیت تھے مگر مذہب اختیار نہیں کیا تھا۔"

(۳۴) سرورالدولہ مصنف "کارنامہ سروری" کے صاحبزادے ذوالقدر جنگ نے حاشیے میں لکھا ہے کہ "یہ نقش بسم اللہ کا ہے اور والد نے مجھے بتایا ہے میں پابندی کے ساتھ لکھا کرتا ہوں۔"

(۳۵) یہ اخبار تعلقہ داران اودھ کے مفاد کے تحفظ کے لیے شائع ہوتا تھا۔

(۳۶) جہاں افضل حسین ثابت نے مرزا عباس بیگ کو شاعری میں مرزا غالب کا شاگرد اور شعر کے حسن و قبح سے بہ خوبی واقف بتایا ہے وہاں مرزا کے بھتیجے سرورالدولہ آغا مرزا بیگ کا بیان ہے کہ مرزا شعر گوئی تو ایک طرف شعر صحیح بھی نہ پڑھ سکتے تھے۔

نواب مرزا الٰہی بخش خاں معروفؔ

معروفؔ کا انتقال ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں ہوا۔ دیوان معروفؔ کے مقدمے میں بغیر کسی سند کے لکھا ہے کہ انتقال کے وقت "عمر اسّی سال سے متجاوز تھی[۱]" گویا کم از کم ۸۰ سال۔ اس طرح ولادت کا سال ۱۱۶۲ھ / ۴۹-۱۷۴۸ء ٹھہرے گا۔ مگر مصحفیؔ مولف تذکرۂ ہندی جس نے معروفؔ کو ۱۲۰۹ھ / ۹۵-۱۷۹۴ء میں لکھنؤ میں دیکھا تھا، اسے "جوان خوش اختلاط و وجیہہ" کہتا ہے۔ اس زمانے میں تو کیا، آج بھی کوئی کسی ۴۷ سالہ ادھیڑ عمر کے شخص کو جوان نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے ۸۰ سال کی عمر قابل قبول نہیں۔ اگر جوان سے مراد مضبوط، قوی وغیرہ بھی لی جائے تو بھی معروفؔ اس وقت ۲۵ / ۳۰ سال سے زیادہ کے نہ ہوں گے۔ گویا انتقال کے وقت عمر ساٹھ سال ہوگی۔ اس طرح سال ولادت زیادہ سے زیادہ اواخر ۱۷۶۶ء تسلیم کرلینا چاہیے۔ پھر جب بڑے بھائی احمد بخش کا سال ولادت ۱۷۶۵ء[۲] ہے تو معروفؔ کی ولادت اواخر ۱۷۶۶ء / ۱۱۸۰ھ سے پہلے ممکن نہیں۔

معروفؔ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں چلتا۔ چند تذکروں میں جوان کی زندگی میں لکھے گئے، یہ حال ملتا ہے۔

الف۔ ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء۔ تذکرہ ہندی از مصحفیؔ[۳]

"الٰہی بخش خاں، معروفؔ تخلص، پسر عارف خاں (جان) جوان خوش اختلاط و وجیہہ است۔ ورایں کہ فقیر تذکرہ باتمام رسانیدہ،

از شاہجہان آباد بہ لکھنؤ گزر افگندہ۔ بہ شاگردی میاں نصیر نازش دارد فکر شعر نیز بیرویہ ایشاں کہ تلاش است، می کند۔ دریک دو مشاعرۂ حالِ صاحبِ عالم شریکِ غزلِ طرحی نیز بود۔ بعد یک دو ماہ باز بہ شہر عود کرد۔ مطلع از دیاد ماندہ۔

کیا مُجھٹی اس کی تمامی کی وہ انگیا ہاتھ سے
ہاتھ ملتا ہوں، گئی سونے کی چڑیا ہاتھ سے"

ب۔۱۲۱۵ھ /ا۔ ۱۸۰۰ء۔ عمدہ منتخبہ[۴] از اعظم الدولہ سرورؔ

"معروفؔ تخلص، الٰہی بخش خاں، خلف رشید عارف خاں (جان) مرحوم، برادر شرف الدولہ قاسم خاں (جان) مغفور، از امرائے مغلیہ د عہد ذوالفقار الدولہ مرحوم، شخص بسیار خوش اختلاط د خوش فکر۔ در فن سپاہ گری بسیار ماہر۔ با مولف از قدیم تعارف دارد۔ از کلام اوست......"

:

ج۔۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء ۔ مجموعہ نغز[۵] از قدرت اللہ قاسمؔ

"معروفؔ[۶] تخلص الٰہی بخش خاں..... خلف.....عارف[خان (جان)

]برادر زادہ..... قاسم خاں (جان)...... کہ از امراء نامدار ایام دولت..... ذوالفقار الدولہ نجف خاں..... (بود وایں) الٰہی بخش خاں جوانے است خوش خلق دیکرد، محبتِ سیر، نیک خو، شیریں کلام.....یار باش، خوش معاش، فکرش درست و کلامش چست، طبع سلیم دارد...... کہ در ایں ایام..... ولش از دنیا سرو گردیدہ و بدل.... عقیدۂ کافی بہ حضرات چشتیہ.... خصوصا بجناب..... محبوبِ رب العالمین.... دارد.. و اکثر اوقات..... عمر گرامی بیاد (ربی) تا تعالےٰ ... می

گزارد..... پدر والا قدرش و والده..... و برادران ..... و دیگر کس و کوے..... دست بیعت بدست..... مولانا فخر الدین..... دارو و خودش..... ارادۂ بخدمت..... میر ضیاالدین کہ یکے از خلفائے..... فخر المرشدین است و در بلدہ جے نگر علم اسلام برافراشتہ..... دارد، نظر برایں سررشتہ دینی (بر) قاسمؔ.... خیلے مہربان است..... در بدر و شوق سخن سنجی از..... نصیرؔ استشارہ نمودہ و حالا بتائید ذہن رسائی خود دیوانے ممملو بیشتر انواع سخن تالیف (فرمودہ).... ."

گویا تذکروں سے معروفؔ کی ۲۸ سال کی عمر سے پہلے کا کچھ حال نہیں کھلتا۔ تذکرۂ ہندی بتاتا ہے کہ وہ "جوان خوش اختلاط وجیہہ" ہیں اور عارف جان کے بیٹے ہیں شاعری میں انھوں نے شاہ نصیرؔ سے اصلاح لی ہے جس پر انھیں ناز ہے اور نواب اعظم الدولہ سرورؔ (مولف عمدۂ منتخبہ) جو قدیم سے معروفؔ سے متعارف ہیں معروفؔ کی ۳۴ سال کی عمر تک صرف یہ اضافہ کرتے ہیں کہ معروفؔ کے والد عارف جان شرف الدولہ قاسم جان مغفور کے بھائی تھے اور ذوالفقار الدولہ (نجف خاں) مرحوم کے عہد کے مغلیہ امیروں میں سے تھے۔

تاہم ان دو تذکروں سے ایک بات صاف ہو جاتی ہے وہ یہ کہ معروفؔ نے ۳۴ سال کی عمر تک ترک دنیا نہیں کیا تھا۔ تذکرۂ ہندی کے مولف مصحفیؔ بتاتے ہیں کہ وہ تذکرہ ختم کر چکے تھے کہ معروفؔ دلّی سے لکھنؤ آئے اور ایک دو مشاعروں میں طرحی غزل لے کر شریک ہوئے۔ دو ایک ماہ کے بعد پھر لکھنؤ واپس آئے۔

سرورؔ مولف تذکرہ عمدۂ منتخبہ بتاتے ہیں کہ انھیں معروفؔ سے "قدیم" سے تعارف ہے۔ وہ بہت خوش فکر شخص ہیں اور فن سپاہ گری کے بڑے ماہر ہیں۔

مشاعرے کی طرحی غزل کا جو مطلع مصحفیؔ نے درج کیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت تک معروفؔ کا میلان قطعی وہی کنگھی چوٹی کے مضامین کی طرف تھا۔ نہ ہی یہ مطلع نہ مصحفیؔ اور سرورؔ کے بیانات کوئی اشارہ کرتے ہیں کہ معروفؔ ترک دنیا کی طرف مائل ہیں یا کر چکے ہیں۔

لیکن بحوالہ "مجموعہ نغز[۸]" ۴۰ سال کی عمر تک معروف جو ایک "خوش خلق، یکرو، محبت سیر، نیک خو، شیریں کلام۔ ۔ ۔ یار باش، خوش معاش...... " شخص تھے، اب دنیا سے اچاٹ ہو چکے ہیں اور دل سے حضرات چشتیہ (خصوصاً محبوب رب العالمین) یعنی صوفیائے کرام اور خاص کر آنحضرت ﷺ کے عقیدت مند ہو چکے ہیں اور اپنا بیشتر وقت خدا کی یاد میں گزارتے ہیں۔ ان کے والدین، بھائی اور دوسرے سگے سمبندھی تو مولانا فخر الدین سے بیعت ہیں مگر وہ خود مولانا فخر الدین کے ایک خلیفہ میر ضیاء الدین جھگری کی خدمت میں ارادت رکھتے ہیں۔

مجموعہ نغز میں ایک رباعی بھی درج ہے جو حضرت سلطان نظام الدین اولیا کی شان میں ہے ~

اس ماہ تمام کے تصدق جاؤں
محبوب کے نام کے تصدق جاؤں
معروف اگر پاؤں، تو سو جان سے آہ
سلطان نظام کے تصدق جاؤں

۲۸ سال کی عمر میں کہی ہوئی (تذکرۂ ہندی) غزل کے مطلع۔ کیا مُحیّٰ اس کی تمامی کی وہ انگیا ہاتھ سے۔ ہاتھ ملتا ہوں، گئی سونے کی چڑیا ہاتھ سے، کے بعد درج بالا رباعی میں جو فکری تبدیلی آئی ہے، وہ ظاہر ہے۔

معروف کی وفات (۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء) کے بعد متعدد تذکروں[۹] نے لکھا ہے ~

انھوں نے ترک دنیا کر لیا تھا، یہ اسی عہد یعنی ۱۲۱۵ تا ۱۲۲۱ھ ہی میں وقوع پذیر ہوا ہوگا۔ اس وقت معروف کی عمر ۴۳ سال اور ۴۰ سال کے مابین ہوگی۔ چنانچہ بزم سخن، طور کلیم اور سخن شعرا میں درج ہے کہ "آخر ایام میں تعلقات دنیا کو ترک کیا"[۱۰]۔

معروف کی چھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم کا نکاح غالب سے ۷ رجب ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۹/اگست ۱۸۱۰ء کو ہوا۔ اس وقت امراؤ بیگم کی عمر ۱۱ سال کی اور غالب کی (نودن) ۱۳ برس کی تھی۔ خود معروف ۴۴ سال کے تھے اور جب ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں ان کا انتقال ہوا

امراؤ بیگم کی عمر ۲ سال عیسوی اور غالب کی ۲۹ سال عیسوی تھی۔

یہ تو مختلف قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک معروف زندہ رہے، غالب اور امراؤ بیگم کی گزر بسر کے لیے وہ کچھ نہ کچھ بالائی یافت کا سامان مہیا کرتے رہے مگر یہ نہیں معلوم کہ خود غالب کا رویہ اپنے خسر یعنی معروف کے لیے کیا تھا۔ حالیؔ یادگارِ غالب میں ایک لطیفہ بیان کرتے ہیں:

> "مرزا اپنی شوخ طبع کے ہاتھ سے مجبور تھے اور کسی موقع پر خوش طبعی کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش خاں معروف، جن کے تقدس اور بزرگی کے سبب ان کے بڑے بھائی (نواب احمد بخش خاں) زانو سے ادب تہ کر کے ان کے سامنے بیٹھتے تھے اور جو مرزا (غالب) کے خسر ہونے کے سبب ان کے قبلہ و کعبہ تھے، ان کے آگے بھی مرزا اپنی شوخی سے باز نہ آتے تھے۔ وہ (معروف) لوگوں کو مرید بھی کیا کرتے تھے اور . ب بہت سے مرید ہو جاتے تھے تو ان کو اپنے سلسلے کے تمام مشائخ کا شجرہ لکھوا کر ایک ایک کاپی سب کو تقسیم کرتے تھے۔ انھوں نے مرزا (غالب) کو شجرہ دیا کہ اس کی نقل کر دو۔ آپ نے شجرے کی نقل اس طرح کی کہ ایک نام لکھ دیا، دوسرا حذف کر دیا، تیسرا پھر لکھ دیا، چوتھا پھر ساقط۔ غرضے کہ اسی طرح بہت سے حذف و اسقاط کر کے نقل اور اصل جا کر ان کے حوالے کی۔ وہ دیکھ کر بہت خفا ہوئے کہ یہ کیا غضب کیا۔ مرزا نے کہا "حضرت آپ اس کا کچھ خیال نہ فرمایئے۔ شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے۔ سو زینے کی ایک ایک سیڑھی اگر بیچ میں سے نکال دی جائے تو چنداں ہرج واقع نہیں ہوتا۔ آدمی ذرا اُچک اُچک کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔" وہ یہ سن کر بہت جزبز ہوئے اور وہ نقل پھاڑ ڈالی اور کسی اور شخص سے اس کی نقل کرالی۔۔۔"

اس لطیفے سے غالب کی شائستگی کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے

خسر کی کافی عزت نہیں کرتے تھے، ورنہ اگر معروف کی تقدیس کے پیش نظر ان کے بڑے بھائی احمد بخش خاں ان کے آگے منھ کھولنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے تو مرزا غالب کا ان سے شوخی کرنا کیا معنی؟

غالب کے خطوں میں معروف کا حوالہ کئی بار آیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ بیشتر بیانات سے معروف کی شاعری کے متعلق تعریفی پہلو ہی نکلتا ہے۔ علائی کے نام ایک خط مورخہ ۳ جولائی ۱۸۶۳ء میں لکھتے ہیں:

"مرگ اب ناگہانی کہاں رہی، اسباب و آثار سب فراہم ہیں۔ ہائے الٰہی بخش خاں مغفور کا کیا مصرع ہے ~
آہ جی جاوں، نکل جائے اگر جان[11] کہیں"

۷ ۲ جولائی ۱۸۶۲ء کے خط بنام علائی میں لکھتے ہیں:

"پچاس برس[12] کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین[13] نئی نکالی، میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے ~

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے شراب تو دے ....."

قدر بلگرامی کے نام ایک خط میں بول چال کے الفاظ اشعار میں لانے کو جائز قرار دیتے ہوئے مثال دیتے ہیں۔ (تقریباً ۱۸۵۸ء)

"الٰہی بخش خاں معروف لکھتے ہیں:

نگین دل سوا کھو دے تو گھر نیلام ہو جائے

جس طرح غالب، جب تک آگرہ میں اپنی والدہ کے پاس ننھیال میں رہے، رئیس زادوں کی عام روش پر پڑ کر لہو و لعب میں پھنسے رہے (جس کا اشارہ انھوں نے خود اپنی تحریروں میں کئی جگہ دیا ہے) اسی طرح سسرال (دہلی) کی امارت انھیں لے ڈوبی اور جب تک ان کے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروف زندہ رہے غالب نے اپنی گزر بسر کی فکر نہ کی۔

مگر یہ کچھ تعجب کی بات نہیں خود ان کے خسر معروفؔ کا حال بھی جوانی میں یہی رہا تھا۔ ان کی گزر بسر کی فکر بھی ان کے بڑے بھائی نواب احمد بخش خاں ہی کرتے تھے۔

حمید احمد خاں مرحوم [۱۴] لکھتے ہیں:

"امراؤ بیگم (زوجہ غالب) کے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کو شہزادوں کا ساعیش و آرام میسر تھا۔ جوانی میں مرزا الٰہی بخش خاں کی زندگی کا ڈھنگ ایسا تھا کہ وہ شہزادہ گل فام کے عرف سے مشہور تھے۔"

سعادت یار خاں رنگین ولادت ۱۱۷۰ھ (۵۷-۱۷۵۶ء) وفات ۱۲۵۱ھ / ۳۶-۱۸۳۵ء جو معروفؔ کے ہم عمر ہی نہ تھے بلکہ ایک لمبی مدت تک ان کے یارِ غار بھی رہے تھے، مزاج کے بھی بے حد رنگین تھے۔ وہ ایک خط لکھنؤ سے معروفؔ کو لکھتے ہیں۔ یہ "خط شش جہت رنگین" کے پانچویں حصے "مخمس رنگین" میں شامل ہے۔ اس خط میں اس نے معروفؔ سے اپنے ایک فرنگی عورت پر عاشق ہونے کا ذکر کیا ہے [۱۵]۔ یہ خط ظاہر کرتا ہے کہ ان کا تعلق معروفؔ سے کس قسم کا ہو گا۔

رنگین کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

دلی میں سلامت تھی طوائف مشہور
معروفؔ تھا اس پہ جان اور دل سے چور
یہ تو مرتا تھا اس پہ لیکن، رنگیں!
وہ کہتی تھی اس کو "چل بے چل، دور ہو دور"

اس رباعی میں شاعر، معروفؔ اور طوائف، تینوں کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ ایسی بات سرتاپا جھوٹ نہیں ہو سکتی۔

ا۔ آزاد نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "آبِ حیات" میں دعویٰ کیا ہے کہ:

(الف) اگرچہ شیخ ابراہیم ذوقؔ کو بڑی بڑی کاہشیں اٹھانی پڑیں، مگر ان (معروفؔ) کی غزل بنانے میں ذوقؔ آپ بن گئے (یہ قول ذوقؔ کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔)

(ب) معروفؔ کا مروجہ دیوان، ذوقؔ کا ہی اصلاح کیا ہوا ہے۔

آزاد کے اس دعوے پر بڑی لے دی ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے طاقت ور دلیل یہ دی گئی کہ معاصر تذکرے اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ کوئی تذکرہ نہیں کہتا کہ معروف نے شاہ نصیر کے علاوہ بھی کسی سے اصلاح لی ہے اور پھر یہ کہ معروف مشاق شاعر تھے اور ان کا ایک دیوان ۷-۱۸۰۶ء (مجموعہ نغز) تک مکمل ہو چکا تھا جب کہ ذوق اس وقت ۱۹۔ ۱۸ سال سے زیادہ کی عمر کے نہ تھے [16]۔ نواب سعید احمد خاں طالب دہلوی [17] نے آب حیات کی اشاعت پر آزاد کو لکھا:

"خواجہ معروف کے خاندانی تذکروں اور مستند کاغذوں میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور آج بھی دہلی میں ایسے حضرات موجود ہیں جو اس غلط الزام (کہ معروف ذوق سے مشورہ کرتے تھے) کی تردید کا مواد اپنے پاس رکھتے ہیں ....."

ادھر آزاد نے لکھا کہ:

"استاد (ذوق) کی صحبت میں ہفتے میں کئی دفعہ ان صحبتوں اور اصلاحوں کے ذکر ہو جاتے تھے اور (اصلاح شدہ) غزلوں کے اصل مسودے اب تک میرے پاس موجود ہیں "

نواب سعید احمد خاں طالب اس الزام کی تردید کا مواد مطلقاً فراہم نہ کر سکے مگر "آزاد کے کاغذات اور ذوق کی تحریروں کے مطالعے کے دوران" ایسا مواد جناب ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب کو مل گیا اور ایک عکس انھوں نے شائع بھی کر دیا [18]۔ اگر چہ یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خط ذوق ہی کا ہے تا ہم معروف کے کلام پر اصلاح موجود ہے۔

اس کے علاوہ ایک ایسی مطبوعہ شہادت بھی مل گئی [19] جو اس وقت معرض تحریر میں لائی گئی تھی جب غالب اور ذوق دونوں زندہ تھے۔ اس ضخیم کتاب "تاریخ جدولیہ" کو منشی خادم علی سندیلوی نے جو اس وقت آگرے میں تھے، ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۳ء میں مکمل کیا اور مطبع مدرسہ آگرہ سے ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء میں شائع کیا۔ اس کے ص ۱۴۳ پر لکھتے ہیں:

"الٰہی بخش خاں معروف (پسر) قاسم [20] جان دہلوی۔ قطع نظر شاعری

کے نقیر بھی تھے۔ محاورہ بندی میں اچھے۔ کچھ مشورت ذوق سے بھی تھی......"

جب یہ کتاب چھپی ہے غالب ۵۷ سال کے اور ذوق ۶۵ سال کے تھے۔

۱۸۷۲ء میں جب تذکرہ شمیم سخن تیار ہوا تو اس کے مولف نے تاریخ جدولیہ کی تائید کی اور لکھا:

"سات شاعروں کی نظر سے ان (معروفؔ) کا کلام گزرا تھا آخر میں حضرت خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ دہلوی سے اصلاح لینا شروع کی۔ دیوان معروفؔ جو رائج ہے اور تسبیح زمرد جس میں ۱۰۱ مطلع ہے اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ وہ استاد ذوق ہی کا اصلاحی ہے۔"

تاہم تاریخ جدولیہ ہی کی بات معتبر معلوم ہوتی ہے یعنی "(دوسرے استادیا اساتذہ کے علاوہ معروفؔ کو) کچھ مشورت ذوق سے بھی تھی۔" اس میں کبھی کبھار کی اصلاح اور کبھی کبھار اپنے اشعار کی عطاد ونوں شامل ہو سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کہنا مبالغہ ہے۔

آزاد نے آب حیات میں معروف کا ذوق سے اصلاح لینے ہی کا ذکر تفصیل سے نہیں کیا ہے اور بھی کئی واقعات بیان کیے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان سے معروفؔ کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں کچھ انشاپردازی اور رنگ آمیزی آزاد کی طرف سے ہو لیکن بیشتر بیانات کی اساس پختہ معلوم ہوتی ہے کیوں کہ یہ سب انھوں نے اپنے استاد ذوق سے بالتفصیل سنے تھے۔

آزاد معروفؔ کے انتقال کے چار سال[21] بعد پیدا ہوئے اور استاد ذوق کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۲۴ سال کی تھی۔

اب تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ یہ سب بیانات ذوق کی زبانی ہیں:

۱۔ فرماتے تھے کہ ایسا سخی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جو آتا تھا۔ امیر، فقیر، بچہ، بوڑھا اسے بغیر دیے نہ رہتے تھے اور دنیا بھی وہی کہ جو اس کے مناسب حال ہو۔ کوئی سوداگر نہ تھا کہ آئے اور خالی پھر جائے۔

انھیں اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ ہماری غزل ہمارے پاس بیٹھ کر بناتے جاؤ سناتے جاؤ۔ میں نے اس باب میں پہلو بچایا تھا مگر ان کی خوشی اسی میں دیکھی تو مجبور ہوا اور یہی خوب ہوا۔ ایک دن میں ان کی غزل بنا رہا تھا اس کا مقطع تھا۔

اک غزل پر درد سی معروف لکھ اس طرح میں
ذوق ہے دل کو نہایت درد کے اشعار سے
کون روتا ہے یہ لگ کر باغ کی دیوار سے
جانور گرنے لگے جاے ثمر اشجار سے

سوداگر آیا اور اپنی چیزیں دکھانے لگا۔ ان میں ایک اصفہانی تلوار بھی تھی۔ وہ پسند آئی۔ خم دم، آبداری اور جوہر دیکھ کر تعریف کی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔ ع۔ اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے میں نے اسی وقت دوسرا مصرع لگا کر داخل غزل کیا بہت خوش ہوئے۔

سر لگادیں ابروے خمدار کی قیمت میں آج
اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

خیر اور چیزوں کے ساتھ وہ تلوار بھی لے لی۔ میں حیران ہوا کہ یہ تو ان کے معاملات و حالات سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتی۔ اسے کیا کریں گے، خدا کی قدرت ۲۔ ۳ ہی دن کے بعد بڑے صاحب (فریزر صاحب ریذیڈنٹ دہلی) ایک اور صاحب کو اپنے ساتھ لے کر نواب احمد بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے۔ وہاں سے ان کے پاس آئے۔ بیٹھے۔ باتیں چیتیں ہوئیں۔ جو صاحب ساتھ تھے ان سے ملاقات کروائی۔ جب چلنے لگے تو انھوں نے وہی تلوار منگا کر صاحب ہمراہی کی کمر سے بندھوائی اور کہا۔

برگ سبز است تحفۂ درویش
چہ کند بے نوا ہمیں دارد

ان کے ساتھ میم صاحب بھی تھیں۔ ایک ارگن باجا نہایت عمدہ کسی رومی سوداگر سے لیا تھا وہ انھیں دیا۔

۲۔ ......استاد مرحوم فرماتے تھے کہ دالان میں ایک طرف جانماز بچھی رہتی تھی۔ جب میں رخصت ہوتا تو آٹھویں دسویں دن فرماتے۔ بھئی میاں ابراہیم! ذرا ہماری جانماز کے نیچے دیکھنا۔ پہلے دن تو میں دیکھ کر حیران ہوا کہ ایک پڑیا میں کچھ روپے دھرے تھے۔ آپ نے سامنے سے مسکرا کر فرمایا۔ ع۔ خدا دیوے تو بندہ کیوں نہ لیوے۔ اس میں لطیفہ یہ تھا کہ ہم کس قابل ہیں جو کچھ دیں۔ جس سے ہم مانگتے ہیں۔ یہ وہی تمھیں دیتا ہے۔

۳۔......ایک دفعہ استاد بیمار ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد گئے۔ ضعف تھا اور کچھ کچھ شکایتیں باقی تھیں۔ فرمایا کہ حقہ پیا کرو۔ عرض کی کہ بہت خوب۔ اب وہ حقہ پلوائیں۔ تو خالی حقہ کیا پلوائیں۔ ایک چاندی کی گڑگڑی۔ چلم اور چنبل، مغرق نیچر، مرصع مہنال تیار کروا کر سامنے رکھوا دیا۔

۴۔...... خلیفہ صاحب (میاں محمد اسمٰعیل) چھوٹے سے تھے۔ ایک دن استاد کے ساتھ چلے گئے۔ رخصت ہوئے تو ایک چھوٹا سا ٹانگن اصطبل سے منگایا۔ زین زریں کسا ہوا۔ اس پر سوار کر کے رخصت کیا کہ یہ بچہ ہے۔ کیا جانے گا کہ میں کس کے پاس گیا تھا۔

۵۔...... کسی کھانے کو جی چاہتا تو آپ نہ کھاتے۔ بہت سا پکواتے۔ اور کہتے کہ دل سیر ہو گیا۔ یہ ساری سخاوتیں اسی سعادت [۳۲] مند بھائی کی بدولت تھیں جو دن بھر سر انجام مہام میں جان کھپاتا تھا۔ راتوں سوچ میں گھلتا تھا اور خاندان کے نام کو زندہ کرتا تھا اور ان سے فقط دعا کی التجا رکھتا تھا۔

۶۔......ایک دن نواب احمد بخش خاں آئے۔ لیکن افسردہ اور برآشفتہ۔

الٰہی بخش خان مرحوم سمجھ جاتے تھے کہ کچھ نہ کچھ آج ہے، جو اس طرح آرہے ہیں۔ پوچھا۔ آج کچھ خفا ہو؟ کہا کہ نہیں حضرت، فیروزپور جھرکے جاتا ہوں۔ پوچھا کیوں؟ کہا کہ بڑے صاحب (صاحب ریذیڈنٹ) نے حکم دیا ہے کہ جس کو ملنا ہو بدھ کو ملاقات کرے۔ حضرت آپ جانتے ہیں مجھے ہفتہ میں دس دفعہ کام پڑتے ہیں۔ جب جی چاہا گیا۔ جو ضرورت ہوئی کہہ سن آیا۔ مجھ سے یہ پابندیاں نہیں اٹھتیں۔ میں یہاں رہتا ہی نہیں۔ فرمایا کہ تم سے کہا ہے؟ کہا کہ مجھ سے تو نہیں کہا۔ سنا ہے۔ بعض رُوسا گئے بھی تھے۔ ان سے ملاقات نہ کی۔ یہی کہلا بھیجا کہ بدھ کو ملیے۔ فرمایا کہ تمھارے واسطے نہیں۔ اوروں کے لیے ہوگا۔ احمد بخش خاں نے کہا کہ ہیں حضرت یہ اہل فرہنگ ہیں ان کا قانون عام ہوتا ہے۔ جو سب کے لیے ہے وہی میرے لیے ہوگا۔ فرمایا کہ بھلا تو جاؤ۔ تم ابھی جاؤ۔ دیکھو تو کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا۔ بہت خوب جاؤں گا۔ فرمایا کہ جاؤں گا نہیں۔ اٹھیے بس ابھی جایئے۔ نواب نے کہا کہ نہیں میں نے عرض کیا ضرور جاؤں گا۔ بگڑ کر بولے کہ عرض فرض نہیں بس شرط یہ ہے کہ اسی وقت جایئے اور سیدھے وہیں جایئے گا۔ احمد بخش خاں بھی انداز دیکھ کر خاموش ہوئے اور اٹھ کر چلے۔ انھوں نے پھر فرمایا کہ وہیں جانا اور مجھے پریشان تو کیا ہے ذرا پھرتے ہوئے ادھر ہی کو آنا۔ استاد کہتے تھے کہ وہ تو گئے مگر ان کو دیکھتا ہوں کہ چپ اور چہرہ پر اضطراب۔ کوئی وہی گھڑی ہوئی تھی۔ ابھی میں بیٹھا غزل بنا رہا ہوں کہ دیکھتا ہوں۔ نواب سامنے سے چلے آتے ہیں۔ خوش خوش۔ لبوں پر تبسم۔ آکر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ انھوں نے دیکھتے ہی کہا کیوں صاحب؟ نواب بولے گیا تھا وہ اطلاع ہوتے ہی خود نکل آئے اور پوچھا، ہیں نواب! اس وقت خلاف عادت؟ میں نے کہا بھئی میں نے

سنا تم نے حکم دیا ہے کہ جو ہم سے ملے بدھ کو ملے۔ ابھی میں نے تقریر تمام بھی نہ کی تھی کہ وہ بولے نہیں نہیں صاحب! آپ کے واسطے یہ حکم نہیں۔ آپ ان لوگوں میں نہیں ہیں۔ آپ جس وقت چاہیں چلے آئیں۔ میں نے کہا بھائی تم جانتے ہو۔ ریاست کے جھگڑے میں میں خفقانی دیوانہ۔ کوئی بات کہنی ہے۔ کوئی سننی ہے بس میرے کام تو بند ہوئے۔ بھائی میں رخصت کو آیا تھا کہ فیروز پور چلا جاؤں گا۔ اب یہاں رہ کر کیا کروں۔ انھوں نے پھر وہی کلمات ادا کیے اور کہا۔ دن رات دن رات جب جی چاہے۔ میں نے کہا۔ خیر تو خاطر جمع ہو گئی۔ اب میں جاتا ہوں۔ الٰہی بخش خاں مرحوم بھی شگفتہ ہو گئے اور کہا۔ بس اب جائیے آرام کیجیے۔ (آزاد) جو خدا کے لیے دنیا کو چھوڑ بیٹھے ہیں خدا بھی انھیں نہیں چھوڑتا۔

۷۔ ساتھ ہی استاد مرحوم یہ بھی کہتے تھے اور یہ بات لکھنے کے قابل ہے کہ زبان سے الٰہی بخش خان مرحوم نے کبھی نہیں کہا۔ مگر میں جانتا ہوں۔ انھیں آرزو تھی کہ علی بخش (ایک ہی بیٹا تھا) بذات خود صاحب منصب اور صاحب امارت ہو چکا اور اس کی اولاد کا دست نگر نہ ہو۔ سازو سامان کر کے ریاستوں میں بھی بھیجا۔ صاحب لوگوں کے ہاں بھی بندوبست کیے۔ ظاہری و باطنی ساری کوششیں کیں۔ یہی بات نصیب نہ ہوئی۔ مشیت اللہ مشیت اللہ اور وہ خود بھی اخیر میں سمجھ گئے تھے۔ ایک دن انھی باتوں میں استاد نے فرمایا کہ علی بخش خاں بھی خوب صورت اور شان دار امیر زادہ تھا۔ میں نے عرض کی کہ حضرت کئی دفعہ بعض مجلسوں میں، بعض درباروں میں میں نے دیکھا۔ ایسے تو نہیں۔ افسردہ ہو کر کہا۔ کیا کہتے ہو۔ ذکر جوانی در پیری اور ذکر امیری در فقیری۔ کس کو یقین آتا ہے؟

۸۔ استاد مرحوم نے فرمایا کہ ان دنوں مرزا خاں کوتوال تھے۔ مرزا

قتیل کے شاگرد فارسی نگاری اور انشا پردازی کے ساتھ سخن فہمی کے دعوے رکھتے تھے۔ منشی محمد حسن خاں میر منشی تھے اور فی الحقیقت نہایت خوش صحبت، خوش اخلاق بامروت لوگ تھے۔ ایک دن دونوں صاحب الٰہی بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے اور تعارف رسمی کے بعد شعر کی فرمائش کی۔ انھیں اور لوگوں کی طرح یہ عادت نہ تھی کہ خواہ مخواہ جو آئے اسے اپنا شعر سنانے لگیں۔ اگر کوئی فرمائش کرتا تھا تو بات کو ٹال کر پہلے اس کا کلام سن لیتے۔ شاعر نہ ہوتا تو کہتے کسی اور استاد کے دو چار شعر پڑھیے جو آپ کو پسند ہوں۔ جب اس کی طبیعت معلوم کر لیتے تو اسی رنگ کا شعر اپنے اشعار میں سے سناتے۔ اسی بنیاد پر ان سے کہا کہ آپ دونوں صاحب کچھ کچھ اشعار سنائیے۔ انھوں نے کچھ شعر پڑھے۔ بعد اس کے الٰہی بخش خاں مرحوم نے دو تین شعر، وہ بھی ان کے اصرار سے پڑھے اور ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال گئے۔ جب وہ چلے گئے تو مجھ سے کہنے لگے۔ میاں ابراہیم! تم نے دیکھا؟ اور ان کے شعر بھی سنے؟ عجب مجہول الکیفیت ہیں۔ کچھ حال ہی نہیں کھلتا کہ ہیں کیا؟ یہی مرزا خاں اور منشی صاحب ہیں جن کی سخن پردازی اور نکتہ یابی کی اتنی دھوم ہے اور اس پر تماشبینی کے بھی دعوے ہیں! رنڈی تو ان کے منہ پر دو جوتیاں بھی نہ مارتی ہوگی۔ بھلا یہ کیا کہیں گے اور کیا سمجھیں گے۔

۹۔ ... استاد مرحوم فرماتے تھے کہ ایک دن میں بیٹھا غزل بنا رہا ہوں کہ نواب احمد بخش خاں آئے۔ آداب معمولی کے بعد باتوں میں کہنے لگے کہ فلاں انگریز کی ضیافت کی ڈھائی ہزار روپیہ اس میں صرف ہوا۔ فلانی گھڑ دوڑ میں ایک چائے پانی دیا تھا۔ یہ خرچ ہو گیا۔ وہ صاحب آئے تھے۔ اصطبل کی سیر دکھائی۔ کاٹھیاواڑ کے گھوڑوں کی جوڑی کھڑی تھی۔ انھوں نے تعریف کی میں نے بگھی میں جڑوائے اور اسی پر

سوار کر کے انھیں رخصت کیا وغیرہ وغیرہ۔ کیا کروں خالی ملنا، خالی رخصت کرنا مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے امیروں کو امارت کے بڑے بڑے دعوے ہیں۔ (جس طرح بچے بزرگوں سے گِڑ گِڑ کر باتیں کرتے ہیں۔ چیں بہ جبیں ہوتے تھے اور کہتے تھے) فیل خانہ میں گیا تھا وہاں یہ بندوبست کر آیا ہوں، گھوڑیاں آج سب علاقہ بھجوا دیں حضرت کیا کروں۔ شہر میں اس گلہ کا گزارہ نہیں۔ یہ لوگ اس خرچ کا بوجھ اٹھائیں تو چھاتی تڑق جائے۔ الٰہی بخش خاں مرحوم بھی اداشناسی میں کمال ہی رکھتے تھے۔ تاڑ گئے چپکے بیٹھے سنتے تھے اور مسکراتے تھے۔ جب ان کی زبان سے نکلا کہ چھاتی تڑق جائے۔ آپ مسکرا کر بولے۔ ہاں تو آپ کی چھاتی میں بھی آیا ہوگا۔ شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ پھر انھوں نے فرمایا آخر امیر زادے ہو۔ خاندان کا نام ہے۔ یہی کرتے ہیں مگر اس طرح نہیں کہا کرتے۔ نواب احمد بخش خاں نے کہا۔ حضرت پھر آپ سے بھی نہ کہوں؟ فرمایا خدا سے کہو۔ وہ بولے کہ مجھے آپ دکھائی دیتے ہیں آپ ہی سے کہتا ہوں آپ خدا سے کہیے۔ فرمایا کہ اچھا ہم تم مل کر کہیں۔ تمھیں بھی کہنا چاہیے۔ نواب احمد بخش خاں بھی جانتے تھے کہ جو سخاوت ادھر ہوتی ہے عین بجا ہے اور اسی کی ساری برکت ہے۔ ۲۳

۱۰۔ ان کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ۱۶/ مطلع ہے اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اسی رعایت سے اس کا نام تسبیح زمرد رکھا تھا۔ یہ تسبیح بھی استاد مرحوم نے پروئی تھی اور آخر میں ایک تاریخ فارسی زبان میں اپنے نام سے کہہ کر لگائی تھی۔ جن دنوں اس کے دانے پروتے تھے تو نواب صاحب کی سب پر فرمائش تھی کہ کوئی مثل، کوئی محاورہ سبزی کا بتاؤ۔ ان کے بذل و کرم اور حسن و اخلاق اور علو رتبہ کے سبب سے اکثر شرفا خصوصاً شعرا آ کر جمع ہوتے تھے

اور اشعار سنتے سناتے تھے۔ ان دنوں میں ان کے شوق سے اوروں پر سبز رنگ چھایا ہوا تھا۔ بھورے خان آشفتہ ایک پرانے شاعر شاہ محمدی مائل کے شاگرد اور ان کے مرید تھے، وظیفہ بھی پاتے تھے۔ ان کے شعر میں ہری چگ کا لفظ آیا کہ ان کے ہاں ابھی تک نہ بندھا تھا۔ ان سے وہ شعر لے لیا اور اپنے انداز سے سجایا۔

آج یہاں کل وہاں گزرے یوہیں جگ ہمیں
کہتے ہیں سب سبزہ رنگ اس سے ہری[24] چگ ہمیں

انھیں سو روپے ایک رومال میں باندھ کر دیدیے کہ تمھاری کاوش کیوں خالی جائے۔ افسوس کہ اخیر میں کمبخت بھورے خاں نے روسیاہی کمائی اور سب تعلقات پر خاک ڈال کر ان کی ہجو کہی لطف یہ کہ دریا دل نواب۔ طبیعت پر اصلا میل نہ لائے لیکن اس نااہل کو ان کا آزردہ ہی کرنا منظور تھا۔ جب دیکھا کہ انھیں کچھ رنج نہیں تو نواب حسام الدین حیدر خان نامی کی ہجو کہی۔ نامی مرحوم سے انھیں ایسی محبت تھی کہ وہ خود بھی کہتے تھے اور لوگ بھی کہتے تھے کہ ان دونوں بزرگوں میں محبت نہیں عشق ہے (اگلے زمانے کے لوگوں کی دوستیاں ایسی ہی ہوتی تھیں) ان کی تعریف میں غزلیں کہہ کر داخل دیوان کی تھیں۔ ایک مطلع یاد ہے۔

جو تم آؤ مرے مہماں حسام الدین حیدر خان
کروں دل نذر جاں قرباں حسام الدین حیدر[25] خان

قطعہ در تاریخ تسبیح زمرد "ذوق نے بزبان فارسی کہا تھا۔ دونوں مادوں سے ۱۲۳۶ھ /۲۱-۱۸۲۰ء برآمد ہوتا ہے۔ قطعہ یہ ہے۔

سبزہ رنگاں کہ بہ باغ جسد تازہ چوں شاخ گل لالہ و درد
از کمر تا دہن شان موہوم چوں خط جوہری و جوہر فرد

چشم دارند بہ قتل عشاق — چوں حریفے کہ کند قصد نبرد
بجمال رُخ آں ہا معروفؔ — مدتے شد کہ نظر خوش میکرد
اندراں حال سخنہامی گفت — ہمہ چوں نالہ موزوں پرورد
رفت صیت سخنش از دہلے — تا سفاہان و عراق بادرد
صدویک مطلع رنگیں آخر — گفت بانالہ گرم و دم سرد
شد چو تسبیح زمرد نامش — رونق آب گہر رفت بگرد
مرد فیروزہ و خوں شد دل لعل — کہر باچوں برقانے شدہ زرد
پیش آنگنج گہرنیست چو خاک — گنج خسرو کہ بود باد آدرد
ذوقؔ چوں خواست دو تار سخنش — اندریں دفتر معنی بدوفرد
اوّل از دانہ خوش رنگ شمار — گردو آں عقدۂ مطلب وا کرد

۱۲۳۶ھ

باز خامہ رنگیں بہ نوشت
طرفہ تسبیح زمرد آورد

۱۲۳۶ھ

مشہور ریختی گو سعادت یار خاں رنگین (۱۱۷۰ھ / ۵۷-۱۷۵۶ء تا ۱۲۵۱ھ / ۳۶-۱۸۳۵ء) معروفؔ کے خاص دوستوں ہی میں نہ تھے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ معروفؔ کی جوانی کی رنگ رلیوں میں شریک غالب بھی رہے تھے۔ معروفؔ کے ترکِ دنیا کے بعد رنگین اور معروفؔ میں ناچاقی ہو گئی جس پر رنگین نے معروفؔ کی ہجو میں ۱۰۱ رباعیاں لکھیں جو ان کی تصنیف "سبع سیارۂ رنگین" (قلمی) کے تیسرے حصے "سبحہ رنگین" میں شامل ہیں۔ سبحہ گویا ۱۰۱ رباعیوں کی تسبیح ہے[۲۶]۔ رنگین نے شرط رکھی تھی کہ جب وہ ہجو میں پانچ سو رباعیاں کہہ لے گا تب معروفؔ کی خطا معاف کرے گا۔

لازم ہے رباعی کہنے کا غم سہ لوں — شغل اور نہیں، اس میں رنگیں! بہ لوں
تقصیر معاف ہوئے معروفؔ کی تب — جب ہجو میں پانچ سو رباعی کہہ لوں

مگر معلوم ہوتا ہے کہ معروفؔ کو معافی نہیں ملی کیوں کہ رنگین صرف ایک سو ایک

رباعیاں ہی کہہ سکے۔ یہ معافی کی شرط اس لیے تھی کہ جھگڑے کی پہل معروفؔ کی طرف سے ہوئی تھی۔

یارب ملے رنگیں کو تو نیکی کی جزا — معروفؔ کو ہوئے اس کے فعلوں کی سزا
جس نے یہ بنا فساد کی پہلے رکھی — امید یہ ہے کہ چکھے وہ اس کا مزا

جھگڑے کا سبب غالباً یہ تھا کہ معروفؔ نے اپنے آپ کو رنگینؔ سے بڑا شاعر منوانا چاہا تھا۔ اسی لیے رنگینؔ کو بھی ہجو یہ اشعار کہنے پڑے۔

معروفؔ اتنے لیے ہی رنگیں سے لڑا — تا خلق کہے کہ یہ شاعر ہے بڑا
جب پڑنے لگیں اُدھر[27] سے صابن کے مول — سونے کی طرح سے تب گیا خوب گھڑا

☆☆☆

رنگیں! معروفؔ تلملاتا ہے عبث — اشعار پہ ترے جی جلاتا ہے عبث
یہ لطف سخن خدا داد ہے یار — بیہودہ یونہیں وہ رشک کھاتا ہے عبث

☆☆☆

رنگیں! معروفؔ نے بہت غم کھایا — پر نام نہ شاعری میں تھا پایا
جو لطف سخن ہے، سو خداداد ہے وہ — ہر ایک کے حصے میں نہیں وہ آیا

☆☆☆

معروفؔ تو ہے شعر و سخن کا محتاج — پر ہجو کو خلق کی وہ موجود ہے آج
اس کی وہ مثل ہوئی یہ قولِ رنگیں — چوہا نہ سماوے بل میں اور باندھے چھاج

☆☆☆

معروفؔ! ترے بول سہوں میں کس طرح — رنگیں ہوں، زباں بند رہوں میں کس طرح
جب تیری طرف سے ہو بدی کا آغاز — پھر ایک کی سو سو نہ کہوں میں کس طرح

☆☆☆

معروفؔ کے متعلق تذکرہ شمیم سخن اور آبِ حیات میں مرقوم ہے کہ انھوں نے کئی (سات) اساتذہ سے اصلاح لی۔ رنگینؔ کی یہ رباعی بھی شاید اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

معروفؔ کی مشق کو، کیا ہم نے جو غور — ہر ایک غزل کا اس کی ہے طرز اور
رنگینؔ! اس کا سبب یہ معلوم ہوا — لوگوں سے کہا لیتا ہے اکا ہے یہ طور

☆☆☆

معلوم ہوتا ہے کہ ان استادوں یا شاعروں میں معروف کے گھرے دوست مبارزالدولہ ممتازالملک میر حسام الدین حیدر خاں بہادر حسام جنگ نامی بھی تھے۔ رنگین کا کہنا ہے کہ معروف میر اتقد مقابل نہیں وہ جو کچھ میرے خلاف لکھتا ہے وہ نامی کا کہا ہوا ہوتا ہے۔

معروف اگر میرے مقابل اڑتا تو زیور نظم میں بھی کچھ کچھ گھڑتا
روکش مرے ہو سکے وہ رنگیں! کیا دخل پردے میں وہ نامی[۲۸] کے ہے مجھ سے لڑتا

مرزا سعید[۲۹] الدین احمد خاں طالب (ضیاء الدین احمد خاں نیر ورخشاں کے چھوٹے بیٹے اور احمد بخش خاں کے پوتے) لکھتے ہیں[۳۰]۔

"معروف مرحوم کی تمام خانہ داری کا خرچ یعنی مایحتاج خانہ، جاڑے گرمی کا کپڑا، زنانہ و مردانہ مکانات سکونت، ان سب باتوں کی کفالت فخر الدولہ (احمد بخش خاں) مرحوم کی طرف سے ہوتی تھی۔ علاوہ بریں ایک پالکی، ایک ہوادار، آٹھ کہار، دو گھوڑے خاصے اور گھوڑے رفیقوں کے لیے اور..... کل ملازمین جو ایک سرکار کے لیے لازمی ہیں یہ سب اسی..... بڑے بھائی کی طرف سے تعینات تھے۔ تین سو روپے ماہوار صرف جیب خرچ کے لیے..... ہر سال دو تین ہزار روپیا اور قرض بھی ادا کیا جاتا تھا، جو حضرت معروف کا دست نخی اپنے اوپر بار کر لیتا تھا۔ ..."

کچھ اسی سے ملتا جلتا حال آزاد نے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے اوپر آب حیات کے تحت بیان نمبر۷ جس میں بتایا گیا ہے کہ باوجود تارک الدنیا ہونے کے معروف کی یہ آرزو تھی کہ کسی طرح ان کا بیٹا علی بخش خاں بھی صاحب منصب اور صاحب امارت ہو جائے اور چچا (احمد بخش خاں) کا دست نگر نہ ہو اور بیان نمبر۹ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب احمد بخش خاں اپنے اخراجات کا ذکر کرتے تھے تو معروف کو ناگوار گزرتا تھا۔ اب مندرجہ بالا کے پیش نظر رنگین کی یہ رباعیاں پڑھیے۔

معروف میں باقی تو نہیں دم مطلق کہتا ہے کسی سے میں نہیں کم مطلق
غم احمد بخش خاں کی ثروت کا ہے بس رنگیں! اس بن اسے نہیں غم مطلق

☆☆☆

معروف ہوا ہے خشک جوں سوکھی مشک   اور بہتے مدام اس کے ہیں آنکھ سے اشک
رنگیںؔ! خفقان نہیں ہے مطلق اس کو   یہ احمد بخش خاں کی دولت کا ہے رشک

☆☆☆

ترکِ دنیا کے بعد معروفؔ دیہاتی لوگوں کی طرح ایک رنگینؔ دھاری دار کپڑے سوسی کا پاجامہ اور اونی ملائم گدر کپڑے طوس کا کرتا پہنا کرتے تھے۔ رنگینؔ کہتے ہیں کہ سب دکھاوا ہے اور اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ لوگ معروفؔ کو درویش سمجھ کر قدم بوسی کریں:

معروف کا پاجاما جو ہے سوسی کا   اور کرتہ بھی ہے پارچہ طوسی کا
مطلب ہے یہ رنگیںؔ! تاکہ یہ دیکھ لباس   خلقت کو ارادہ ہو قدم بوسی کا

معروفؔ کو زرد رنگ کا لباس مرغوب تھا۔ اس پہناوے کی وجہ رنگینؔ یہ بیان کرتے ہیں کہ معروف فقیروں میں اپنی نمائشی فقیری کی وجہ سے "زرد رو" یعنی شرمندہ ہیں:

جو خاک نشیں ہیں ان کا ہے گرد لباس   فخر اپنا سمجھتے ہی نہیں مرد لباس
رنگیںؔ! فقرا میں زرد رو ہے معروف   اس واسطے بھاتا ہے اسے زرد لباس

☆☆☆

اگر معروفؔ زرد لباس کے بجائے سرخ یا سبز لباس پہنتے ہوتے تو رنگینؔ ان پر سرخ رو یا سبز قدم وغیرہ مرکبات کا اطلاق بہ آسانی کر سکتے تھے۔

یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے کہ ناچاقی کے بعد کہی ہوئی ان رباعیوں میں حتی الوسع رنگینؔ نے معروفؔ کو ہدف ملامت ہی بنایا ہے پھر بھی اگر انصاف سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان رباعیوں میں معروفؔ کی نجی زندگی کے متعلق دیے ہوئے بیانات بے بنیاد نہیں۔ رنگینؔ کے یہاں ہجو کوئی مستقل فن کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس لیے یہ رباعیاں محض وقتی جذبے کے تحت فکر ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رنگینؔ نے انھیں نظم کرتے ہوئے حقائق کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، محض ان میں طنزیہ رنگ بھر دیا ہے۔

معروفؔ :ب ابھی فقیری کی طرف مائل نہیں ہوئے تھے، ان کی اور رنگینؔ کی بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک بار رنگینؔ دو ایک برس کے بعد دلّی لوٹے اور ابھی مہینہ بھر ہی دلّی میں رہے تھے کہ انھوں نے الور جانے کی ٹھانی۔ وجہ یہ تھی کہ معروفؔ اس وقت دلّی میں نہ تھے

الور گئے ہوئے تھے اور غالباً دلّی کو جلد پلٹنے کے آثار بھی نہ تھے۔ رنگین اپنے "شفیق و اشفق" بھائی سے ملے بغیر کیوں کر رہ سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے الور کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ اس واقعے کو رنگین نے قطعہ بند کیا ہے۔ یہ قطعہ (منظوم نامہ) "دیوان اوّل ریختہ" کے ص ۲۰۲ پر درج ہے۔ یہ قلمی دیوان (مملوکہ ڈاکٹر حسن آرزو) رنگین کا خود نوشتہ اور دستخطی ہے۔ جو شاہ جہان آباد میں ۱۲۲۱ھ میں لکھا گیا تھا[۳۱]۔

قطعہ

از دیوان اوّل "ریختہ"
قلمی خود نوشتہ رنگین
مکتوبہ ۱۲۲۱ھ
شاہ جہان آباد

کہا اک مہرباں نے مجھ سے آکر — کہ تو الور کو جاتا ہے سنا ہے
خدا کے واسطے ہم کو بتادے — کہ واں جانے سے مطلب تجھ کو کیا ہے
برس دو بعد تو آیا ہے گھر میں — مہینہ بھر ہی دلّی میں رہا ہے
کہی ہے سرگزشت اپنی نہ مجھ سے — نہ تیرا دکھ ہی کچھ ہم نے سنا ہے
نہیں ہے تجھ کو کچھ ہم سے محبت — ہمیں اس بات کا تجھ سے گِلا ہے
نہیں چشم مروت تجھ میں رنگین — کہیں کیا ہم غرض تو بے وفا ہے
عجب موقع پہ یاد آیا ہے اس وقت — کسی استاد نے مطلع کہا ہے
ترا دل ہی اگر ہم سے پھرا ہے — تو بہتر ہے، ہمارا بھی خدا ہے
کہا میں نے الٰہی بخش خاں واں — شفیق و اشفق اک بھائی مرا ہے
غش اس پر میں ہوں وہ مجھ پر ہے مفتوں — یہ میرا اور اس کا ماجرا ہے
کہ میں آہن تو مقناطیس ہے وہ — جو میں ہوں کاہ تو وہ کہربا ہے
اسے جی چاہتا ہے جاکے دیکھوں — برس تین اک سے وہ مجھ سے جدا ہے
یہ سن کر مجھ سے پھر ہنس کر وہ بولے — سمجھ جی میں ہوا اب تجھ کو کیا ہے
جہاں میں کس کو ہے الفت کسی سے — یہ رشتہ مدتوں سے گم ہوا ہے

یہ سب کہنے ہی کی باتیں ہیں اے دوست — کہاں کوئی کسی کا آشنا ہے
تری اک مثنوی کے شعر یہ دو — پڑھوں میں اب کہ پڑھنے کی یہ جا ہے
جہاں ہوتی ہیں آنکھیں چار باہم — تو ہو جاتا ہے دو ہیں پیار باہم
پھر اک آنکھیں ذرا جو ہو گئیں اوٹ — تو آجاتا ہے بس دل میں وہیں کھوٹ
یہی معمول ہے اہل جہاں کا — سمجھ لے جی میں تو نے ہی کیا ہے
کہا یہ سن کے میں نے ان کو حضرت — وہی سچ ہے سخن جو آپ کا ہے
ولے میں نے بھی. دنیا کو ہے دیکھا — مجھے بھی کام بہتوں سے پڑا ہے
کہاں ہوتے ہیں پیدا لوگ ایسے — وہ ظاہر اور باطن ایک سا ہے
بروں سے بھی وہ کرتا ہے بھلائی — بھلوں سے تو وہ پھر کیسا بھلا ہے
دو دستی مہرباں بجتی ہے تالی — مثل مشہور یہ اب جابجا ہے

اسے ہے عشق مجھ سے مجھ کو اس سے
میں اس پر غش وہ مجھ پر مبتلا ہے

یہ تو سب جانتے ہیں کہ معروف نے دو دیوان ترتیب دیے تھے۔ دیوان اوّل شاہ عبدالحامد قادری بدایونی نے ترتیب دے کر ۱۹۳۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے طبع کرا لیا تھا۔ دیوان دوم تاحال غیر مطبوعہ ہے۔ دیوان اوّل کے شروع میں قادری صاحب کا ۱۴ صفحوں کا مقدمہ ہے۔ یہ نسخہ قادری صاحب کو میرزا نصراللہ خاں نبیرۂ معروف سے ملا تھا۔ دیوان میں معروف کی مشہور نظم "تسبیحِ زمرد" شامل ہے جس کا قطعۂ تاریخ ذوق نے کہا تھا۔ مادّے سے ۱۲۳۶ھ مستخرج ہوتا ہے۔ کیا اس کے معنی یہ لیے جائیں کہ دیوان میں ۱۲۳۶ھ تک کا کلام شامل ہے؟ کیا معروف کا دوسرا دیوان معروف کی عمر کے بقیہ چھ سالوں میں فکر کیا گیا تھا؟ ایسی باتوں کا کوئی جواب نہیں۔ دیوانِ مطبوعہ کے اشعار کی تعداد چار ہزار کے قریب ہے۔

آخر میں نواب میرزا سعید الدین احمد خاں طالب کی چھ صفحے کی تقریظ ہے۔ بعدازاں احسن مارہروی مرحوم کا تبصرہ ہے جو دس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ پھر دس صفحے اور ہیں جن میں ضیا بدایونی کی تقریظ، سائل دہلوی کا قطعۂ تاریخ طبع دیوان اور چند دیگر قطعاتِ تاریخ ہیں۔ متن میں غلطیاں بہت ہیں۔ دیوان تدوین و تحقیق دونوں لحاظ سے نہایت کم درجے کا

کام ہے۔

میرے کتب خانے میں دیوان معروفؔ کا ایک قلمی نسخہ ۳۲ ہے۔ یہ معروفؔ کے انتقال کے صرف ۱۴ سال بعد لکھا گیا تھا۔ فل اسکیپ کے کل صفحات ۱۰۹ ہیں۔ ہر صفحے پر ۵۶ اشعار ہیں لیکن بعض صفحوں پر اشعار مخمسات اور عنوانات درج کرنے کی وجہ سے کم بھی ہو سکتے ہیں۔ اس طرح اگر فی صفحہ ۴۶ اشعار بھی شمار کر لیے جائیں تو اشعار دیوان کی مجموعی تعداد پانچ ہزار سے کم نہ ہو گی۔ دیوان پر کہیں دیوان اول یا دیوان دوم تحریر نہیں ہے۔ تاہم مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ دیوان معروفؔ مطبوعہ سے میرے قلمی نسخے میں کلام کہیں زیادہ ہے۔ مثلاً صرف الف کی ردیف میں میرے دیوان میں کم از کم ۲۵ غزلیں دیوان مطبوعہ سے زیادہ ہیں۔

مخطوطے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"یاعلی مدد

رب یسر بسم الله الرحمٰن الرحیم تمم باالخیر"

اور خاتمہ اس طرح:

"بعون اللہ تعالےٰ دیوان معروف علی معروفؔ، فرمائش فرزند ارجمند
حاجی خانصاحب مختار سرکار نواب مرحوم ..... باہتمام رسید بتاریخ
غرہ رجب المرجب ۱۲۴۶ ہجری، کتبہ مرزا ہاشم ملک المتخلص وصفؔ۔"

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اگرچہ یہ دیوان الٰہی بخش خاں معروفؔ ہی کا ہے مگر خاتمے میں ان کا نام معروف علی معروفؔ کیوں لکھا گیا۔ اس بات نے عرصے تک بہتوں کو مغالطے میں رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ الٰہی بخش خاں کے پوتے سعید احمد خاں طالبؔ اپنے علوی یعنی حضرت علی کی اولاد ہونے پر ناز کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

المختصر کہ خادم شاہ نجف ہیں ہم
مشکل کشا ہیں جن کے سلف وہ خلف ہیں ہم

اسی طرح معروفؔ بھی اپنے آپ کو کبھی الٰہی بخش خاں اور کبھی معروف علی لکھتے تھے ۳۳۔ ملاحظہ ہوں دیوان معروفؔ مطبوعہ سے چند مقطعے جن میں تخلص کی جگہ معروفؔ

نے پورا نام استعمال کیا ہے۔

الٰہی بخش خاں:

(ص۸۸) غزل ایک اور لکھیے اے الٰہی بخش خانصاحب
قلم کو ہاتھ سے اپنے ابھی کیوں آپ دھرتے ہیں

☆☆☆

(ص۱۰۳) ذکر چلا کہ یار بن جیتے ہیں یار کس طرح
بس یہ الٰہی بخش نے سنتے ہی رو دیا کہ یوں

☆☆☆

(ص۱۱۰) خوش ہو الٰہی بخش تو آج رقیب مرگیا
آئے وو شالہ اوڑھ کر وہ جو سیاہ روبرو

معروف علی

(ص۴۷) چشم تر، خاک جگر، سوختہ جاں، نالہ کناں
یہ بنی عشق میں معروف علی کی صورت

☆☆☆

(ص۱۲۰) تجھ بن اب حال یہ اس کا ہے کہ مردہ جانے
دیکھے احوال جو معروف علی کا کوئی

استدراک

الف۔ معروف کے مورث اعلیٰ بخارا یا بلخ سے ۱۷۵۲ء کے لگ بھگ ہندوستان آئے۔ یہ تین بھائی تھے قاسم جان، عالم جان اور عارف جان۔ راستے میں چند سے قلعۂ اٹک میں مرزا محمد بیگ صوبیدار کے مہمان ہوئے۔ صوبیدار نے عارف جان کو اپنی دختر نیک اختر حبالۂ عقد میں دے کر اپنی فرزندی میں لے لیا۔ یہ بھائی شاہ عالم کے عہد (۱۷۵۹ء۔ ۱۸۰۶ء) میں دلی میں آگئے۔ عارف جان کے چار بیٹے ہوئے۔ نبی بخش خاں، احمد بخش خاں،

الٰہی بخش خاں اور محمد علی خاں۔ ان میں سے احمد بخش خاں نے نظم و نسق ریاست میں اور الٰہی بخش خاں نے شعر و ادب اور تصوف و فقر میں خاصی شہرت حاصل کی۔ یہی وہ الٰہی بخش خاں ہیں جنھیں اس مقالے میں بیشتر صرف معروف کہہ کر پکارا گیا ہے اور آگے بھی پکارا جائے گا۔

معروف کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹا علی بخش خاں اور بیٹیاں بنیادی بیگم (زوجہ غلام حسین خاں مسرور) اور امراؤ بیگم (زوجہ مرزا غالب)۔ نواب سعید احمد خاں طالب (معیار پٹنہ ماہ مئی ۱۹۳۶ء) بتاتے ہیں کہ معروف کا ایک اور بیٹا حرم سے تھا۔ اس سے آگے انھوں نے بسبب طوالت کوئی تفصیل دینے سے گریز کیا۔ تاہم "اصہار الغالب" (مطبوعہ فروری ۱۹۶۹ء) میں صاحبزادہ ناصر الدین احمد خاں عرف خسرو مرزا نے ص ۵۷ پر جو شجرۂ نواب الٰہی بخش خاں معروف دیا ہے اس میں معروف کے دونوں بیٹوں کا نام آ گیا ہے۔ دوسرے بیٹے کا نام علی نواز خاں تھا۔ چوں کہ علی بخش خاں، بنیادی بیگم اور امراؤ بیگم کے اخلاف وغیرہ کے بارے میں سب جانتے ہیں اس لیے یہاں صرف علی نواز خاں کے شجرے کی تفصیل دی جاتی ہے جو "اصہار الغالب" میں دیے ہوئے شجرے کی ہو بہو نقل ہے۔

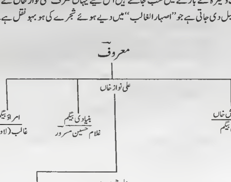

گویا جو بیٹا حرم سے تھا اس کا نام علی نواز خاں تھا اور اس کی اولاد میں ایک لڑکا علی حسین خاں اور ایک لڑکی بیگم جہاں تھی۔

ب۔ جناب حمید احمد خاں نے اپنے بعض[۳۴] مضامین میں گلی قاسم جان اور ان مکانات کا نقشہ کھینچا ہے جو کبھی معروف اور ان کے خاندان کا مسکن تھے۔ یہ تحریر اگرچہ جولائی ۱۹۳۸ء کی ہے پھر بھی اتنی دلآویز ہے کہ اسے درج کیے بغیر چارہ نہیں۔ اب بھی تبدیلیوں کے باوجود بعض مکانات اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔

ا۔ "چاندنی چوک سے مڑ کر بلّی ماروں کے اندر کچھ دور تک چلے جایئے تو شمسی دواخانہ کی عمارت اور حکیم محمد شریف خاں کی مسجد کے درمیان ایک کشادہ گلی نظر آتی ہے، کچھ نئی کچھ پرانی عمارتیں، کچھ سنورتے، کچھ بگڑتے ہوئے مکان ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ گلی میں ذرا فاصلے پر داہنے ہاتھ کو کوڑے کا ڈھیر ایک خاک انداز کے پاس پڑا ہے اور ہمیشہ پڑا رہتا ہے۔ گلی کے دونوں طرف کی عمارتیں زیادہ تر چھوٹی اینٹ کی پرانی عمارتیں ہیں لیکن جس خاص بات کو آپ ایک سرسری نظر میں محسوس کیے بغیر نہیں رہتے، وہ ان نیم منہدم عمارتوں میں اونچی اونچی محرابوں کی کثرت ہے۔ ان بلند محرابوں سے پتا چلتا ہے کہ اس گلی کے گزشتہ مکینوں کی زندگی عظمت وشان سے خالی نہ تھی۔ یہ گلی قاسم جان کی گلی کہلاتی ہے اور اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف سے لے کر آج کے دن تک اسی نام سے مشہور ہے۔ گلی کے اس نام کے پیچھے ایک کہانی ہے جو شاہ عالم بادشاہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے اس زمانے کے قریب تین شریف زادے جو آپس میں بھائی بھائی تھے قسمت آزمائی کے لیے بخارا سے روانہ ہوئے، منزل بہ منزل اٹک اور پنجاب سے گزرتے ہوئے، مٹتی ہوئی مغلیہ سلطنت کی راجدھانی میں پہنچے۔ شہر میں پہنچ کر وہ بالآخر اسی گلی میں آباد ہوئے، جس کے نکڑ پر کھڑے ہم آپ باتیں کر رہے ہیں، شہرت اور دولت ان تین بھائیوں

میں کم از کم دو کے حصے میں ضرور آئی پہلے قاسم جان کے اقبال کا ستارہ چمکا۔ خود گلی کا نام اس کا شاہد ہے کہ جاہ و ثروت کے لحاظ سے قاسم جان اپنے بھائیوں کے سر تاج تھے۔ لیکن انیسویں صدی کے شروع میں تقدیر ایک بار پھر مسکرائی اور اس مرتبہ عارف جان کا بیٹا لوہارو اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست پر متمکن نظر آیا۔ قاسم جان اور عارف جان کی اولاد اب بھی اس گلی کی حویلیوں اور محل سراؤں میں موجود ہے... اسی گلی میں شاید غالب کی پیدائش سے بھی پہلے، غالب کے چچا کا عقد عارف جان کی بیٹی (ہمشیرہ معروف) سے ہوا تھا۔

سامنے کے سرے پر جہاں گلی ختم ہونے سے پہلے بائیں ہاتھ کو گھومتی ہے ایک بڑی محراب نظر آ رہی ہے اگر اس محراب سے گزر کر اندر چلے جائیں تو چند پرانی عمارتیں ملتی ہیں جن میں سے ایک عارف جان کے بیٹے نواب احمد بخش خاں والی لوہارو کی حویلی ہے روایت کہتی ہے کہ یہی حویلی غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروف کا بھی مسکن تھی......"

۲۔ "مرزا الٰہی بخش خاں کو شہزادوں کا سا عیش و آرام میسر تھا جوانی میں مرزا الٰہی بخش خاں کی زندگی کا ڈھنگ ایسا تھا کہ وہ شہزادہ گل فام کے عرف سے مشہور تھے..."

ج۔ "ذوق اور محمد حسین آزاد" مطبوعہ ۱۹۸۷ء کے صفحہ ۱۷۔۱۸ پر آب حیات کے اس بیان کا اقتباس دیا گیا ہے جو آزاد نے ذوق کی زبان سے سن کر لکھا ہے۔ ضروری عبارت ملاحظہ کیجیے:

> "سوداگر آیا اور اپنی چیزیں دکھانے لگا۔ ان میں ایک اصفہانی تلوار بھی تھی۔ وہ (معروف کو) پسند آئی۔ .. اور چیزوں کے ساتھ وہ تلوار بھی لے لی .خدا کی قدرت دو تین دن کے بعد بڑے صاحب (فریزر صاحب ریذیڈنٹ دہلی) ایک اور صاحب کو اپنے ساتھ لے

کر نواب احمد بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے ... جب چلنے لگے تو انھوں (معروف) نے وہی تلوار منگا کر صاحب کے ہمراہی کی کمر سے بند ھوائی..... "

اس پر جناب عابد پشاوری تنقید کرتے ہیں:

"اس عبارت کا ایک ایک فقرہ غلط ہے ... اس سلسلے میں ایک لطیفہ سن لیجیے۔ جس سال آزاد پیدا ہوئے (۱۸۳۰ء) بڑے صاحب یعنی فریزر صاحب دلی کے ریذیڈنٹ ہو کر آئے۔ ظاہر ہے کہ ریذیڈنٹ ہونے کے بعد ہی نواب احمد بخش خاں کی ملاقات کو گئے ہوں گے (ورنہ آزاد توسین میں ریذیڈنٹ دہلی کی تصریح کیوں کرتے؟) لیکن یاد رہے کہ نواب احمد بخش خاں کا انتقال اس ملاقات سے تین سال پہلے (اکتوبر ۱۸۲۷ء) ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے ملاقات عالم بالا میں نہیں ہوئی ہوگی۔ لطیفہ در لطیفہ یہ کہ تلوار خرید کر صاحب کے ہمراہی کی کمر سے بندھوانے والا اس سے بھی ایک سال پہلے (۱۸۲۶ء) راہی ملک بقا ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں دروغ کو فروغ نہیں لیکن اس دروغ نے کامل ایک صدی فروغ پایا "

جناب عابد پشاوری کی یہ پوری عبارت ان کی کم آگاہی پر دلالت کرتی ہے۔ انھیں یہ معلوم ہی نہیں کہ جب فریزر کا قتل (۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء) ہوا۔ وہ اس وقت تک کم از کم بیس سال کا عرصہ دہلی اور نواح دہلی میں اعلیٰ انگریزی افسر کی حیثیت سے گزار چکا تھا۔ بقول مالک رام صاحب (فسانۂ غالب ص ۹۷) احمد بخش خاں کی زندگی میں فریزر کے اور ان کے آپس میں نہایت قریبی اور دوستانہ تعلقات رہے تھے۔ حتیٰ کہ احمد بخش خاں کی اولاد فریزر کو اپنا بزرگ سمجھتی تھی اور چچا کہہ کے خطاب کرتی تھی۔

اب Twilight of the mughals (از پی۔ سپیر) سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔ (انگریزی سے ترجمہ):

"ص ۱۰۱۔ ۱۸۲۶ء میں اس (منکاف) نے اپنے نائب اوّل ولیم فریزر

سے احتجاج کیا...... یعنی احمد بخش خاں اور الٰہی بخش خاں معروف دونوں کے انتقال سے پہلے ولیم فریزر دہلی میں سر چارلس منکاف کا نائب اول تھا۔

ص ۱۰۸۔ دہلی کے علاقے میں...... بیس سال تک نائب اول رہنے والا شخص مشہور سخت گیر ولیم فریزر تھا جس کے ذمہ مال گزاری وصول کرنا تھا... (اس سختی کی وجہ سے) سونی پت میں ۱۸۲۱ء میں ۹ گانوؤں کی مال گزاری ۱۶۱۳۱ روپے سے بھی کم تھی...

ص ۱۸۴۔ فریزر شمس الدین (احمد خاں) کے باپ (نواب احمد بخش خاں) کا دوست تھا اور وہ لڑکے (شمس الدین احمد خاں) سے اپنے بیٹے کی طرح سلوک کرتا تھا اس نے اسے اپنے بچے کی طرح پرورش کیا تھا۔ بچہ (شمس الدین احمد خاں) زیادہ وقت فریزر کے ساتھ ہی گزارتا تھا۔

ص ۱۹۲۔ فریزر کمشنر بننے سے پہلے بہت زمانہ انگریزی افسر کی حیثیت سے اس (دہلی کے) علاقے میں گزار چکا تھا۔ وہ ۱۸۲۹ء میں قائم مقام ریذیڈنٹ بنا تھا مگر جلد ہی معطل کر دیا گیا تھا۔ (مستقل طور پر دہلی کا ریذیڈنٹ وہ ہاکنس کی تبدیلی (۱۸۳۲ء) پر ہوا)۔

آزاد کا بیان کیا ہوا واقعہ تاریخی لحاظ سے درست ہے۔ ان کی فریزر کو قوسین میں ریذیڈنٹ دہلی لکھنے سے مراد یہی بتانا ہے کہ یہ فریزر وہی ہے، جو بعد میں ریذیڈنٹ دہلی مشہور ہوا۔ اب اس میں تو شبہے کی گنجائش ہی نہیں کہ نواب احمد بخش خاں اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کی وفات سے برسوں پہلے سے فریزر اس خاندان سے گہرے روابط رکھتا تھا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ولیم فریزر عمر میں بھی احمد بخش خاں اور الٰہی بخش خاں کے لگ بھگ برابر ہی تھا۔

د۔ (بحوالہ غالب نامہ جنوری/اپریل ۱۹۷۶ء۔ ص ۱۳۱)

"رنگین نے اپنی تالیف "اخبار رنگین، (۳۸-۱۲۳۵ھ) میں معروف کے تارک الدنیا ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

خبر گزری کہ شاہجہاں آباد میں الٰہی بخش خاں نے عجب کام کیا کہ کسی یار دوست سے

مشورہ نہ لیا اور اپنی اتنی بڑی ثروت سے ہاتھ اٹھا کر ترکِ لباس کیا اور جے پور میں جا کر حضرت مولوی ضیاءالدین صاحب قدس سرہ کی خدمت میں بیعت کر کے گوشہ نشینی کمال مجاہدہ کے ساتھ اختیار کی۔ حق تو یہ ہے کہ اس پر اللہ کی بڑی مہربانی ہے بلکہ زیب دیتا ہے کہ اسے کہیے کہ یہ ادھم ثانی ہے......" ظاہر ہے کہ رنگین نے یہ خبر ۱۲۱۵ھ اور ۱۲۲۱ھ کے مابین کبھی لکھی ہوگی کیوں کہ معروف نے اسی عہد میں ترکِ دنیا کیا تھا۔

۵۔ مشہور شاعر "جگت استاد" حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان (ولادت تقریباً ۱۱۸۲ھ / ۶۹-۱۷۶۸ء وفات ۱۲۶۷ھ / ۵۱-۱۸۵۰ء) نہ صرف معروف کے معروف ہم عصر تھے بلکہ ان کے خاص احباب میں سے بھی تھے۔ احسان نے جن کا مرتبہ شاعری میں معروف سے کئی مرتبہ بلند ہے معروف کی ایک غزل کی تضمین کی ہے اور معروف کے دیوان میں احسان کی کم از کم دو غزلوں پر تضمین موجود ہے۔ کلیات احسان (مطبوعہ ۱۹۶۸ء)[۳۵] میں معروف کے تعلق سے دو قطعے ہیں۔

(۱) قطعہ الٰہی بخش خاں المتخلص بہ معروف

تلون، ذود رنجی، بدمزاجی — یہ خوِ تیری مجھے احساں نہ بھائی
نہ ہوتا بحرِ الفت کا شناور — جو تیرا تو (تو) ڈوبی آشنائی
جہاں میں وہ (ہے، ہوگا) تو بھی معروف — جہاں جاوے گا باایں بے وفائی
کہے گی خلق یہ دیکھو وہ آیا — الٰہی بخش خاں صاحب کا بھائی
الٰہی بخشیو مجھ کو کہ غیبت — زباں پر میری نادانی سے آئی
الٰہی بخش سے ہے کس کو نسبت — نثارِ فخر، چترِ بادشاہی

آخری شعر میں نثارِ فخر سے مراد غالباً مولانا نصیرالدین عرف میاں کالے کے دادا مولانا فخرالدین ہیں جو نواب احمد بخش خاں برادرِ معروف کے پیر تھے اور جن سے ان کے خاندان کو خاص نسبت ہے۔

(۲) درج ذیل قطعے کے عنوان ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب مفسدوں نے (جن میں غالباً رنگین بھی شامل تھے) ان کے کلام کو اعتراضات کا نشانہ بنایا تو معروف ترکِ شعر گوئی پر آمادہ ہو گئے۔ ملاحظہ کیجیے:

قطعہ

در ایامیکہ الٰہی بخش خاں معروفؔ از اعتراضاتِ
مفسداں عزم ترکِ شعر گفتن کردہ
صبا تو کیجیو آہنگِ خدمتِ معروفؔ
یہ اس سے کہیو کہ اے عندلیبِ خوش آہنگ
تو رنجِ شورشِ زاغان سے گلستاں میں
نہ کیجیو ترک ترنم کا ایک شب آہنگ
وہ شہسوار ہے تو عرصہ ٔ فصاحت کا
مقر ہیں اہل صفاہان د روم و ہند و فرہنگ
عنانِ اشہبِ معنی ہے ترے کف میں سوا
صدائے سگ سے نہ ہوتا تو زینہار پتنگ
ہر آں کہ خاطرِ تو بے سبب بہ انجامد
زقصرِ تختِ زمیں تابہ اوج ہفت اورنگ
ز ترکتاز درخانۂ تناسل او
شکستہ بادبہ (گوپالی۔ کذا) قاضی نیرنگ

فی الحال یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ قطعہ کس سال کا فکر کردہ ہے۔

و۔ سعادت یار خاں رنگینؔ کے مجموعہ ہائے کلام میں کچھ احوال معروفؔ کا اور بھی ملتا ہے۔ مکرمی ڈاکٹر حسن آرزوؔ سہسرامی (جن کی عنایت سے یہ کلام مجھے ملا ہے) فرماتے ہیں "رنگینؔ کے نوشتہ دیباچوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہ دونوں دواوین (جن سے یہ کلام اخذ کیا گیا ہے) ۱۲۱۲ھ / ۹۸۔۱۷۹۷ء تک مکمل ہو چکے تھے۔ ویسے یہ مکتوبہ ۱۲۲۱ھ / ۷۔۱۸۰۶ء شاہجہاں آباد کے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ کلام کے زمانے کا تعین یا اس کی آخری حد ۱۲۱۲ھ / ۹۸۔۱۷۹۷ء ہی سمجھنا زیادہ قرین قیاس ہوگا۔"

اس طرح اس کلام سے نہ صرف یہ کہ معروفؔ اور رنگینؔ کی رنگین زندگی پر روشنی پڑتی ہے، یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ کم از کم ۳۲ سال کی عمر تک معروفؔ نے ترکِ لباسِ دنیا نہیں

کیا تھا۔ کلام ملاحظہ فرمایئے۔

مثنوی سیویم بطور خط از لکھنؤ بہ شاہجہاں آباد بنام برادر صاحب مشفق مہربان الٰہی بخش خاں معروفؔ واظہار عاشق شدن بر شخصے واحوال بے قراری وبیان قول وقسم آں وبر گشتن آں از اقرار وحالت اضطرار دل وشکوہ فلک کجرفتار۔ ۶۱ شعر

صبا جاوے اگر ہندوستان کو — تو یہ کہیو الٰہی بخش خاں کو
کہ مجھ کو یہ نہ تھی امید بھائی — جو تم مجھ سے کرو گے بے وفائی
ولیکن خوب جو میں نے کیا غور — تو دیکھا بس زمانے کا یہی طور
جہاں ہوتی ہیں آنکھیں چار باہم — تو ہوجاتا وہیں ہے پیار باہم
ذرا پھر اک جو آنکھیں ہوگئیں اوٹ — تو آجاتا ہے بس دل میں وہیں کھوٹ
غضب یہ ہے کہ بعد از سال ما ہے — کیا خط سے نہ تم نے یاد گاہے
دیا ہرگز نہ پرزہ بھی غضب ہے — ...... بانی سے عجب ہے
یہی ہوتی ہے شرطِ دوستی واہ — توقع (ایسی تھی) تم سے نہ باللہ سے
یہ لازم ہے، مجھے تم اپنے حالات — رہو لکھتے ہی جب تک ہو ملاقات
لکھوں کیا حال اپنا تم کو میں اب — نہیں ہے چین مجھ کو روز اور شب
ہوا ہوں بندۂ بے دام اس کا — کہ لے سکتا نہیں میں نام اس کا
لکھا جاتا نہیں نام اس پری کا — کہوں حال اس کی کیا جلوہ گری کا
بعینہٖ میں ہوں مفتوں اس طرح سے — ہوا تھا قیس مجنوں جس طرح سے
نظر اب مخلصی آتی نہیں ہے — مجھے یہ زندگی بھاتی نہیں ہے
نہ جاسکتا ہوں واں دوری کے باعث — نہ رہ سکتا ہوں مجبوری کے باعث
قسم مجھ کو تمھارے سر کی بھائی — ہوئی ہے بے جگہ یہ آشنائی
کہا میں نے کہ میں مرتا ہوں تجھ بن — یہ دن سختی کے میں بھرتا ہوں تجھ بن
خدا کے واسطے کر وصل سے شاد — روا مت رکھ یہ مجھ پر ظلم و بے داد
یہ سن کر بولی کیوں کرتا ہے بک بک — (مجھے تسلیم) تو چاہے ہے بے شک
وے لے دل سے خیالِ وصل کر دور — (کہ میں) بے بس ہوں اور ہے تو بھی مجبور

مرا آنا تو ہے دشوار تجھ تک ۔۔۔ ترا بھی پہنچنا مشکل ہے مجھ تک
پڑے ہرگز نہ کام اس سے کسی کا ۔۔۔ کہوں کیا حال آگے بے بسی کا
کہ اس ظالم فلک نے کیا کیا ہے ۔۔۔ نیا داغ اک مرے دل کو دیا ہے
کچھ ایسا اس کا دل پھیرا ہے اک بار ۔۔۔ کہ اب صورت سے میری ہے وہ بیزار
کسی کو بھیج سکتا ہوں نہ میں واں ۔۔۔ نہ کوئی اس کا آسکتا ہے اب یاں

حقیقت جس سے ہو معلوم مجھ کو
بس آگے کیا لکھوں بھائی میں تجھ کو

قطعہ

مطلوب ہے وصل تیرا معروفؔ ۔۔۔ جب تک رنگینؔ کے دم میں دم ہے
ہوسکتا نہیں وہ آہ تحریر ۔۔۔ جو تیری مفارقت کا غم ہے

مخمس......از غزل برادر مہربان الٰہی بخش خاں معروفؔ
(نوٹ۔ صرف مطلعے کی تضمین درج کی جاتی ہے مقطعے کی تضمین دستیاب نہیں۔)

میں کھڑا ہوں مجھ کو ہر صورت سے تاکر دیکھ لو ۔۔۔ اپنی خلوت میں کبھی مجھ کو بلا کر دیکھ لو
پاکبازی کو مری تم گدگدا کر دیکھ لو ۔۔۔ "عاشق صادق ہوں میں تنہا بیٹھا کر دیکھ لو

گر نہیں باور تو مجھ کو آزما کر دیکھ لو"

مخمس سویم از غزل برادر مہربان الٰہی بخش خاں معروفؔ۔
(نوٹ۔ صرف مطلع و مقطع کی تضامین درج کی جاتی ہیں۔)

چیرتا ہے عاشقوں کو سر پر آرا کھینچ کر ۔۔۔ اس لیے بیٹھے ہیں غیر اس سے کنارا کھینچ کر
گوشۂ ابرو تلک غمزہ سے سارا کھینچ کر ۔۔۔ جس کے اس ابرو کماں نے تیر مارا کھینچ کر

مرگیا ایک آہ دل سے وہ بچارا کھینچ کر

☆☆☆

تم مخمس دوسرا رنگیںؔ لکھا چاہو ہو جو ۔۔۔ تو میاں معروفؔ کو یہ مشورہؔ اب جاکے دو
یعنی کر کر جمع تم اپنے حواس اور ہوش کو ۔۔۔ اب غزل ایسی کہو معروفؔ تا حیران ہو

بزم میں ذلت ہر ایک دشمن تمھارا کھینچ کر

حواشی

(۱) دیوانِ معروف۔ نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۵ء، مقدمہ ص ک

(۲) جناب مالک رام نے "تلامذۂ غالب" بار دوم ص ۵۳۴ پر اور نواب امین الدین احمد خاں ثانی آخری والی لوہارو نے اپنی مثنوی "انبساط و انتشار" مطبوعہ ۱۹۷۳ء، ص ۱۹ پر لکھا ہے کہ نواب احمد بخش خاں کی ولادت ۱۷۶۵ء میں بمقام اٹک ہوئی۔ "اصبہار الغالب" از خسرو مرزا مطبوعہ ۱۹۶۹ء کے شجرۂ خاندان لوہارو میں بھی ۱۷۶۵ء ہی ہے۔ یہ ۱۹۱۰ء کے گزٹ سے نقل کیا گیا ہے۔

(۳) تذکرۂ ہندی کا آغاز ۱۲۰۱ھ سے قبل ہو چکا تھا۔ ۱۲۰۹ھ سالِ اختتام ہے۔ چوں کہ مصحفی تذکرہ مکمل ہو جانے پر معروف سے لکھنؤ میں ملے تھے اس لیے یہاں ۱۲۰۹ھ درج کیا گیا ہے۔

(۴) سرور، معروف کے دوست تھے۔ اس لیے قیاس ہے کہ معروف کا ترجمہ پہلی ہی روایت میں درج تذکرہ کر لیا گیا ہو گا اگرچہ ان کے کلام میں بعد میں بھی اضافے ہوتے رہے جیسے کہ "مثنوی تسبیح زمرد"، جو معروف نے ۱۸۳۶ء میں کہی تھی ملاحظہ ہو۔ ذوق کا قطعہ تاریخ بحوالہ دیوانِ معروف۔ مادہ = طرفہ تسبیح زمرد آورد

۱۲۳۶ھ

(۵) ۱۲۲۱ھ مجموعہ نغز کا سالِ اختتام ہے۔

(۶) تذکرہ طبقات سخن از مبتلا میرٹھی (نام سے ۱۲۲۲ھ نکلتے ہیں) میں بھی معروف کا کچھ حال درج ہے مگر وہ چنداں اہم نہیں۔

(۷) اس دیوان میں سے ۱۸۱ شعر درج کیے ہیں۔ ایک مطلع یہ ہے۔

عزیزو! جب کوئی آگے ہمارے دیس گاتا ہے
تو ہم پردیسیوں کو یاد اپنا دیس آتا ہے

لکھا ہے کہ معروف نے یہ مطلع راجپوتانے کی کسی محفلِ رقص میں دیسی راگ سن کر فی البدیہہ کہا تھا۔

(۸) تذکرہ عیار الشعراء۔ خوب چند ذکا میری نظر سے نہیں گزرا۔ سنا ہے کہ اس میں معروف کے تارک الدنیا ہونے کا ذکر ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۱۳ھ /۹۹-۱۷۹۸ء تا ۱۲۴۸ھ / ۳۳-۱۸۳۲ء لکھا جاتا رہا۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ معروف کا حال اس میں کب لکھا گیا۔ بہر حال اگر ترجمہ معروف پہلے ہی سال میں درج تذکرہ ہو گیا تھا جب بھی معروف ترکِ دنیا کے وقت ۳۲ سال سے کم عمر کے نہ تھے۔

(۹) ان میں بہارِ بے خزاں، گلشنِ بے خار، گلدستۂ نازنیناں، گلستانِ بے خزاں، خوش معرکہ زیبا، طبقات شعرائے ہند، سراپا سخن یادگار شعرا، گلشنِ ہمیشہ بہار، گلستانِ سخن، سخن شعرا، ارمغانِ گوکل پرشاد، طورِ کلیم، بزمِ سخن وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب تذکرے ۱۸۴۵ء اور ۱۸۸۰ء کے مابین تالیف ہوئے اس لیے بیشتر ایک دوسرے کی نقلِ محض ہیں۔ اپنی طرف سے جستجو نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ گنجِ تواریخ ص ۸۳ پر نساخ کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ موجود ہے جس سے ۱۲۱۲ھ مستخرج ہوتا ہے ؎

رفت چوں زیں جہانِ بے بنیاد
تابعِ شرع و اہلِ دیں معروف
گفت تاریخِ فوتِ او ہاتف
ساکنِ جنتِ بریں معروف

(۱۰) معروف کے ترکِ دنیا سے متعلق دیکھیے مضمون کے آخر میں "استدراک"(و)

(۱۱) مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے: چین پڑتا نہیں اس بن مجھے اک ان کہیں۔ دیوان معروف مطبوعہ میں اس غزل کے کل ۸ شعر ہیں (ص ۸۹)

(۱۲) جناب خورشید الاسلام نے غالب، تقلید اور اجتہاد (اشاعتِ سوم ۱۹۷۹ء، ص ۲۹) میں اس خط کے پیشِ نظر لکھا ہے کہ "یہ خط ۱۸۶۲ء کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ غزل ۱۸۱۲ء میں لکھی گئی تھی اور اس وقت غالب کی عمر محض ۱۵ سال یا اس سے بھی کم تھی......" حقیقت یہ ہے کہ یہ غزل پہلے پہل ۱۸۲۱ء کے مخطوطے کے حاشیے میں ملتی

ہے۔ گویا غزل نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) اور نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے درمیان کسی وقت کہی گئی تھی۔ ۱۸۱۲ء میں نہیں۔ اس وقت غالب کی عمر ۲۴ سال سے زیادہ تھی۔ غالب کو "پچاس برس" نہیں "چالیس برس" کی بات کہنا چاہیے تھا۔

(۱۳) دیوان معروف مطبوعہ کے ص ۱۴۰ پر اس زمین میں ۱۱ شعر کی غزل موجود ہے۔ مطلع ہے ۔

جواب خط نہیں دیتا نہ دے، جواب تو دے
کہ قاصد آکے جو کچھ دے خبر، شتاب تو دے

(۱۴) احوال غالب، مختار الدین احمد، دوسرا ایڈیشن، ص ۲۵۰

(۱۵) سعادت یار خاں رنگین، ڈاکٹر صابر علی خاں مطبوعہ ۱۹۵۶ء کراچی ص ۴۳

(۱۶) ذوق، ولادت ۱۲۰۳ھ / ۸۹۔۱۷۸۸ء، وفات ۲۳ صفر ۱۲۷۱ھ / ۱۵ نومبر ۱۸۵۴ء

(۱۷) طالب دہلوی، ولادت ۱۸۵۲ء، وفات یکم ستمبر ۱۹۲۰ء

(۱۸) ذوق، سوانح اور انتقاد۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ مطبوعہ دسمبر ۱۹۶۳ء ،لاہور، ص ۷۶

(۱۹) تاریخ جدولیہ۔ اس کا ذکر قاضی عبدالودود مرحوم کے حوالے سے علوی صاحب نے کیا ہے مگر پورا مواد سامنے نہیں لاسکے تھے۔

(۲۰) حقیقت میں عارف جان چاہیے جو قاسم جان کے چھوٹے بھائی تھے۔ مولف سے سہو ہوا ہے۔

(۲۱) سال ولادت "ظہور اقبال" سے نکلتا ہے۔ ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ / ۱۰ جون ۱۸۳۰ء (محمد حسین آزاد از جہاں بانو نقوی ص ۱۳)

(۲۲) نواب احمد بخش خاں

(۲۳) چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے ایسی باتیں کرے تو کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ معروف کے صوفیانہ مقام کی وجہ سے برداشت کرتے ہوں۔ تاہم نواب احمد بخش خاں کی سخاوت کی ایک معاصرانہ شہادت موجود ہے۔ سعادت یار خاں رنگین (۱۱۷۰ھ تا ۱۲۵۱ھ) جو نواب موصوف کے ہم عصر تھے اپنی تصنیف "اخبار رنگین" (بحوالہ سعادت یار خاں رنگین از: ڈاکٹر صابر علی خاں ص ۳۳۳) میں لکھتے ہیں۔ "فیروز پور

جھر کے میں نواب احمد بخش خاں کو مختار اور خلیق جان کر ہزاروں محتاج آتے ہیں اور ہر ایک کچھ نہ کچھ پاتا ہے باوجود ہجوم کے کبھی ترش رو نہیں ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اتنا خرچ نہ کرو لیکن اس کا ارادہ اس سے بھی صد چند کا ہے بادشاہ دتی نے ہنس کر فرمایا۔

راہ حق میں مال کو گریاں لٹائے
جتنا یاں دے اس سے وہ صد چند پائے

(۲۴) "ہری چگ" بیو فاہر جائی کو کہتے ہیں۔ گویا وہ ایک جانور ہے کہ جہاں ہری گھاس پاتا ہے چرتا ہے۔ جب وہ نہ رہے تو جہاں اور ہری گھاس دیکھتا ہے وہاں موجود ہوتا ہے۔

(۲۵) یہ غزل دیوان معروف مطبوعہ میں ص ۱۰۳ پر درج ہے۔ کل شعر ۹ ہیں۔

(۲۶) بحوالہ سعادت یار خاں از ڈاکٹر صابر علی خاں مطبوعہ کراچی ۱۹۵۶ء ص ۲۶۴ تا ص ۲۶۸

(۲۷) "صابن کے مول پڑنا" دتی کا محاورہ ہے یعنی بہت جوتیاں پڑنا۔

(۲۸) حسام الدین حیدر خاں نامی (شاگرد میر مستحسن خلیق و میر تقی میر) مرزا محمد غیاث کے بیٹے اور ذوالفقار الدولہ نجف خاں (۱۱۹۶ھ / ۶ / اپریل ۱۷۸۲ء) کے داماد تھے۔ حالی نے انھیں کے متعلق لکھا ہے کہ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں انھوں نے غالب کی غزل میر کو سنائی تھی اور میر نے سن کر کہا تھا کہ اگر کوئی استاد مل گیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ یہ بھی قیاس ہے کہ انھیں بزرگ کی صحبت میں غالب نے مذہب امامیہ اختیار کیا ہوگا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ بیشتر دتی میں بلی ماران میں اپنی ہی تعمیر کرائی ہوئی شان دار حویلی میں رہتے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں انتقال کیا۔ معروف کے ہم عمر تھے۔

(۲۹) ولادت ۱۸۵۲ء وفات یکم ستمبر ۱۹۲۰ء

(۳۰) بیان محررہ ۶ / جنوری ۱۹۱۳ء مطبوعہ معیار مئی ۱۹۳۶ء

(۳۱) مجھے یہ مکمل قطعہ جناب ڈاکٹر حسن آرزو سہسرای کی عنایت سے حاصل ہوا۔

(۳۲) یہ نسخہ مجھے میرے دوست جناب عبدالصمد خاں نے عنایت فرمایا تھا۔ اس پر کبھی الگ سے مضمون لکھا جائے گا۔

(۳۳) یہ غالبًا اسی طرح ہے جس طرح غالب نے ایک جگہ خط میں اپنے آپ کو غالب علی شاہ لکھا ہے۔

(۳۴) احوال غالب، مختار الدین احمد (بار دوم) ص ۸۰/، و ص ۲۵۰

(۳۵) اس کتاب (خاص کر اشعارِ احسان) میں اتنی غلطیاں ہیں کہ بیشتر مقامات پر متن غیر معتبر ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے کئی جگہ قیاس سے تصحیح کرنی پڑی۔

فخر الدولہ دلاور الملک
نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ

چھٹی صدی ہجری میں سادات علوی میں سے ایک بزرگ خواجہ احمد یسویؒ (ف: ۵۴۳ھ) باب ارسلان (ترکستان) کے مشہور والی اللہ گزرے ہیں، (یہ حضرت علی کے چھوٹے صاحبزادے محمد بن الحنفیہ کی نسل میں سے تھے) انھوں نے سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور شیخ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی سے اکتساب فیض کیا اور انھیں سے سند خلافت لی۔ ترک انھیں ادب اور عقیدت سے "اتا یسوی" سے خطاب کرتے تھے۔ ان کی اولاد میں دین و دنیا کے مشاہیر پیدا ہوئے۔ انھیں میں سے ایک خواجہ محمد امین حکومت بخارا میں سلطان بیگی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ خواجہ محمد امین کے صاحبزادے خواجہ عبدالرحمٰن بلخ میں منتظم دیہات اور مہتمم دارالضرب شاہی رہے۔ اگرچہ یہ خاندان نسب کے لحاظ سے طبقۂ سادات میں سے تھا، مگر شاہی منصب دار ہونے کے باعث مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر مرزا اور جان کے القاب سے کیا ہے۔

خواجہ عبدالرحمٰن کے تین صاحبزادے تھے۔ قاسم جان، عالم جان، عارف جان، مرزا عارف جان سب سے چھوٹے تھے۔ یہ تینوں بھائی احمد شاہ (۱۷۴۸ء۔ ۱۷۵۴ء) کے عہد میں ترکوں کا ایک مسلح دستہ ساتھ لیے بخارا سے ۱۷۵۲ء کے قریب ہندوستان آئے۔ اس زمانے میں وسطی ایشیا (ماوراءالنہر) کی سکونت انتہائی سیاسی افراتفری کے باعث ناممکن ہو گئی تھی۔ اسی سے یہ خاندان ترک وطن پر مجبور ہوا۔ ان دنوں حکومت دہلی کی طرف سے مرزا محمد بیگ

اٹک کے صوبہ دار تھے۔ یہ قافلہ چند دن ان کے پاس ٹھہرا۔ اسی اثنا میں صوبہ دار موصوف نے مرزا عارف جان کو اپنی فرزندی میں لے لیا اور اپنی دختر بلند اختر ان کے حبالۂ عقد میں دے دی۔ اس کے بعد ایک عرصے تک مرزا عارف جان یہاں رہ کر علاقے کے نظم و نسق میں مرزا محمد بیگ کی مدد کرتے رہے۔ آخر ان کی شجاعت اور قابلیت کی شہرت اس دُور دست علاقے سے نکل کر پایۂ تخت دہلی تک جا پہنچی اور یہ حسب طلب شاہ عالم کے عہد میں (۱۷۵۹ء۔۱۸۰۶ء) دارالخلافے میں حاضر ہوئے۔ (مرزا عارف جان کے چار بیٹے ہوئے۔ نبی بخش خان، احمد بخش خان، الٰہی بخش خان اور محمد علی خان ان میں سے احمد بخش خان اور الٰہی بخش خان نے شہرت دوام کے خلعت حاصل کیے۔ یہی وہ الٰہی بخش خان ہیں جو اردو زبان میں معروف کے تخلص سے مشہور ہیں، وہ حضرت مولانا فخر الدین چشتی (ف: ۱۱۹۹ھ) کے مرید خاص اور خلیفہ تھے۔ معروف نے اگر علم و فضل اور تصوف و سلوک کے میدان میں شہرت حاصل کی، تو ان کے بڑے بھائی احمد بخش خان نے ریاست و جہانبانی کی دنیا میں اپنا سکہ جاری کیا۔

احمد بخش خان اٹک میں ۱۷۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ جب خاندان دِلّی منتقل ہوا تو یہ بھی یہاں آگئے۔ جوانی کا زمانہ یہیں گزرا۔ پہلے گوالیار میں بزمرۂ سواراں ملازم ہوئے۔ معقول بسر اوقات تھی، لیکن کسی سبب سے یہ روزگار ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس کے بعد گھوڑوں کی تجارت[1] کرنے لگے۔

ایک مرتبہ اسی سلسلے میں ایک گھوڑا لے کر اجمیر گئے۔ خیال تھا کہ عرس کے موقع پر گھوڑا اچھے داموں بک جائے گا۔ لیکن کوشش کے باوجود گھوڑا فروخت نہ ہوا۔ اس وقت ان کا ہاتھ بہت تنگ تھا اور روپے کی سخت ضرورت تھی۔ خدا کی شان کہ ایک دن درگاہ میں پہنچ کے تضرع سے دعا کی، اس کے بعد گھوڑا منہ مانگی قیمت پر بک گیا۔ اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد یہ شاداں و فرحاں واپس دِلّی آرہے تھے کہ راستے میں مہاراجا بختاور سنگھ والیِ الور سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے احمد بخش خان کو اپنے ہاں ملازمت پیش کی۔ یہ بے کار تو تھے ہی، اس پیش کش کو بہ خوشی قبول کر کے مہاراجا کے ساتھ الور چلے گئے[2]۔

جب انگریزوں اور ریاست الور میں معاہدۂ رفاقت ہوا، تو مہاراجا نے انگریزوں کے ہاں

اپنے مفاد کی نگہداشت کے لیے احمد بخش خان کو اپنا وکیل مقرر کر دیا۔اس عہدے کی حیثیت تقریباً وہی تھی جو آج کل سفیروں کی ہوتی ہے۔یہاں احمد بخش خان نے اپنے فرائض منصبی اس خوش اسلوبی سے سرانجام کیے کہ جہاں ایک طرف مہاراجا ان سے ہر طرح خوش اور مطمئن تھے، وہیں انگریز کو بھی ان کی معاملہ فہمی اور حزم و تدبر پر پورا اعتماد تھا۔اسی زمانے میں انگریزوں کی ریاست بھرت پور سے چھیڑ ہو گئی اور انھوں نے ڈیگ کے قلعے پر چڑھائی کر دی۔ احمد بخش خان نے زور لگایا کہ مہاراجا الور اس موقع پر انگریزوں کا ساتھ دیں اور وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔چنانچہ ریاست الور نے سواروں کا ایک دستہ خود احمد بخش خان ہی کی کمان میں بطور کمک بھیج دیا اور سامان رسد، خوراک وغیرہ سے بھی پوری مدد دی۔بسواڑی کی جنگ میں انگریز سپہ سالار (فریزر) کے گولی لگی۔قریب تھا کہ وہ گھوڑے سے گر جائے کہ احمد بخش خان نے لپک کے اسے سنبھال لیا اور اچھل کر اس کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور لڑتے بھڑتے اسے دشمنوں کے نرغے سے نکال لائے۔لیکن فریزر کا زخم ایسا کاری تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔البتہ مرنے سے پہلے اس نے اس حادثے کی مختصر روداد اور احمد بخش خاں کی جان بازی کا حال ایک کاغذ پر لکھ کے ان کے حوالے کیا، جس میں انگریزی حکومت سے سفارش کی کہ ان کی خدمات کا مناسب اعتراف کیا جائے۔یہ سند غالباً اب بھی ریاست لوہارو کے کاغذات میں موجود ہے۔اسی کا نتیجہ تھا کہ جب فتح کا دربار منعقد ہوا تو کمانڈر ان چیف، لارڈ لیک نے انھیں مفتوحہ علاقے میں سے جاگیر استمراری کے طور پر فیروز پور جھرکا، پونا ہانا، بچھور، سانگرس، نگینہ وغیرہ کے اضلاع عطا کیے اور سند میں ان کا نام لکھوایا۔فخر الدولہ، دلاور الملک، نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ، مہاراجہ بختاور سنگھ بھی دربار میں موجود تھے، اسی موقع پر لارڈ لیک نے انھیں بھی ۱۴ محال جاگیر میں عطا کیے تھے۔مہاراجا نے خاموش رہنے میں اپنی ہی خیال کی اور پرگنہ لوہارو (جو ریاست الور ۳ کا حصہ تھا) اپنی طرف سے احمد بخش خاں کو مرحمت فرمایا اور اس طرح اس کے بعد احمد بخش خان، نواب احمد بخش خان والی فیروز پور جھرکا و لوہارو ہو گئے۔

الور کے قیام کے زمانے میں نواب احمد بخش خان کے پاس ایک مقامی عورت مدیٰ نام رہی تھی۔اس کے بطن سے ان کے چار بچے ہوئے، دو لڑکے شمس الدین خاں اور ابراہیم علی

خان اور دو لڑکیاں نواب بیگم اور جہانگیرہ بیگم۔ بعد کو اسی نواب بیگم کا نکاح زین العابدین خان عارف سے ہوا تھا۔ جہانگیرہ بیگم ایک ایرانی خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔ ان کے شوہر کا نام محمد اعظم خان تھا۔ یہ لوگ آگرے میں رہتے تھے اور ممکن ہے کہ اس خاندان کے نام لیوا اب بھی موجود ہوں۔

اب نواب احمد بخش خاں نے ایک ہم کفو بیگم سے شادی کرلی۔ ان کا نام بیگم جان تھا اور یہ ایک برلاس مغل نیاز محمد بیگ کی بیٹی تھیں۔ بعد کو لوہارو میں یہ خاندان ''کپتان فیملی'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بیگم جان کے ایک بھائی نذر محمد بیگ لوہارو کی فوج میں کپتان مقرر ہو گئے تھے۔ بیگم جان کا ۴ نومبر ۱۸۶۶ء کو انتقال ہوا۔[۴]

بیگم جان کے بطن سے نواب احمد بخش خاں کے سات بچے ہوئے۔ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں دو بیٹے اور منور جہان بیگم، ماہ رخ بیگم، بادشاہ بیگم، حاجی بیگم وغیرہ وہ پانچ بیٹیاں۔

بظاہر شمس الدین خان کے وارث ریاست ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا کیوں کہ ان کی والدہ نواب احمد بخش خان کی بیاہتا بیوی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے خاندان کے چھوٹے بڑے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب کے سب ان کے خلاف تھے اور انھیں اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود نواب احمد بخش خان نے انھیں گدی کا وارث قرار دے دیا۔ اس کا ایک سبب تھا۔

مہاراجا بختاور سنگھ کے پاس ایک طوائف موتی نام تھی اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت اس مدی کی بہن یا کم از کم قریبی رشتہ دار ضرور تھی، جو نواب احمد بخش خان کے گھر میں تھی۔ موسی سے مہاراجا کے دو بچے ہوئے۔ ایک لڑکی چاند بائی اور ایک لڑکا بلونت سنگھ۔ مقامی رواج کے مطابق ایسی اولاد حق نجابت نہیں رکھتی اور خواص دال کہلاتی تھی۔ اس لیے بلونت سنگھ کے الور کی گدی پر بیٹھنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ مدی کے اثر کے تحت یا کسی اور سبب سے نواب احمد بخش خان، بلونت سنگھ کے حامی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراجا کے بھتیجے بنے سنگھ کے جتھے کے لوگ ان کے مخالف ہو گئے اور انھوں نے انعام واکرام کے وعدے پر ایک میو کو تیار کیا کہ وہ ان کا کام تمام کر دے۔ چنانچہ ایک رات جب نواب دلّی میں اپنی ملکیت

نور باغ (واقع آزاد پور) میں اکیلے مقیم تھے، اس شقی نے ان پر سوتے میں حملہ کر دیا۔ بارے، وار اوچھا پڑا۔ جان تو بچ گئی، لیکن زخم بہت شدید آئے اور بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کٹ گئی ۵۔

نواب احمد بخش خان نے مہاراجا بختاور سنگھ کو متاثر کرنے کے لیے ایک اور اقدام کیا۔ اولاً مدی کو بہو خانم کا لقب دے کر اپنی باقاعدہ بیوی تسلیم کر لیا اور پھر شمس الدین خاں کو فیروز جھرکا کی گدی پر بٹھانے کا فیصلہ کیا۔ یہ اس لیے تاکہ کسی طرح الور کے لیے ایک مثال قائم ہو جائے اور وہاں بلونت سنگھ کا حق تسلیم ہو سکے۔ لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی، مہاراجا بختاور سنگھ کے بعد ان کا بھتیجا بنے سنگھ ہی الور کا حکمران بنا اور بلونت سنگھ نظر انداز کر دیا گیا۔

شمس الدین خان سے اپنے خاندان کی مخالفت، نواب احمد بخش خان سے مخفی نہیں تھی۔ چھوٹا بیٹا ابراہیم علی خان صغر سنی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ اب انھیں تشویش تھی تو امین الدین خان اور ضیاء الدین خان کی۔ کیوں کہ گمان غالب تھا کہ خاندان کی مخالفانہ روش کا خمیازہ ان دونوں کو بھگتنا پڑے گا اور شمس الدین خان صاحب جاہ و مال ہو جانے کے بعد ان کی خبر تک نہیں پوچھے گا۔ اس لیے احمد بخش خان نے پیش بندی کے طور پر تقسیم وراثت کا انتظام اپنی زندگی میں مکمل کر دیا، حالانکہ اس سے پہلے ۲۳ / اگست ۱۸۱۷ء کی وصیت کے مطابق انھوں نے تین مختاروں (نواب فیض اللہ بیگ خان، میرزا الٰہی بخش معروف اور لالہ گوردھن داس) کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ ان کی موت کے بعد جسے چاہیں گدی پر بٹھادیں ۶۔ لیکن اب انھوں نے اسے منسوخ کر کے ۱۸۲۲ء میں حکومت انگریزی اور دربار الور کی منظوری سے یہ فیصلہ کیا کہ میرے بعد فیروز پور جھرکا کی گدی پر شمس الدین خان بیٹھے اور لوہارو دوسری بیگم کے دونوں بیٹوں کے حصے میں آئے۔ اس فیصلے کو پختہ کرنے کے لیے انھوں نے فروری ۱۸۲۵ء میں شمس الدین خاں سے بھی ایک دستاویز لکھوائی کہ میں بطیب خاطر لوہارو کا پرگنہ اپنے دونوں بھائیوں کو دینا منظور کرتا ہوں بشرطے کہ وہ ہمیشہ میری اطاعت کرتے رہیں اور اس دستاویز پر جرنیل اختر لونی اور سر چارلس مٹکاف کے دستخط بطور گواہ کرا لیے۔ مقدم الذکر ان ایام میں دلی میں انگریزی ریذیڈنٹ تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھیں اس کا پورا اطمینان نہیں

تھا کہ شمس الدین خان اپنے دونوں بھائیوں کے حق میں انصاف کرے گا۔ پورے سوچ بچار کے بعد اس اندیشے کا سدباب انھوں نے یوں کیا کہ اکتوبر ۱۸۲۶ء میں وہ ریاست کے کاروبار سے خود بخود دست بردار ہو گئے اور اس تقسیم پر ان کی حین حیات ہی میں عمل در آمد شروع ہو گیا[۷]۔

نواب احمد بخش خاں لمبے عرصے تک لارڈ لیک کے ساتھ رہے اور اسی زمانے میں مرزا نصراللہ بیگ عم غالب سے ملاقات ہو گئی کیوں کہ مرزا نصراللہ بیگ کا ایک رسالہ بوقت ضرورت لارڈ لیک کے ساتھ رہ کر لڑائی میں حصہ لیا کرتا تھا۔ نواب احمد بخش خاں صاحب کے ان تعلقات کے باعث ان کی اپنی ہمشیرہ کا نکاح مرزا نصراللہ بیگ سے ہو گیا۔ ان کے بطن سے فتح اللہ بیگ عرف رجب بیگ پیدا ہوئے تھے[۸]۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیگم نصراللہ بیگ خاں عم غالب، ہمشیرہ نواب احمد بخش خاں زیادہ دنوں زندہ نہ رہیں اور بیٹے کو جنم دے کر جنت کو سدھار گئیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی موت بچے کی ولادت کے سبب ہی ہوئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نواب احمد بخش خاں مولانا فخر[۹] صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے اور عروج توابی سے پہلے سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ وضو کرانے لگے تو انھوں نے فرمایا کہ "آؤ والیٔ میوات" اور اسی وجہ سے جب وہ والیٔ میوات ہو گئے تو انھوں نے اپنا خطاب فخرالدولہ منتخب کر کے گورنمنٹ سے تسلیم کرا لیا۔ یہ خطاب ۱۹۴۷ء تک فرمارَوایان لوہارو[۱۰] کا رہا۔

نواب احمد بخش خاں لارڈ لیک کے ساتھ دوش بدوش شمشیر زنی میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۸۰۱ء میں جب کہ وہ خود مختار رئیس قرار دیے گئے، فیروزپور جھرکہ میں اپنی ریاست کے انتظام میں مصروف رہے اور ایک مرتبہ لوہارو بھی گئے اور تعمیر نظامت کا حکم دے کر واپس آ گئے۔ نواب خسرو مرزا، معظم زمانی بیگم عرف بچی بیگم صاحبہ کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ ان کے منھ اور ہاتھوں پر زخموں کے نشانات تھے اور دایاں ہاتھ باوجود مندمل ہونے کے چمچے سے کھاتے تھے۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء میں بہ عمر ۶۲ سال وفات پائی۔ جب ان کی وفات ہوئی اس

وقت نواب شمس الدین احمد خاں پسر اکبر جو ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوئے تھے، کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ نواب امین الدین احمد خاں جو ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے تھے ان کی عمر ۱۳ سال کی تھی اور نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر ور خشاں ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی عمر چھ سال کی تھی یہ دونوں بھائی برادر ان علاتی تھے اور شمس الدین احمد خاں کے چھوٹے بھائی جو ان کے حقیقی بھائی تھے۔ ان کا نام ابراہیم علی خاں تھا۔ ان کی تاریخ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔

تاریخ وفات ۱۸۳۳ء[1] ہے۔ جب نواب احمد بخش خاں کا جنازہ حضرت بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کی درگاہ میں پہنچا تو ان کا سرداب جو تیار ہو گیا تھا اس کے معاوضہ کی طلبی پر جو وہاں کے خدام نے کی تھی اس کو روپیوں سے بھر دیا گیا تھا گویا یہ اس کا معاوضہ تھا۔ جب خدام روپیہ لے چکے تو انھوں نے اس پر اکتفانہ کرتے ہوئے جنازہ رکھنے کے لیے مزاحمت کی اور کہا کہ یہ روپیہ ناکافی ہے۔ ایک شوروغل بپا ہو گیا تو بلونت سنگھ الور کی تخت نشینی میں نواب احمد بخش خاں نے جس کی طرف داری کی تھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ کیا باپو کو رکھنے نہیں دیتے؟ یہ کہہ کر اس نے اپنی زبان میں رسالہ کے نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "ٹھاکر اب کائیں دیکھو چھے" بس اس کا کہنا تھا کہ ٹھاکروں نے تلواریں نکال لیں اور خدام بھاگ گئے۔

ایک بہادر جنگجو نواب کی زندگی جس طرح تلواروں اور جنگ آزمائی کے ساتھ گزری اسی طرح وہ تلواروں کی آب و تاب میں دفن ہوئے۔ ان کے سرہانے ایک سنگ مرمر کا ستون کھڑا کیا اور اس پر میئو مقام فخر الدولہ ۱۲۴۳ھ تاریخ وفات کندہ کرائی اور اس خاص ستون کا جو عنوان "الحمد" مادہ تاریخ نکال کر کندہ کرایا۔

ذیل میں تاریخ راجگان ہند و قائع راجستھان (از حکیم محمد نجم الغنی خان مطبوعہ ہمدم برقی پریس لکھنؤ۔ ۱۹۲۷ء) سے چند حوالے دیے جاتے ہیں جو نواب احمد بخش خاں کی حیات پر وضاحت سے روشنی ڈالتے ہیں۔

ا۔ الور کے راؤ راجہ پرتاپ سنگھ نے ۲۶ دسمبر ۱۷۹۱ء کو پچاس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ "اس کے بعد...... بختاور سنگھ جو قریب رشتہ داری کے سبب گود لیا گیا تھا، مالک بنا۔" (ص ۳۶۴)

۲۔ بختاور سنگھ نے ۱۷۹۴ء میں کچاون علاقہ مارواڑ میں شادی کی۔ وہ اس وقت تک "خطاب راجگی سے...... سر فراز نہ تھا۔" "سرگرم کوشش کے بعد "خطاب مہاراو اور راجہ مع ماہی مراتب سرکار شاہی سے حاصل کرکے رئیسوں میں شمار پانے لگا۔" (ص ۳۶۵)

(تاریخ جدولیہ (از منشی خادم علی مطبوعہ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء) کے ص ۸۳ پر درج ہے کہ تجارا کا علاقہ انگریزوں نے راجہ بختاور سنگھ سے اگست ۱۷۹۹ء میں فتح کیا۔ ظاہر ہے کہ احمد بخش خاں اس وقت تک راجہ بختاور سنگھ سے نہیں ملا تھا ورنہ انگریزوں کے حملے کی نوبت ہی نہ آتی۔)

۳۔ (۱۶ ستمبر ۱۸۰۳ء اور اکتوبر ۱۸۰۳ء کے مابین کسی وقت) "نواب احمد بخش خاں خلعتِ وکالتِ ریاست (الور) سے سر فراز ہوا۔ چوں کہ اس وقت (۱۶ ستمبر ۱۸۰۳ء) سرکار انگلشیہ کا دہلی پر قبض و تصرف ہو گیا تھا۔ نواب احمد بخش خاں نے اطاعت سے حکام انگریزی میں رسوخ حاصل کرکے باہم راؤ راجہ (بختاور سنگھ) اور سرکار انگریزی میں طریقہ اتحاد جاری کیا۔

("لسواڑی کی لڑائی میں) لارڈ لیک نے ان (مرہٹوں) کے لشکر کو تہ و بالا کر دیا اور بھاگے ہوئے مرہٹوں کا نواب احمد بخش خاں...... نے پیچھا کرکے بہت نقصان پہنچایا۔ اس خیر خواہی کے صلے میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کو کئی پرگنے...... دیے گئے اور خاص کارگزاری کے سبب نواب احمد بخش کو سرکار انگریزی کی طرف سے پرگنہ فیروز پور انعام میں ملا اور راؤ راجہ (بختاور سنگھ) نے اپنی طرف سے حسن خدمات کے جلد و میں نواب احمد بخش خاں کو نئے علاقے میں سے پرگنہ لوہارو جاگیر میں عنایت کیا۔" (ص ۳۶۵)

۴۔ "۱۵ صفر ۱۲۳۰ھ (۲۷ جنوری ۱۸۱۵ء) کو چوبیس برس راج کرنے کے

بعد راؤ راجہ (بختاور سنگھ) نے چالیس سال کی عمر میں دہرِ ناپائیدار سے انتقال کیا۔ ان کے مرنے کے بعد موسی نام طوائف سے جو اس کے ساتھ ستی ہوگئی ایک بیٹا بلونت سنگھ اور ایک لڑکی چاند کنور (جس کا بیاہ کان سنگھ ٹھاکر تاڑپور سے ہوا تھا) باقی رہی اور بھتیجا بنے سنگھ راجپوتانے کے قاعدے سے مستحق سمجھا گیا جس سے کچھ مدت تک راج کے دو حصے ہوگئے۔" (ص ۳۶۸)

۵۔ "بختاور سنگھ کے انتقال کے بعد ٹھاکروں نے بلونت سنگھ کی مسند نشینی ناجائز قرار دے کر بنے سنگھ برادر زادۂ بختاور سنگھ کو مسند نشین کرنا چاہا لیکن مسلمان اور چیلے اس بارے میں ان سے متفق نہ ہوئے اور بلونت سنگھ کے جانب دار ہوگئے۔ اسی لیے رفع فساد ضرور ہوا اور دونوں کی مسند نشینی پر اتفاق کیا گیا چنانچہ ماہ سدی تیج سمبت ۱۸۷۱ء کو دونوں مسند نشین ہوئے، نواب احمد بخش خان نے سب سے اقرار نامہ تحریر کرایا کہ بعد بلوغ نصف نصف مال و ملک ان کو تقسیم کیا جائے اس سے تین برس کے بعد پرگنہ اوپوگڑہ کا نواب احمد بخش خاں نے ٹھیکہ لیا، تاریخ ۱۲ ربیع الاوّل ۱۲۳۲ ہجری کو نواب کا دخل پرگنہ تجارا وپوگڑہ میں ہوگیا، کالے خان منتظم مقرر ہوا، جس جگہ ریاست کا محل ہے وہاں سابق میں مسجد تھی جس کو پٹھانوں نے اپنے عہد میں بنوایا تھا۔ اسی جگہ کالے خان نے اپنے رہنے کو بنگلہ بنوایا۔ جب دونوں راجے سن بلوغت کو پہنچے، آپس میں اختلاف کرنے لگے، اب ریاست کے اہلکاروں کے دو فریق ہوگئے۔ نواب احمد بخش خان کو ابتدا سے بلونت سنگھ کی جانب داری ملحوظ تھی اس وجہ سے بنے سنگھ کی جانب دار نواب کے دشمن ہوگئے اور ملا و خوشحال و جہاز چیلوں اور نندرام دیوان نے ایک میو سے کہا کہ اگر تو نواب کو مار ڈالے تو تجھ ہزار روپیہ نقد اور ایک گاؤں تجھ کو دیا جائے گا اس نے اس کام پر آمادگی ظاہر کی۔

آٹھ ماہ تک داؤں گھات میں رہا مگر موقع نہ پایا آخر کار ۲۰ شعبان ۱۲۳۸ ہجری کو وہلی میں قابو پاکر رات کو خواب گاہ میں جا گھسا اور سوتے میں نواب پر تلوار کے تین وار کیے۔ تیسری ضرب میں تلوار ٹوٹ گئی تب وہاں سے نکل کر بھاگا اپنی دانست میں وہ کام تمام کر چکا تھا لیکن نواب کی زندگی باقی تھی کوئی زخم کاری نہ لگا اور بچہ قصا سے نجات پائی جراحت خفیفہ کا ڈاکٹری علاج ہونے لگا تھوڑے عرصہ میں شفائے کلی پاکر غسل صحت کیا۔ میو مجرم فرار ہو کر الور پہنچا اور انعام مقررہ کا خواست گار ہوا ترغیب وہندے اوائے انعام میں حیلہ و حوالہ کرنے لگے اس لیے باہم نزاع پیدا ہو کر راز آشکار ہو گیا میو کو بلونت سنگھ نے گرفتار کر لیا اور اب اس نے مفصل ماجرا بیان کیا اس کے بیان پر ملاد خوشحال دجہاز چیلے اور نند رام دیوان قید کیے گئے رامون خواص فرار ہو کر دہلی کو چلا آیا اور اول نواب احمد بخش خان کی فرودگاہ پر حاضر ہوا نواب نے اس پر توجہ نہ کی اس نے منشی کرم احمد سر شتہ دار جنرل اکٹر لونی ریذیڈنٹ کو کئی لاکھ روپیہ دینا کر کے اپنا ممد و معاون بنایا اور جنرل صاحب سے درستی معاملہ کی شکل نکالی اور وہ اس پر توجہ کرنے لگا یہاں تک کہ ایک دن ملاقات کے وقت نواب احمد بخش خان کو الور کے معاملے اور بلونت کے کام میں سفارش کرنے سے منع کر دیا جب رامون خواص نے اپنے تیر تدبیر کو نشانے کے سر پر پایا تو جنرل صاحب سے کہا کہ بعض مفسدوں نے بلونت سنگھ کو اغوا کر کے الور میں فساد کا نقش جمانا چاہا ہے اگر حکم ہو تو اس کا انسداد و عمل میں آئے انھوں نے اس کو اجازت دے دی رامون خاص نے اتنا سہارا پاتے ہی بنے سنگھ کو لکھ بھیجا کہ بجز بلونت سنگھ کے اس کے دوسرے مددگاروں کا جلد کام تمام کر دیں۔ یہ شہ پاکر بنے سنگھ کے طرف دار راج پوتوں نے جمع ہو کر شہر کے دروازوں کا بندوبست کر لیا اور محل

پرورش کی، بنے سنگھ کو تواکھے سنگھ کی حویلی میں پہنچادیا اور نصف شب سے جنگ وجدال شروع کر دی پہر دن چڑھے بلونت سنگھ زنانے مکان میں چلا گیا اس کے جانب داروں میں سے دس آدمی مارے گئے اور ماجی نے ہتھیار ڈال کر امان چاہی خود تو صحیح و سالم چھوڑ دیئے گئے مگر اسباب سارا چھین لیا گیا ٹھاکر بلی جی، کپتان فاسٹ اور نامی صاحب قید ہوئے اور بلونت سنگھ نظر بند رہا یہ لڑائی الور میں محل راسہ کے نام سے مشہور ہے کہ عین محل کے اندر واقع ہوئی تھی یہ خبر سن کر جنرل اکٹرلونی نے بنے سنگھ کی طرف داری کی اور اس کی حق داری مان کر صدر کو رپورٹ کی اور نواب احمد بخش خان نے اس کے برخلاف بلونت سنگھ کی جانب داری میں گورنر جنرل کی خدمت میں تحریر بھیجی جہاں سے ریذیڈنٹ کو الور کے معاملات میں نواب کی رائے کے ساتھ کام کرنے کی ہدایت ہوئی اس پر مجبوراً ریذیڈنٹ کو نواب سے اتفاق کرنا پڑا چوں کہ اس زمانے میں کلکتے کی طرف کچھ خرخشہ تھا، فوج اس جانب جاتی تھی، اس سبب سے الور کے فیصلے میں تعویق ہوئی نواب احمد بخش خان نے فیروز پور آکر اجارہ تجارا اور پنوکڑہ سے دست کشی اختیار کی۔ ۲۰ محرم ۱۲۳۹ ہجری کو بھوانی بخش عاملی تجارا پر رامون خواص کی طرف سے مقرر ہو کر گیا اور تجارے کے انتظام نے راج سے پھر تعلق پکڑا تھوڑے دنوں کے بعد جنرل اکٹرلونی جے پور (الور؟) کی طرف چلا رامون خواص اور نواب احمد بخش خان ہمراہ تھے۔" (۳۶۸/۳۶۹)

۶۔ "اب احمد بخش خان ساعی تھا کہ نصف ملک بلونت سنگھ کو دیا جائے لیکن بہت سی بحث وگفتگو کے بعد علاقہ الور میں سے چار لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر جو اس وقت الور کی تہائی آمدنی تھی بلونت سنگھ کو مدد معاش کے لیے دی جانی تجویز ہوئی اس لیے دو لاکھ آمدنی کا پرگنہ تجارا

> دپٹو کڑھ وماڈن وکرنے کوٹ ومنڈا ور دیا گیا اور دو لاکھ روپیہ سالانہ
> نقد بعوض کشن گڑھ وکٹھومر مقرر ہو کر اقرار نامے میں یہ شرط لکھی
> گئی کہ اس کے بعد خاص اولاد جاگیر کی حق دار رہے گی اور لاولد ہونے
> کی صورت میں جاگیر واپس راج الور کے شامل ہو جائے گی۔

بہت سے دوسرے ماخذوں کی چھان بین کے بعد اور درج بالا اقتباسات سے جو تلامذہ غالب (دوسرا ایڈیشن) فسانۂ غالب، اصہار الغالب، جلوہ صحیفۂ زرّیں، تاریخ راجگان ہندو قایع راجستھان، تاریخ جدولیہ، مثنوی انبساط وانتشار اور فال آف دی مغل ایمپائر جلد ۴ سے اخذ کیے گئے ہیں مدرج ذیل کوائف مستخرج ہوتے ہیں۔

۱۷۵۲ء کے لگ بھگ	قاسم جان، عالم جان اور عارف جان تین بھائی ہندوستان آئے اور اٹک میں حکومت دہلی کی طرف سے مرزا محمد بیگ صوبیدار اٹک کے یہاں عارضی طور پر ٹھہرے۔ غالباً قاسم جان اور عالم جان چند دنوں کے بعد دہلی کی طرف روانہ ہوگئے مگر عارف جان کئی برس مرزا محمد بیگ کے یہیں ٹھہرے رہے اور کام میں ان کی مدد کرتے رہے۔
۱۷۶۰ء کے لگ بھگ	مرزا محمد بیگ کی بیٹی سے عارف جان کی شادی۔
۱۷۶۲ء کے لگ بھگ	عارف جان کا پہلا بیٹا نبی بخش خاں پیدا ہوا۔
۱۷۶۵ء کے لگ بھگ	عارف جان کا دوسرا بیٹا احمد بخش خاں پیدا ہوا۔
۱۷۶۶ء (شروع سال؟)	عارف جان، شاہ عالم (۱۷۵۹ء۔۱۸۰۶ء) کی طلبی پر دہلی (مع عیال واطفال) چلے آئے قیاس ہے کہ احمد بخش خاں بیس برس کی عمر تک یعنی مولانا فخر الدین چشتی کی وفات تک دہلی ہی میں رہے۔
۱۷۶۶ء (آخر سال؟)	دہلی میں الٰہی بخش خاں، عارف جان کا تیسرا بیٹا پیدا ہوا[۱۳]۔

۱۷۸۵ء ۲۰/ نومبر	مولانا فخر الدین چشتی کی وفات۔ احمد بخش خاں ان سے بیعت تھے۔ ایک دن جب احمد بخش خاں انھیں وضو کرا رہے تھے تو مولانا صاحب نے احمد بخش خاں کو والی میوات کہہ کے پکارا جو بالآخر سچ ثابت ہوا۔
۱۷۸۶ء تا (ستمبر؟) ۱۷۹۹ء	اس بارہ تیرہ سال کے عرصے میں احمد بخش خاں پہلے گوالیار میں بزمرۂ سواراں ملازم ہوئے۔ مگر کسی سبب سے یہ روزگار ہاتھ سے جاتا رہا۔ پھر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ انھیں ایّام میں (اگست ۱۷۹۹ء کے بعد) اجمیر سے دہلی آتے ہوئے راجا بختاور سنگھ والی الور سے ملاقات ہو گئی اور ان کی ملازمت میں الور چلے گئے۔
۱۸۰۱ء۔ ۳۱/ جنوری	جنرل لیک کی ہندوستان (کلکتہ) میں آمد۔
۱۸۰۲ء	جنرل لیک نے کانپور کو اپنا مسکن بنایا اور موسم سرما وہیں گزارا۔
۱۸۰۳ء۔ ۱۶/ ستمبر	دہلی پر انگریزی قبض و تصرف۔
۱۸۰۳ء (اکتوبر؟)	راجا الور کا انگریزوں کے ساتھ معاہدۂ رفاقت۔ احمد بخش خاں الور کی طرف سے انگریزوں کے ہاں وکیل ریاست مقرر۔
۱۸۰۳ء کے لگ بھگ	اپنی بہن کی غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں سے شادی۔
۱۸۰۳ء یکم نومبر	لسوڑی کی لڑائی میں احمد بخش خاں کے ایما پر الور کا فوجی دستہ بھی انگریزوں کی مدد کے لیے شامل۔ احمد بخش خاں بہت بہادری سے لڑے اور ایک انگریز سالار فریزر کی جان بچائی۔ اس نے انھیں انگریزی حکومت

کے نام سفارشی چٹھی دی کہ وہ احمد بخش خاں کی خدمات کا مناسب اعتراف کرے۔ انگریزوں کی فتح۔

۱۸۰۴ء ۲۲/ دسمبر[۱۴] جب فتح کا دربار منعقد ہوا تو لارڈ لیک نے راجا بختاور سنگھ کو ۱۴ محال جاگیر میں عطا کیے۔ احمد بخش خاں کا نام سند میں "فخر الدولہ، دلاور الملک، نواب احمد بخش خاں بہادر، رستم جنگ" لکھوایا اور جاگیر کے طور پر فیروز پور جھرکا، پونا ہانا، بچھور، سانگرس، نگینہ وغیرہ اضلاع عنایت فرمائے۔ پرگنہ لوہارو راجا بختاور سنگھ نے اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ اس طرح سے احمد بخش خاں، نواب احمد بخش خاں والی فیروز پور جھرکا و لوہارو ہوگئے۔

۱۸۰۵ء کے لگ بھگ بہن یعنی زوجہ نصر اللہ بیگ خان کی وفات۔

۱۸۰۶ء (اپریل) نصر اللہ بیگ خان کا انتقال۔

۱۸۰۶ء۔ ۴ مئی احمد بخش خاں کی سفارش پر انگریزوں کی طرف سے نصر اللہ بیگ خاں کے پس ماندگان کا وظیفہ مقرر۔ دس ہزار روپیہ (پہلا شقہ) پانچ ہزار (دوسرا شقہ ۷ جون)

۱۸۰۷ء کے لگ بھگ ایک مقامی عورت مدی سے تعلق

گھاٹا شمس آباد گوڑگانواں کے مسارام نامی میو[۱۵] کی دو بیٹیاں تھیں ایک کا نام موسی تھا اور دوسری کا مدی۔ موسی راجا بختاور سنگھ نے اپنے ہاں رکھ لی اور مدی نواب احمد بخش خاں نے (باقی حال آگے آئے گا)

۱۸۰۹ء بیٹے شمس الدین احمد خاں کی ولادت مدی کے بطن

سے (مدنی کے بطن سے ایک بیٹا ابراہیم علی خاں بھی تھا جو صغر سنی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ شمس الدین خاں کو ۸/ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو ولیم فریزر کے قتل کے جرم میں پھانسی دی گئی تھی۔)

۱۸۱۲ء کے لگ بھگ — برلاس مغل نیاز محمد بیگ کی بیٹی بیگم جان سے شادی۔ (بیگم جان کا انتقال ۴ نومبر ۱۸۶۲ء کو ہوا۔)

۱۸۱۴ء — بیٹے امین الدین احمد خاں کی ولادت بیگم جان کے بطن سے (لگ بھگ اسی زمانے میں راجا بختاور سنگھ کو متاثر کرنے کے لیے مدنی، بہو بیگم کے لقب کے ساتھ باقاعدہ بیوی تسلیم۔ اس طرح شمس الدین خاں کو بھی جانشینی کا حق ہو گیا۔

۱۸۱۵ء ۲۷/ جنوری — مہاراؤ راجا بختاور سنگھ کی وفات (۲۴ سال راج کر کے ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ہم کفو رانی سے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی۔ موسی میواتن سے البتہ ایک بیٹا بلونت سنگھ اور ایک لڑکی چاند کنور چھوڑے۔ موسی نے راجا کے ساتھ ستی ہو کر حق رفاقت ادا کیا۔ اس علاقے میں یہ میواتی دوہے منسوب بہ موسی رانی بھی مشہور ہیں۔

موسی منسا راؤ کی بھلی نبھایو نیہہ
راجا بختاور کے کارن، ہوم دی سب دیہہ
چندن کا ٹاسل چنا، گھالا گو تر گھاؤ
جڑا مول لے جائے گا ماچھیڑی کا راؤ

ماچھیڑی کا راؤ سے مراد راؤ راجا بختاور سنگھ والی الور ہیں۔)

۱۸۱۵ء/مارچ	موسیٰ کے بیٹے بلونت سنگھ اور راجا بختاور سنگھ کے بھتیجے بنے سنگھ میں جانشینی کا جھگڑا۔ نواب احمد بخش خاں نے بلونت سنگھ کا ساتھ دیا۔ دونوں ریاست کے وارث تسلیم۔
۱۸۱۷ء ۳۱/جنوری	الور کے دو پرگنوں تجارا اور ٹپوگڑہ کا ٹھیکہ نواب احمد بخش نے لے لیا۔
۱۸۱۷/۱۸ء	جامع مسجد فیروز پور جھرکہ کی تعمیر "سر اعداے دیں جرید و بگفت کہ خوشا مسجد لطیف و عجیب"[۱۶] ۱۲۳۴ - ۱=۱۲۳۳ھ
۱۸۱۷ء ۲۳/اگست	تقسیم وراثت کے انتظام کے لیے وصیت۔ نواب فیض اللہ بیگ خاں، میرزا الٰہی بخش خاں (معروفؔ) اور لالہ گوردھن داس مختار مقرر۔
۱۸۲۱ء اکتوبر	دوسری بیگم کے بطن سے دوسرے بیٹے ضیاالدین احمد خاں کی ولادت
۱۸۲۲ء نومبر	پہلی وصیت منسوخ۔ اب یہ فیصلہ ہوا (حکومت انگریزی اور دربار الور کی منظوری سے) کہ نواب احمد بخش خاں کے بعد فیرور پور جھرکا کی گدی پر شمس الدین خاں بیٹھے اور لوہارو دوسری بیگم کے دونوں بیٹوں امین الدین احمد خاں اور ضیاالدین احمد خاں کے حصے میں آئے۔
۱۸۲۳ء ۳/مئی	احمد بخش خاں پر قاتلانہ حملہ (مفصل حال اوپر بیان ہو چکا ہے)
۱۸۲۵ء فروری	بیٹے شمس الدین خاں سے ایک دستاویز لکھوائی کہ وہ بطیب خاطر لوہارو کا پرگنہ اپنے دونوں بھائیوں کو دینا

	منظور کرتا ہے۔ بشرطے کہ وہ ہمیشہ اس کی اطاعت کرتے رہیں۔
۱۸۲۵ء نومبر/دسمبر	بھرت پور کی لڑائی میں نواب احمد بخش خاں اپنے فوجی دستے کے ساتھ انگریزوں کی طرف سے شامل۔ اس مہم میں غالب اور ان کے سالے علی بخش خاں بھی ساتھ ہو لیے تھے۔
۱۸۲۵ء ۱۸/دسمبر	بھرت پور پر انگریزوں کی فتح
۱۸۲۶ء اکتوبر	ریاست کے کاروبار سے قطعی دست بردار تاکہ تقسیم وراثت پر اپنی حین حیات ہی عمل درآمد ہوتا دیکھ سکیں۔
۱۸۲۷ء اکتوبر	انتقال۔ غالب کو یہ خبر سفر کلکتہ کے دوران میں مرشد آباد میں ملی۔

نواب احمد بخش خاں کے انتقال، غالب اور ان کے سفر کلکتہ کا ذکر آیا ہے تو باوجودیکہ غالب کی پنشن کے قضیے اور بالآخر مقدمے کی تفصیلات سے سب واقف ہیں۔ ایک اور زاویے سے غالب اور نواب احمد بخش خاں کے تعلقات کو پرکھا جائے۔

۱۔ نواب احمد بخش خاں کو غالب اپنا بزرگ مانتے تھے اور دونوں ہم قوم تھے۔

۲۔ ان کی آپس میں دوہری عزیزداری تھی۔ غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نواب احمد بخش خاں کے بہنوئی تھے اور خود غالب، نواب کے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے داماد تھے۔

۳۔ جب غالب کے چچا اور نواب کے بہنوئی، مرزا نصر اللہ بیگ مرے ہیں (غالب کے والد پہلے ہی مر چکے تھے) تو غالب ۹ برس کے تھے اور ان کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف ۷ برس کے۔

۴۔ سعادت یار خاں رنگین (معروف کے دوست اور نواب کے ہم عصر) لکھتے ہیں کہ نواب احمد بخش خاں نہایت سخی اور فیاض تھے اور کوئی حاجت مند ان کے در سے خالی نہیں پھرتا[۲] تھا۔

۵۔ تقریباً یہی تاثر آزاد کے ان قصوں سے قائم ہوتا ہے جو انھوں نے آب حیات میں معروف اور ذوق کے حوالے سے بیان کیے ہیں [۱۸]۔

اگر نواب احمد بخش خاں ایسے ہی سخی، رحم دل اور فیاض تھے تو اس کا جواز ڈھونڈھنا چاہیے کہ انھوں نے مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے چھ وارثوں میں، جن میں چار عورتیں (ایک ۷۰ برس کی بوڑھی ماں، تین بہنیں) اور دو مرد (غالب اپنی عمر کے نویں سال میں اور مرزا یوسف ساتویں سال میں) تھے، خواجہ حاجی کو چالیس فی صد کا حصہ دار بنا کر اصل وارثوں کی حق تلفی کیوں کی؟ اگر وہ چاہتے تو ۲۰ فی صد یعنی دو ہزار روپیہ [۱۹] سالانہ جو انھوں نے اصل وارثوں کے ۵ ہزار سالانہ میں سے خواجہ حاجی کے نام کرا دیے، اپنی تین لاکھ سالانہ کی جاگیر میں سے بہ آسانی ادا کر سکتے تھے [۲۰]۔

استدراک

(الف) ۱۵/ نومبر ۱۸۰۵ء کی ایک عرض داشت میں دہلی کے ریذیڈنٹ نے انگریزی گورنمنٹ کے سکریٹری کو ایک مکتوب میں لکھا ہے [۲۱]۔

"ان آخر الذکر اضلاع (ہانسی وغیرہ) سے جنھیں ہریانہ کہتے ہیں، مال گزاری کی وصولی کے لیے ایک سرگرم سردار احمد بخش خاں کو بے ضابطہ گھڑسواروں کے رسالے کے ساتھ بھیجا جا رہا ہے۔" خط سے مزید معلوم ہوا کہ ان گھڑسواروں کی کوئی تنخواہ مقرر نہ تھی، کیوں کہ یہ باقاعدہ سپاہی نہیں تھے بلکہ انھیں پورے کام کا بیس روپیہ فی گھڑسوار الاؤنس جو مروج شرح سے کم تھا، دیا جاتا تھا اور اس طرح مال گزاری وصول کرنے کا مطلب یہ تھا کہ گورنمنٹ پر سے بوجھ کم کیا جا سکے اور سپاہیوں اور سرداروں کو مقامی آمدنی میں سے اخراجات کی ادائی کی جا سکے۔

خط میں احمد بخش خاں کو "An active chief" لکھا ہے۔ یعنی ایک

"فعال سردار"۔ اس سے بہ آسانی استنباط کیا جاسکتا ہے کہ احمد بخش خاں ہمہ وقت انگریزوں کے لیے ایسی مہمیں سر کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ گویا یہ ایک طرح سے ان کا پیشہ تھا۔

(ب) "..... علاوہ ازیں تین سردار اور تھے جنھیں چارلس مٹکاف لٹیروں سے تعبیر کرتا ہے۔ کچھ سرداروں جیسے فیروزپور جھرکا کے احمد بخش خاں نے (انگریزوں کی) ہر طرح سے مدد کی۔"

"..... مٹکاف کے ایک دوست نے ۱۸۲۱ء میں انھیں لکھا کہ فیروزپور کے نواب احمد بخش (خاں) نے کم از کم دس دفعہ مجھ سے درخواست کی ہو گی کہ میں اس خاص، مطلب کے لیے آپ کو لکھوں کہ وہ (احمد بخش خاں) آپ کو کتنی احسان مندی اور احترام سے یاد کرتا ہے اور کہ وہ مرتے دم تک اسی طرح یاد کرتا رہے گا۔ جب وہ (احمد بخش خاں) آپ کی بات کرتا ہے تو اس کا ذوق و شوق دیدنی ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جوان مرد (چارلس مٹکاف) جو ایک بوڑھے دانش مند کی سی عقل رکھتا ہے جتنا نظم، ضبط، انصاف اور ایمان داری کے لیے ہم میں مشہور، معروف اور محترم ہے اتنا ہی ان صفات کی موجودگی کی وجہ سے تخریب کاروں کے لیے باعث خوف و ہراس ہے......"

"... احمد بخش خاں اپنی فتوحات سے لطف اندوز ہونے کے لیے بیس سال زندہ رہا اور بہت معتزز رہا۔ وہ مٹکاف کا بڑا مداح تھا جس کی ایک چھوٹے سائز کی تصویر (Portrait) کو وہ اپنی آنکھ کی پتلی سمجھتا تھا۔ اسی لیے جب مٹکاف کا دہلی میں دوبارہ تقرر ہوا تو احمد بخش خاں سے زیادہ اسے کسی نے خوش آمدید [۲۲] نہیں کہا۔..."

انھیں طور طریقوں کی وجہ سے نواب احمد بخش خاں عمر بھر انگریزوں کے منظور نظر بنے رہے۔

حواشی

(۱) تلامذۂ غالب، دوسرا ایڈیشن۔ ص ۵۳۳۔ ۵۳۴

(۲) مرقع الور از منشی محمد مخدوم تھانوی بحوالہ فسانۂ غالب ص ۹۲۔ ۹۳

(۳) فسانۂ غالب ص ۹۳

(۴) اردوئے معلّٰی: ۲۸۹ (بنام نواب امین الدین احمد خان)، نیز فنانس (پی) مارچ ۱۸۶۶ء، (۹۰۶) موجودہ قومی دفتر خانۂ ہند، نئی دلی (بحوالہ فسانۂ غالب ص ۹۴)

(۵) مرقع الور: ۱۲۸۔ ۱۳۲ (بحوالہ فسانۂ غالب، ص ۹۵) اس واقع کو مصنف اصبھار الغالب نواب خسرو مرزا نے اس طرح بیان کیا ہے (ص ۲۶/ ۲۷) "یہ مقام نور باغ آزادپور میں جہاں وہ شب کو باہر گرمی کے موسم کی وجہ سے سو رہے تھے۔ قاتل نے ان پر تلوار سے وار کیا۔ ان کے فوری بیدار ہونے کے باعث صرف ان کا سر زخمی ہوا اور تلوار معروف ظفر تکیہ (جو تکیہ کے نیچے تلوار رکھی جاتی ہے) سے نواب صاحب نے وار کیا، جو اوچھا پڑا اسی وقت پہریدار بھی آگئے، لیکن وہ قاتل اپنے ہمرائیوں کی کثیر تعداد کے ساتھ کیلوں کے درختوں میں جو جائے وقوعہ کے قریب تھے ان کی آڑ میں ہو کر ایسے فرار ہوئے کہ گرفتار نہ ہو سکے۔ یہ وہی نور باغ آزاد پور ہے جو میرے پاس معہ کوٹھی کے تھا۔ کیوں کہ باغ دو مواضعات حدود (آزاد پور اور بھڑولہ میں تھا اور تقسیم میں سالم آزاد پور کا رقبہ اور چوتھائی حصہ بھڑولے کا میرے حصہ میں تھا اور تین چوتھائی حصہ احتشام الدین علی احمد اور شمس الدین علی احمد میرے دونوں خالہ زاد بھائیوں کا تھا۔ اب یہ تمام باغ معہ کوٹھی کے گورنمنٹ نے حاصل کر لیا تمام اشجار کا نام بھی نہیں رہا اور کوٹھی کا کچھ حصہ مسمار کر دیا اور کچھ ابھی باقی ہے مسجد معہ اپنے چاہ کے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ۱۹۴۵ء میں تعمیر کرادی تھی یہ ڈیڑھ سو گز مربع جہاں یہ مسجد اور کنواں واقع ہے میرے وقف کرنے کی درخواست پر چھوڑ دیا گیا جو اب تک موجود ہے.... "

(۶) فسانۂ غالب ص ۹۶

(۷) فسانۂ غالب ص ۹۶

(۸) اصہار الغالب ص ۲۴ (ظاہر ہے فتح اللہ بیگ عرف رجب بیگ فرزند نصر اللہ بیگ خان کا انتقال صغر سنی ہی میں ہو گیا ہو گا کیوں کہ نصر اللہ بیگ خاں یقیناً لاولد (۱۸۰۶ء) مرے۔ فتح اللہ بیگ عرف رجب بیگ کا ذکر بہت کم سننے میں آیا ہے۔

(۹) حضرت مولانا فخر الدین چشتی ۷ ار بیع الاوّل ۱۱۲۶ھ (۲۲ مارچ ۱۷۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ وہ مولانا نظام الدین اورنگ آبادی کے چھوٹے بیٹے تھے جو نگرام کے رہنے والے اور حضرت مخدوم شیخ سعدی کاکوروی کی اولاد میں سے تھے اور اپنے مرشیہ سرگروہِ چشتیہ نظامیہ شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے حکم سے اورنگ آباد میں مقیم ہو گئے تھے۔ مولانا فخر الدین نے خرقۂ خلافت اپنے والد ماجد سے پایا اور انھیں کے ارشاد کے مطابق ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء میں پہلے اجمیر اور پھر دہلی آئے۔ یہ محمد شاہ کا زمانہ تھا، سب ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے خود باشاہ اور وزرا و امرا کمال عقیدت و نیاز سے ان کی مجلس میں حاضر ہوتے۔ ۲۷ جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ / ۷ مئی ۱۷۸۵ء بروز شنبہ بوقتِ عشا واصلِ حق ہوئے۔ ”حق پسند فخر الدین“ اور ”خورشید دو جہانی“ تاریخ ہوئی۔ مہرولی میں حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مجر کے باہر محوِ خواب ہیں۔ مزار مرجع انام ہے۔ ان کے صاجزادے حضرت مولانا غلام قطب الدین بھی بلند پایہ بزرگ تھے۔ وہ بھی ان سے تھوڑی مدت بعد ۱۷ محرم ۱۲۰۰ھ / ۲۰ نومبر ۱۷۸۵ء کو خدا کو پیارے ہو گئے۔ غالب کے دوست (اور ظفر کے پیر) مولانا نصیر الدین عرف میاں کالے، انھیں قطب الدین کے بیٹے تھے۔ ان کی وفات منگل کے دن ۱۵ صفر ۱۲۶۸ھ / ۱۰ دسمبر ۱۸۵۱ء کو ہوئی۔ (تاریخ ”کالے صاحب کو سرخرو پایا“ از مومن حضرت میاں کالے کے بیٹے میاں نظام الدین کا ذکر غالب کے خطوں میں آیا ہے، ان کا انتقال ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء میں ہوا (”خداجو بے دخدادان آہ“ تاریخ ہے۔ (تذکرۂ اہل دہلی، ۲۳۔۲۶ بحوالہ تلامذۂ غالب، ص ۳۸۶)

(۱۰) اصہار الغالب، ص ۲۵

(۱۱) اصبار الغالب شجرہ نمبر ۲ میں ابراہیم علی خاں کا سال وفات ۱۸۳۳ء لکھا ہے۔ قیاس ہے کہ ولادت ۱۸۱۱ء تا ۱۸۱۵ء کسی سال میں ہوئی ہوگی۔ شادی نواب بیگم سے ہوئی تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد نواب بیگم نے احمد قلی خاں سے عقد کر لیا تھا۔

(۱۲) "چراغ دانِ لحد" سے ۱۳۰۱ھ برآمد ہوتا ہے جو ۸۴ / ۱۸۸۳ عیسوی کے مطابق ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ سنگِ مرمر کا ستون بعد میں نصب کیا گیا ہوگا۔

بعد میں ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں نے بھی ایک قطعۂ تاریخ کہا تھا۔ (جلوۂ صحیفہ زرّیں ص ۱۴۸)

شد بفردوس بریں ہر گاہ آرامش گزیں — فخر دولت عزوین نواب احمد بخش خاں
خوش بیا سود از برحسن کمال اعتقاد — زیبائی مرشد خود فخر دین قطب زمان
نیر رخشاں ضیاء الدین احمد پور او — جست سال انتقال والدِ جنت مکان

گفت دل اندر غم و بے سرو پا گشتہ اند
فخر و دولت ملک و ملت جود و حشمت ارج و شان

۱۲۴۳ھ

(۱۳) بزمِ داغ۔ ص ۱۰۹ پر داغؔ کی زبانی درج ہے کہ:

"عارف جان اور قاسم جان نے شہزادہ علی گوہر کو بنگال کی مہم میں مدد دی تھی جس کے صلے میں قاسم جان کو مشرف الدولہ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ۱۷۷۱ء میں بادشاہ (شاہ عالم ثانی) دہلی میں آیا تو قاسم جان بھی ساتھ آیا۔"

(۱۴) مثنوی انبساط و انتشار ص ۱۹، "دور حکمرانی ۲۲ دسمبر ۱۸۰۴ء تا نومبر ۱۸۲۲ء"۔ کیا فتح کا دربار سال بھر کے بعد منعقد ہوا تھا؟ ہو سکتا ہے کہ سند یا فرمان کا نفاذ ۲۲ دسمبر ۱۸۰۴ء سے ہوا ہو۔

(۱۵) مثنوی انبساط و انتشار ص ۲۱

(۱۶) مثنوی انبساط و انتشار ص ۲۰

(۱۷) اصل عبارت مرزا الٰہی بخش خاں معروفؔ کے حال میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱۸) جاگیر غالب،از: پرتھوی چندر، ص ۲۵۳
(۱۹) جاگیر غالب،از: پرتھوی چندر، ص ۲۵۳
(۲۰) غالب کے بعض خطوں میں نواب احمد بخش خاں کا ذکر ملتا ہے مگر وہ بیشتر پنشن کی حق تلفی کے بارے ہی میں ہیں، جس سے نواب صاحب کے بارے میں کوئی اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ ترجمہ نواب احمد بخش خان میں کوئی اضافہ کرتے ہیں۔ اس لیے انھیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔
(۲۱) Raja Ram Mohan Roy and the last moghals از جتندر کمار ماجو مدار، مطبوعہ ۱۹۳۹ء، ص ۴۳
(22)Twilight of the moghals by P. spear p. 92- 157- 182- 183.

مرزا افضل بیگ

مرزا افضل بیگ، غالبؔ کے بہنوئی مرزا اکبر بیگ کے چھوٹے بھائی تھے۔ اپریل / مئی ۱۸۳۱ء کی کسی تاریخ کو (تفصیل سے آگے آئے گی) دلّی میں فوت ہوئے۔ صاحب "کارنامہ سروری" نے لکھا ہے کہ ضعیف ہو گئے تھے اور انتقال کیا۔ مگر یہ ضعیفی کوئی ستر اسّی سالہ بوڑھے کی سی نہ ہو گی کیوں کہ وہ مرتے دم تک اکبر شاہ ثانی کی طرف سے انگریزی دربار کلکتہ میں سفیر رہے۔ اس لیے قیاس ہے کہ بوقت مرگ ان کی عمر ساٹھ سال یا اس سے کچھ زیادہ ہو گی۔ اس طرح ولادت کا سال ۱۷۷۰ء کے آس پاس متعین کیا جا سکتا ہے۔

انگریزی دربار کلکتہ میں سفیر مقرر ہونے کے وقت تک ان کے والد اور دوسرے اہل خاندان دلّی میں نہیں رہتے تھے۔ تقرر کے بعد دلّی میں سکونت اختیار کی۔ مرزا مقرب الدولہ، معزز الملک، دلاور جنگ کے خطابات سے سرفراز ہوئے اور ۱۸۲۷ء میں کلکتہ بھیج دیے گئے تاکہ وہاں انگریزوں سے تصفیہ امور سلطنت کا حل نکال سکیں۔ سفیر مغلیہ بننے سے پہلے مرزا افضل بیگ کی زندگی کا حال بہت کم کھلتا ہے۔ صرف ایک خط سے جو ولی عہد اسلطنت مغلیہ نے ۶/اپریل ۱۸۳۰ء[۲] سے کچھ کسی تاریخ کو بنام گورنر جنرل لکھا تھا کچھ روشنی پڑتی ہے۔

اکبر شاہ ثانی کے گیارہ بیٹے تھے۔ ان میں بہادر شاہ ظفر سب سے بڑے[۳] تھے۔ ولی عہد نھیں کو ہونا چاہیے تھا اور انگریز بھی یہی چاہتے تھے مگر اکبر شاہ ثانی ان کے بجائے اپنے تیسرے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولی عہد بنانے کے خواہاں تھے۔ جب مرزا جہانگیر کا ۳۱ سالی کی

عمر میں ۱۸۲۱ء میں انتقال ہو گیا تو بادشاہ نے پھر ظفر کو نظر انداز کر کے چوتھے بیٹے مرزا سلیم کو ولی عہد بنانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ ولی عہد وقت (ظفر) کو قوی گمان تھا کہ اس سازش میں مرزا افضل بیگ، راجا سوہن لال، مرزا سلیم تینوں ملوث ہیں۔ لہٰذا ولی عہد نے اس خط کے ذریعے باقی امور کے علاوہ راجا سوہن لال اور مرزا افضل بیگ کے خاندان اور ملازمت کا کچا چٹھا بھی بیان کیا ہے۔ خط کے ضروری حصوں کا ترجمہ ذیل میں درج ہے۔

"...... اس شاہی گھرانے کی تاریخ اور حالات زمانۂ تیمور سے..... تا دم تحریر آپ کو اچھی طرح معلوم ہیں۔ اب کچھ ایسے حالات در پیش ہیں کہ جن کی وجہ سے صبر و قناعت کا دامن چھوٹ چھوٹ گیا ہے۔ مختصر تفصیل آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کیوں کہ جناب والا کے سوا چار دانگ عالم میں اب میرا کوئی دوست اور محافظ نہیں ہے...... بادشاہ سلامت سہل انگاری، کوتاہ نظری اور عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے اپنے ماتحت عہدیداروں، دفتری نظام اور دیگر امور کی طرف توجہ نہیں دیتے ہیں۔ انھیں حالات کے زیر اثر سوہن لال جو محض ایک معمولی تھا اور جس کا باپ بھی مدت تک باورچی خانے میں ملازم رہا تھا اور جس کی خاندانی رذالت ہر کہ و مہ پر اظہر من الشمس ہے اب بادشاہ کا مختار بن بیٹھا ہے اور یہ افضل بیگ نامی ایک شخص کے ساتھ ملا ہوا ہے جو دلی دربار میں میرے خلاف سازش میں شریک ہے (سوہن لال نے) مرزا سلیم کی وساطت سے بادشاہ کو راضی کر کے افضل بیگ کو ریذیڈنسی (کلکتہ) میں سرکار انگلیشیہ کا وکیل مقرر کروا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ افضل بیگ کسی بھی طرح اس مرتبے کا آدمی نہیں کہ وہ ایسے اہم عہدے پر مقرر کیا جاسکے کیوں کہ اس کے آبا و اجداد ایک رذیل خاندان سے تھے اور ان کا شمار شاہی خاندان کے نمک خواروں میں کبھی نہیں رہا ہے۔ افضل بیگ خود وکالت کا عہدہ پانے سے پہلے بطور داروغہ عمارات اشرف بیگ خان کا تیس روپے

ماہوار کا ملازم تھا۔ مزید بر آں اسے اشرف بیگ خاں کی ملازمت سے مکاری اور ریشہ دوانی کے متعدد الزامات کی بنا پر برطرف کردیا گیا تھا۔ گورنر جنرل کے دربار میں ایسے انسان کی بطور وکیل اچانک سربلندی شاہی دربار کے قواعد کے قطعاً خلاف ہے۔ اس کے علاوہ ایسے رذیل شخص کو عہدیدار بنانا اور اسے کلکتہ میں انگریزی سرکار کے افسروں کی سطح پر لا بٹھانا خود انگریزی دربار کی شان کم کرنے کے مترادف ہے اور میری سمجھ بوجھ کے مطابق قطعاً نامناسب ہے۔ کلکتہ پہنچتے ہی افضل بیگ نے اپنی ضرر رساں فطرت کا اظہار ایک بنگالی رام موہن رائے سے تعلق بڑھا کر کیا اور دبیر الدولہ خواجہ فرید خاں کا دوست ثابت کر کے بادشاہ سلامت کے روبرو پیش کیا...... دراصل دبیر الدولہ اور رام موہن رائے کی دوستی ایک جعل ہے...... افضل بیگ نے وکالت کے عہدے پر مستقل حیثیت سے قائم رہنے کی توقع میں مرزا سلیم کے دماغ میں ولی عہدی کی امیدیں روشن کر رکھی ہیں اور میرے متعلق ایسے کلمات استعمال کیے ہیں جو کوئی استعمال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہ چرچا ادنیٰ و اعلیٰ سب کی زبان پر ہے۔ ...... مجھے یقین ہے کہ افضل بیگ جو میرے خلاف ایسی ہتک آمیز اور ضرر رساں باتیں پھیلا رہا ہے اور ہر طرح سے میری ذلت و رسوائی پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے۔ آپ کے دربار سے مناسب سزا [۵] پائے گا۔

دلی کے ریذیڈنٹ کے خط[۶] بنام گورنر جنرل مورخہ ۲۴/اگست ۱۸۲۷ء سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ تاریخ سے پہلے مرزا افضل بیگ کا تقرر بطور وکیل سلطنت مغلیہ عمل میں آچکا تھا اور وہ کلکتہ میں اپنا عہدہ سنبھال چکے تھے۔ اسی خط کے ہمراہ ایک شُقّہ بادشاہ کی طرف سے تھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"ہمارا فرماں بردار خادم افضل بیگ جو جناب والا کی حاضری بجالاتا

> ہے۔ ہمارے دلی مقاصد اور التجاؤں کو آپ کے گوش گزار کرے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ معاملات اس کی نمائندگی میں قاعدے سے طے ہو جائیں گے۔ یہ امر ہمارے لیے مسرت کا باعث ہو گا اور انگریزی سرکار کے لیے باعثِ فخر۔"

آگے چل کر بادشاہ نے پھر (شہزادہ ابو ظفر یعنی بہادر شاہ کی حق تلفی کر کے) مرزا سلیم کے حقوق منوانے کی کوشش کی ہے:

> "ہماری خواہش ہے کہ "بخشی کل" یا کمانڈر ان چیف کا عہدہ جو ہم نے اپنے لائق فرزند مرزا محمد سلیم بہادر کے تفویض کر رکھا ہے اب مستقل طور پر انھیں (شہزادہ سلیم کو) دے دیا جائے۔ اس سلسلے میں ہمارے فرزند نے جنابؐ والا کی خدمت میں پہلے ہی تحریر کر دیا ہے......"

جب غالب پنشن کی بحالی کے سلسلے میں کلکتہ میں مقیم تھے (فروری ۱۸۲۸ء سے اکتوبر ۱۸۲۹ء تک) تو بھی مرزا بہمہ وقت وہیں کے تھے۔ پھر وہیں کلکتہ میں رہ کر انھوں نے مشہور دانشور رام موہن رائے کو دلّی دربار سے راجا کا خطاب دلوا کر غیر تصفیہ شدہ امور کی پیروی کے لیے انگلینڈ بھیجا۔ راجہ موہن رائے ۱۵/ نومبر ۱۸۳۰ء کو البین (Albion) نامی جہاز سے عازم انگلستان ہوئے[۸]۔ مرزا افضل بیگ دلّی واپس آ گئے۔

مرزا افضل بیگ کی شادی حکیم مومن خان مومنؔ کی بھانجی سے ہوئی تھی[۹]۔ تاہم کلکتہ سے واپسی پر وہ اپنے ساتھ ایک خوب صورت بنگالن کو بھی لے آئے تھے (ہو سکتا ہے کہ پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہو) یہ وہی عورت ہے جسے مرزا افضل بیگ کی وفات کے بعد مرزا عباس بیگ (مرزا افضل بیگ کے بھتیجے) بھگا کر پنجاب کی طرف لے گئے تھے اور گھر والوں سے دائمی ناراضی مول لے لی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنگالن کوئی بازاری عورت یا طوائف نہ تھی بلکہ افضل بیگ کی باقاعدہ بیوی تھی۔ کیوں کہ صاحب "کارنامہ سروری" اس عورت کو مرزا عباس بیگ کی چچی

کہتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں ہر گھر کے ساتھ ایک نہ ایک طوائف کا نام جڑا رہتا تھا مگر یہ گھر (مرزا عبداللہ بیگ پسر مرزا افضل بیگ کا) ایسا تھا جس میں طوائف کا نام نہیں آیا تھا[۱۰]۔

مرزا افضل بیگ کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام مرزا عبداللہ بیگ عرف مرزا دولا تھا۔ ان کا مکان محلہ چوڑی والان کی میگزین والی گلی میں [۱۱] تھا۔ ممکن ہے یہ مکان مرزا افضل بیگ نے خریدا ہو یا بنوایا ہو اور اپنی عمر کی آخری سانسیں یہیں لی ہوں۔

مرزا عبداللہ بیگ کی آٹھ اولادیں تھیں۔ چھ بیٹے [۱۲] اور دو بیٹیاں۔ جب مرزا افضل بیگ کے انتقال کے بعد آمدنی کے سب راستے بند ہو گئے تو مرزا عبداللہ بیگ سخت پریشان ہوئے کہ اب اتنے بڑے کنبے کی پرورش کیسے ہو گی۔ آخر ایک روز وہ اپنے والد کے سرٹیفکیٹ لے کر انھیں وائسرائے نے دیے تھے دتی کے ریذیڈنٹ کے پاس ملازمت مانگنے کے لیے گئے۔ ریذیڈنٹ نے از راہ مہربانی اقبالہ سے کانپور تک کی ڈاک گاڑی کا انتظام ان کو دے دیا۔ جا بجا سینکڑوں چوکیاں قائم کی گئیں۔ مرزا عبداللہ بیگ افسران چوکیوں کی دیکھ بھال کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس طرح خاندان کی حالت سنبھل گئی [۱۳]۔

آج تک مرزا افضل بیگ کے نام غالب کا کوئی خط نہیں ملا۔ تاہم ان کا ذکر دوسروں کے خطوں میں کثرت سے ملتا ہے۔ ایسے ہی خطوں سے مرزا افضل بیگ کے انتقال کی خبر بھی ملتی ہے۔ مرزا احمد بیگ خان (طپان) کو لکھتے ہیں:

"فلاں [۱۴] بیگ زندہ نیست ورنہ خونہا خوردی......"

"حضرت اکبر شاہ از روز خلعتِ فلاں بیگ بہ انواعِ عوارض مبتلا بود۔ پریروز کہ چہار شنبہ آخری صفر بود غسل صحت کردہ اند، لہٰذا توانند و دماغ شنیدن ملتمسات ندارند [۱۵]۔"

(متفرقات غالب طبع دوم ص ۹۳۔۹۴۔ خط ۲۲)

دن اور مہینہ نہ سہی مگر اس خط سے مرزا افضل بیگ کا سالِ وفات متعین ہو جاتا ہے۔

ہمیں یہ معلوم ہے کہ راجا رام موہن رائے کے ۱۵/نومبر ۱۸۳۰ء کے عازم انگلستان ہونے تک نہ صرف مرزا زندہ تھے بلکہ اس کے بعد وہ دِلّی واپس آئے اور اپنے ساتھ ایک حسین بنگالی بیوی بھی لائے تھے۔ ماہ صفر چوں کہ ۱۸۳۰ء میں جولائی، اگست میں پڑتا ہے اس لیے جولائی۔ اگست ۱۸۳۰ء یا اس سے پہلے کے کسی انگریزی مہینے میں مرزا کا وفات پانا درست نہیں ہو سکتا۔ مرزا احمد بیگ خاں طپاں کا انتقال ۵/مارچ (شوال) ۱۸۳۴ء سے کچھ روز قبل ہوتا ہے[16]۔ اس لیے مرزا کا انتقال ۱۸۳۴ء کے جولائی (صفر) میں بھی ممکن نہیں کیوں کہ اوپر کے خط سے ظاہر ہے کہ طپاں کی زندگی ہی میں مرزا انتقال کر چکے تھے۔ اب رہ گئے ۱۸۳۱ء/۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۳ء تو انھی سالوں کے صفر کے آخری چار شنبے سے پہلے ان کا انتقال ہوا۔ تاریخیں جن سے پہلے مرزا افضل بیگ کا انتقال ہوا۔ یہ ہو سکتی ہیں ۲۳صفر ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۳/اگست ۱۸۳۱ء، ۲۶صفر ۱۲۴۸ھ مطابق ۲۵/جولائی ۱۸۳۲ء اور ۲۸صفر ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۷/جولائی ۱۸۳۳ء۔

بادشاہ (اکبر شاہ ثانی) کو مرزا کے انتقال کا سخت رنج ہوا اور وہ طرح طرح کے عارضوں میں مبتلا رہنے لگے۔ خدا خدا کر کے شفا پائی اور ۳/اگست ۱۸۳۱ء کو غسل صحت فرمایا۔ مگر بیماری اس قدر شدید اور لمبی تھی کہ عرصے تک ناتوانی رہی۔ مرزا کا انتقال بادشاہ کے غسل صحت سے چند ماہ پہلے ہوا ہوگا۔ کیوں کہ بیماری لمبی تھی۔ سال وفات ۱۸۳۱ء، ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۳ء میں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے۔ میں نے اکبر شاہ ثانی اور انگریزوں کے مابین ۱۸۳۰ء تا ۱۸۳۳ء تمام منتخب خط و کتابت دیکھی[17] ہے۔ اس میں ۱۸۳۱ء کے سوائے بادشاہ کے بیمار پڑنے کا ذکر اور کسی سال میں نہیں۔ ۵/جولائی ۱۸۳۱ء کو دِلّی کا ریذیڈنٹ انگریزی گورنمنٹ کے سکریٹری کو لکھتا ہے کہ کل دربار میں بادشاہ کے مختار نے مجھے ایک شُقہ منجانب بادشاہ (یہ شُقہ پہلے سے دفتر میں آیا رکھا تھا) پڑھ کر سنایا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس بیماری کے علاوہ جس میں بادشاہ مستعد ہے وہ ذہنی کوفت میں بھی گرفتار ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بادشاہ ۱۰/جون ۱۸۳۱ء سے پہلے کے بیمار تھے کیوں کہ یہ شُقہ ریذیڈنٹ کے دفتر میں ۱۰جون کو موصول ہوا تھا۔ مرزا افضل بیگ کی موت بادشاہ کی بیماری سے پہلے ہوئی تھی.....

اس لیے یہ کہنا جائز ہے کہ مرزا افضل بیگ کا انتقال اپریل / مئی ۱۸۳۱ء میں کبھی ہوا ہوگا۔

غالب کو شبہ ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ مرزا افضل بیگ پنشن کے مقدمے میں مدد کے بجائے ان کی مخالفت کررہے ہیں اور اپنے خواہر زادوں (یعنی اپنے بہنوئی خواجہ حاجی کی اولاد) کی مدد کررہے ہیں۔ غالب کلکتے کے قیام کے دوران مرزا افضل بیگ کے (شاید مصلحتہً) شاکی نہیں ہوئے تھے۔ لیکن واپسی کے بعد انھیں اپنا شدید مخالف سمجھنے لگے تھے۔

اس سلسلے میں غالب کے مندرجہ ذیل خطوط ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

متفرقات غالب طبع دوم خط نمبر ۱۴ بنام مولوی سراج الدین احمد

متفرقات غالب طبع دوم خط نمبر ۲۲ بنام مرزا احمد بیگ خان

متفرقات غالب طبع دوم خط نمبر ۳۶ بنام مرزا ابوالقاسم خان

یکم فروری ۱۸۲۸ء کے ایک خط[18] میں جو ایکٹنگ چیف سکریٹری نے دہلی کے ریذیڈنٹ کو لکھا تھا تحریر ہے۔

"...... دی رائٹ آنریبل گورنر جنرل[19] ان کونسل نے ارادہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ان تمام مطالبات کا جواب دے جو شاہ دہلی نے گورنر جنرل کو اس وقت پیش کیے تھے جب کہ وہ شہر دہلی کے دورے پر تھے......"

جس خط کے ذریعے یہ مطالبات پیش کیے گئے تھے وہ شاہ دہلی کی طرف سے مرزا افضل بیگ نے لکھا تھا۔ اس خط پر وصولی کی تاریخ ۱۴/ اگست ۱۸۲۷ء[20] درج ہے۔ مگر اصل خط اس تاریخ سے بہت پہلے یعنی ۱۵/ جون ۱۸۲۷ء کو معرض تحریر میں آیا تھا۔ اس سے یہ بات صاف طور پر مستخرج ہوتی ہے کہ اس وقت تک مرزا افضل بیگ وکیل مقرر نہیں ہوئے تھے کیوں کہ اس خط میں دوسرے امور کے ساتھ بادشاہ کے کلکتہ میں اپنا وکیل مقرر نہ کرسکنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ ظاہر ہے کہ مرزا افضل بیگ کا تقرر بطور وکیل ۱۵/ جون ۱۸۲۷ء اور ۲۴/ اگست ۱۸۲۷ء کے مابین کسی بھی تاریخ کو ہوا۔

چوں کہ خط (عرض داشت) تاریخی ہے اور مرزا افضل بیگ سے منسوب ہے اس لیے پورا متن درج کیا جاتا ہے۔

از طرف
افضل بیگ:۔ بخدمت...... فارسی سکریٹری (سرکار انگلیشیہ)
موصولہ:۔ ۱۴/ اگست ۱۸۲۷ء

آپ نے گفتگو کے دوران میں یہ کہا تھا کہ شاہ دہلی کے مطالبات کے کاغذوں کے آرٹیکل حکومت اعلیٰ (Supreme Govt.) نے ریذیڈنٹ کی رہنمائی کے لیے تیار کیے ہیں اس لیے نہیں کہ انھیں بادشاہ کے سامنے پیش کیا جائے۔ میرے خیال میں بہت سے اسباب کی بنا پر یہ امر واضح ہے کہ یہ آرٹیکل بادشاہ سلامت ہی کے روبرو پیش کرنے کی نیت سے تیار کیے گئے تھے۔ اول یہ کہ سب جانتے ہیں کہ ریذیڈنٹ حکومت اعلیٰ ہی کے ایماء پر کام کرتا ہے اور کہ جب سرڈی اکٹرلونی نے دستخط کر کے کاغذات مذکورہ باضابطہ تقسیم کیے تھے تو اس نے اعلان کیا تھا کہ یہ دستاویزات بادشاہ اور حکومت برطانیہ کے مابین ایک اقرار نامہ (Agreement) کے مترادف ہیں اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر ان کو بادشاہ نے قبول فرمالیا تو وہ پولس کا محکمہ بھی اپنی ماتحتی میں لے لے گا۔ جس کا انتظام پہلے ہندوستانی طریق پر کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۰۶ء میں اقرار نامے کی وصولی کے بعد پولس کو ریذیڈنٹ کے انتظام میں دے دیا گیا۔ دوم یہ کہ ہز مجیسٹی شاہ عالم کی درخواست پر یہ قرار پایا تھا کہ بارہ لاکھ روپے کی وظیفے کی رقم میں سے ستر ہزار روپے سات مذہبی تہواروں کے موقع پر ادا کیے جایا کریں گے اور یہ ہمیشہ کیا جاتا رہا ہے۔ سوم یہ کہ اقرار نامے کی رو سے ریذیڈنٹ سنگین مقدمات میں آخری فیصلے کے لیے مقدمے کے کاغذات بادشاہ کی خدمت میں بھیجا کرے گا۔

جب ۱۸۰۹ء میں تیرہ ہزار روپے کی رقم بطور زائد لگان بادشاہ کی پنشن میں اضافہ کی گئی تھی تو اس سے مزید ثابت ہو گیا تھا کہ اقرار نامے کی

حیثیت برقرار ہے کیوں کہ اس میں یہ شرط رکھی گئی تھی کہ اگر بادشاہ کے نامزد علاقوں سے زائد لگان وصول ہوگا تو اسے بادشاہ کی پنشن میں ملادیا جائے گا۔ اگر حکومت اعلیٰ نے اس اضافے سے متعلق بادشاہ سے کسی قسم کی دست برداری حاصل کی ہوتی تو بے شک سابقہ اقرار نامے منسوخ سمجھے جاتے۔ چوں کہ ایسا نہیں ہوا اس لیے جہاں تک زائد لگان کا تعلق ہے بادشاہ سلامت بھی "پیش کش" کے اس اضافے سے دست بردار نہ ہوں گے۔ چہارم یہ کہ ضابطہ نمبر ۴ (۱۸۰۵ء) دفعہ ۲ اور ۴ میں یہ تحریر ہے کہ آنریبل کمپنی کے ضابطوں کا جو دو آب میں نافذ ہیں دہلی نیز اس کی نواحی بستیوں پر اطلاق نہیں ہوگا کیوں کہ یہ علاقے شاہی خاندان کے ذاتی مصارف کے لیے وقف ہیں۔ یہ ضابطہ اب بھی چھپا ہوا موجود اور نافذ ہے جب تک حکومت اعلیٰ اپنے ان وعدوں اور اقرار ناموں کو منسوخ نہیں کرتی۔ بادشاہ کے ساتھ یہ قول و قرار پوری قوت کے ساتھ قائم سمجھے جائیں گے۔

یہ سوال کہ بادشاہ نے ۱۸۰۹ء سے آج تک اس پر زور کیوں نہیں دیا تو بادشاہ نے ہمیشہ یہ امید کی ہے کہ ریذیڈنٹ بہ ذات خود حکومت اعلیٰ کے سامنے ان امور کو پیش کرے گا یا وہ بادشاہ سلامت کو ان مطالبات کے پیش کرنے کے لیے نمایندہ مقرر کرنے کی اجازت دے گا۔ اس سلسلے میں ۱۸۲۳ء میں مسٹر راس نے دو خط سرکار کو تحریر کیے لیکن چوں کہ یہ صاحب دہلی میں بہت تھوڑا عرصہ مقیم رہے اس لیے یہ مسئلہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پایا۔ بعدۂ بادشاہ سلامت اس سلسلے میں ایک بیان تیار کر ہی رہے تھے کہ انھوں نے گورنر جنرل بہادر کے بالائی صوبوں کے دورے کی خبر سنی اور جب بادشاہ کو یہ تحقیق ہو گیا تو انھوں نے فوراً ایک خصوصی ملاقات کی

خواہش ظاہر کی جو طرفین کے لیے باعث اطمینان ہو اور اس میں گورنر جنرل سے دریافت کیا جائے کہ کن وجوہات کی بنا پر اقرار ناموں پر ابھی تک عمل نہیں کیا گیا اور پھر جب یہ میٹنگ منعقد ہوئی اور بے حد تشفی بخش رہی تو بعد میں کس کے دخل در معقولات سے یہ بے نتیجہ ثابت ہوئی؟ بادشاہ سلامت نے کاغذات کو خود اپنے شاہی ہاتھوں سے حوالے کیا تھا تاکہ آپ کوئی موافق جواب دیں۔ آخر میں اب انگریزی سرکار کے لیے یہ نہ کہنے دیجیے کہ اتنے علاقوں اور خزانوں کو اتنی جنگوں اور قضیوں کے بعد حاصل کر کے اب وہ انتہائی معمولی رسالداروں تک کو تو لاکھوں روپے بطور عوضانہ ادا کر سکتی ہے مگر اپنے قول و قرار پر قائم نہیں رہ سکتی جو اس نے تمام رعایا کے روبرو شہنشاہ ہندوستان سے کیے تھے اور بادشاہ کو معمولی لگان ادا کرنے میں پس و پیش کرتی ہے جو ان مقامات سے حاصل ہوتا ہے جو بادشاہی شہر (دہلی) سے متعلق ہیں۔"

حواشی

(۱) شہزادہ ابو ظفر جو بعد میں بہادر شاہ ظفر کے نام سے موسوم ہوئے۔
(۲) Raja Ram Ray Mohan Roy & The last moghals. از:
ڈاکٹر جتندر کمار ماجو مدار (مطبوعہ ۱۹۳۹ء۔ خط نمبر ۱۱۷۔ ص ۲۰۷)
(۳) بہادر شاہ ظفر ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) کو منگل کے دن ایک ہندو نژاد عورت مسماۃ لال بائی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ (بہادر شاہ ظفر از امیر احمد علوی۔ ص ۸)
(۴) بہادر شاہ ظفر پر دو تہمتوں کا اندراج ملتا ہے۔ امیر احمد علوی نے (بہادر شاہ ظفر ص ۲۱) لکھا ہے کہ "اکبر شاہ ثانی کہتے تھے کہ ابو ظفر میرا بیٹا ہی نہیں ہے۔" Twilight of the moghals. P. Spear. Page7. لکھتے ہیں کہ اکبر شاہ ثانی نے بہادر شاہ ظفر پر یہ الزام لگایا کہ اس نے شاہ عالم کے عہد میں ایک بیگم کی آبرو لوٹی تھی۔ لہٰذا وہ ولی عہدی کے لائق نہیں۔
(۵) اس خط کا اصل مقصد صرف یہ تھا کہ شہزادہ (بہادر شاہ) ظفر کو انگریز باقاعدہ ولی عہد سلطنت مغلیہ تسلیم کیے رہیں۔ چنانچہ ۱۶ جولائی ۱۸۳۰ء کے خط میں گورنر جنرل نے نہ صرف یہ کہ شہزادہ ابو ظفر (بہادر شاہ ظفر) کو بدستور ولی عہد کے لقب سے مخاطب کیا ہے بلکہ یقین دلایا ہے کہ شہزادے کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی اور کہ اسے قطعاً کوئی اندیشہ دل میں نہ لانا چاہیے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ "۱۸۳۴ء یا اس کے بعد انگریزوں نے بہادر شاہ کو ولی عہد مقرر کیا" درست نہیں۔
(۶) Raja Ram Mohan Roy & The last moghals ص ۱۷۱، خط ۹۳
اس کے علاوہ ریذیڈنٹ دہلی، اکبر شاہ ثانی اور مرزا سلیم کے چند خطوں میں بھی مرزا افضل بیگ کا ذکر موجود ہے مگر وہ چنداں اہم نہیں اس لیے ان خطوں کو اس مضمون کے لیے نظر انداز کیا گیا ہے۔
(۷) غالب ۱۹ یا ۲۱ / فروری ۱۸۲۸ء (سہ شنبہ ۲ شعبان یا ۴ شعبان ۱۲۴۳ھ) کو کلکتہ پہنچے اور ۲۹ / نومبر ۱۸۲۹ء (یکم جمادی الثانی ۱۲۴۵ھ) کو دلی واپس آگئے۔ اکتوبر ۱۸۲۹ء میں کلکتہ

سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے ہوں گے۔

(۸) گریٹ مین آف انڈیا۔ ص ۵۰۰

(۹) "اردو" اپریل ۱۹۳۱ء۔ خواجہ امان مرحوم، از فرحت اللہ بیگ، ص ۲۵۵

(۱۰) "اردو" اپریل ۱۹۳۱ء۔ خواجہ امان مرحوم، از فرحت اللہ بیگ، ص ۲۵۹

(۱۱) "اردو" اپریل ۱۹۳۱ء۔ خواجہ امان مرحوم، از فرحت اللہ بیگ، ص ۲۵۵

(۱۲) ان میں سے مرزا حشمت اللہ بیگ مرزا فرحت اللہ بیگ کے والد تھے گویا مرزا افضل بیگ مرزا فرحت اللہ بیگ کے دادا تھے۔

(۱۳) "اردو" اپریل ۱۹۳۱ء۔ ص ۲۹۰

(۱۴) یعنی مرزا افضل بیگ۔

(۱۵) اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا احمد بیگ خان طپاں چاہتے تھے کہ مرزا افضل بیگ کے انتقال کے بعد انھیں کلکتہ میں دہلی کی طرف سے سفیر مقرر کر دیا جائے۔

(۱۶) غالب مولوی سراج الدین احمد کو ۵/ ۶ مارچ پنج شنبہ (پانزدہ مارچ غالب کا سہو ہے) ۱۸۳۴ء کے دن لکھتے ہیں کہ اچانک ۱۱ شوال (۱۰ شوال چاہیے پنج شنبہ کی صبح کو آپ کے خط سے مرزا احمد بیگ خاں طپاں کے انتقال کی خبر ملی۔ نساخ نے مرزا احمد بیگ کا سال وفات ۱۸۳۴ء صحیح لکھا ہے۔ متفرقات غالب طبع دوم ص ۲۰ پر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم فرماتے ہیں "غالب یکم جمادی الثانی روز یکشنبہ کو کلکتہ سے دہلی پہنچے تھے۔ تقریباً ساڑھے تین مہینے کے بعد مولوی سراج الدین احمد کے خط سے مرزا احمد بیگ خان کے انتقال کی خبر ملی ... " ظاہر ہے یہاں جناب ادیب مرحوم سے سہو ہوا ہے مرزا احمد بیگ خان ۱۸۳۰ء میں نہیں بلکہ ۱۸۳۴ء میں مرے۔

(۱۷) Raja Ram Mohan Roy and last moghals از جتندر کمار ماجومدار مطبوعہ ۱۹۳۹ء۔ ص ۲۰۷ تا ۲۳۴

(۱۸) راجا رام موہن رائے اور آخری مغل، ص ۱۸۴ خط نمبر ۹۹

(۱۹) یہاں لارڈ ایمہرسٹ (Amherst) مراد ہیں کیوں کہ ۱۸۲۳ء سے ۱۸۲۸ء تک وہی گورنر جنرل تھے۔

(۲۰) راجا رام موہن رائے اور آخری مغل، ص ۱۹۱

آب حیات میں ترجمۂ غالب (مع حواشی)

ڈاکٹر صفدر آہ مرحوم لکھتے ہیں:

"آب حیات میں جو مواد تحقیق پیش کیا گیا ہے، اگر اسے ہٹالیا جائے تو معلوم ہوگا جیسے سورج ڈوب گیا اور اردو تحقیق کی دنیا میں ایک تاریکی پھیل گئی ہے"۔

یہ بات اس حد تک یقیناً صحیح ہے کہ جو مواد بلحاظ مقدار و تفصیل "آب حیات" میں پیش کیا گیا ہے، اس سے پہلے وہ کسی تذکرے میں نہیں ملتا، مگر اس سے یہ مراد لینا کہ یہ مواد تمام و کمال تحقیق شدہ ہے، درست نہیں اور یہ مان لینا بھی غلط ہے کہ آزاد نے ہر شاعر کے بیان میں اس غیر جانب داری سے کام لیا ہے جو ایک محقق کے لیے اشد ضروری ہے۔

آب حیات میں شامل ترجمۂ غالب کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے، آزاد کا مسحور کن طرز نگارش اور بے پناہ قوت انشاپردازی قاری کو باور کرادیتے ہیں کہ آزاد، غالب کے بے حد مداح ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے ان کے بیان ایسے ہیں جن میں ایک نہ ایک چٹکی بھی لی گئی ہے، جو تعریف کے بجائے غالب کی تحقیر ہی کا باعث بنتی ہے۔

آزاد نے غالب کے سوانح بیشتر غالب کے خطوں کی بنیاد پر لکھے ہیں اور کچھ بیان اپنے استاد ذوق کے حوالے سے بھی دیے ہیں۔ مگر تحقیقی لحاظ سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ خامیوں سے پر ہیں ایسی غلطیوں کی نشان دہی میں نے حواشی میں کر دی ہے۔

مولانا آزاد کے اس مضمون سے میں نے دو مقامات حذف کر دیے ہیں کیوں کہ ان کا

برقرار رکھنا محض کتاب کی ضخامت بڑھانا تھا۔ تاہم اس حذف سے نفس مضمون پر قطعی کوئی اثر نہیں پڑا۔

ا۔ انتخاب غزلیات غالب جو آزاد نے مضمون کے آخر میں دیا ہے اور

۲۔ مرزا عبداللہ خاں اوج کے حاشیے کا وہ حصہ جس کا تعلق غالب سے نہیں۔

چوں کہ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم (ولادت ۱۰/جون ۱۸۳۰ء) ایک طرح سے غالب کے اولیں سوانح نگار ہیں اس لیے امید کرتا ہوں کہ ان کی تحریر کی دل کشی اور اہمیت میں یہ حواشی مزید اضافے کا باعث ہوں گے۔ (کالی داس گپتا رضا بمبئی)

نجم الدولہ دبیر[۲] الملک مرزا اسد اللہ[۳] خاں غالب

مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر[۴] کا تھا اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے[۵] تھے لیکن چوں کہ تصانیف ان کی اردو میں بھی چھپی ہیں اور جس طرح امراء ہندو رؤساء اکبر آباد میں علو خاندان سے نامی اور میرزا سے فارسی ہیں، اسی طرح اردوئے معلی کے مالک ہیں اس لیے واجب ہوا کہ ان کا ذکر اس تذکرہ میں ضرور کیا جاوے۔ نام اسد اللہ تھا۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے۔ جھجر میں کوئی فرمایہ سا شخص اسد تخلص کرتا تھا۔ ایک دن اس کا مقطع کسی نے پڑھا۔

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب
ارے او شیر رحمت ہے خدا کی[۶]

سنتے ہی اس تخلص سے جی بیزار ہو گیا۔ کیوں کہ ان کا ایک یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام الناس کے ساتھ مشترک حال ہونے کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۲۵ھ و ۱۸۲۸ء میں اسداللہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلص[۷] اختیار کیا۔ لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا، انھیں اسی طرح رہنے دیا۔

خاندان کا سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ جب تورانیوں کا چراغ کیانیوں کی ہوائے اقبال سے گل ہوا تو غریب خانہ برباد، جنگلوں، پہاڑوں میں چلے گئے۔ مگر جوہر کی

کشش نے تلوار ہاتھ سے نہ چھوڑی۔ سپاہ گری ہمت کی بدولت روٹی پیدا کرنے لگی۔ سینکڑوں برس کے بعد پھر اقبال ادھر جھکا اور تلوار سے تاج نصیب ہوا۔ چنانچہ سلجوقی خاندان کی بنیاد انھی میں سے قائم ہوگئی۔ مگر اقبال کا جھکنا جھوکا ہوا ہے۔ کئی پشتوں کے بعد اس نے پھر رخ پلٹا اور سمرقند میں جس طرح اور شرفا تھے اس طرح سلجوقی شہزادوں کو بھی گھروں میں بٹھادیا۔

مرزا صاحب کے دادا گھر چھوڑ کر نکلے۔ شاہ عالم کا زمانہ تھا کہ دہلی میں آئے یہاں بھی سلطنت میں کچھ نہ رہا تھا۔ صرف پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے شاہی دربار میں عزت پائی اور اپنی لیاقت اور خاندان کے نام سے پہاسو کا ایک پرگنہ سیر حاصل ذات اور رسالے کی تنخواہ میں لیا۔ شاہ عالم کے بعد طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوا۔ وہ علاقہ بھی نہ رہا۔ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ مرحوم کے دربار میں پہنچے۔ چند روز بعد حیدر آباد میں جاکر نواب نظام علی خان بہادر کے سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے رہے[۸]۔ کئی برس کے بعد ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں یہ صورت بھی بگڑی۔ وہاں سے گھر آئے اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی لڑائی میں مارے گئے[۹]۔

اس وقت مرزا کی ۵ برس کی عمر تھی۔ نصراللہ بیگ خاں حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ انھوں نے دُرِّ یتیم کو دامن میں لے لیا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا تو صوبہ داری کمشنری ہوگئی۔ ان کے چچا کو سواروں کی بھرتی کا حکم ہوا اور ۴سو سوار کے افسر مقرر ہوئے، ۱۷سو روپیہ مہینہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر۔ سونگ سونسہ کے پرگنہ پر حین حیات مقرر ہوگئی۔

مرزا چچا کے سایہ میں پرورش پاتے تھے۔ مگر اتفاق یہ کہ مرگ ناگہانی میں وہ مرگئے[۱۰]۔ رسالہ برطرف ہوگیا۔ جاگیر ضبط ہوگئی۔ بزرگوں نے لاکھوں روپیہ کی جائیداد چھوڑی تھی۔ قسمت سے کس کا زور چل سکتا ہے۔ وہ امیر زادہ جو شاہانہ دل و دماغ لے کر آیا تھا۔ اسے ملک سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کرکے غریبانہ حال سے زندگی بسر کرنی پڑی۔ بہت تدبیریں اور وسیلے درمیان آئے مگر سب کھیل بن بن کر بگڑ گئے[۱۱]۔ چنانچہ اخیر

میں کسی دوست نے انھیں لکھا تھا کہ نظام دکن کے لیے قصیدہ کہہ کر فلاں ذریعہ سے بھیجو، اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں۔ ۵ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ ۹ برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میں میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں ۱۰ ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے نہ دیے مگر تین ہزار روپیہ سال، ان میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال فقط۔ میں نے سرکار انگریزی میں غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی اور استرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے۔ میرا حق دلانے پر ریذیڈنٹ معزول ہو گئے۔ سکرتر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے بعد ایک زمانہ کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ ان کے ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری ۵۰۰ روپیہ سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ ۷ برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی، ایسے طالع مرتی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں والی دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع جائے گی۔ والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اگر اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی۔ ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔

غرضے کہ نواب احمد بخش خان بہادر کی تقسیم [12] سے مرزائے مرحوم نالاں ہو کر ۱۸۳۰ء میں کلکتہ [13] گئے اور گورنر جنرل سے ملنا چاہا۔ وہاں دفتر دیکھا گیا۔ اس میں سے ایسا کچھ معلوم ہوا کہ اعزاز خاندانی کے ساتھ ملازمت ہو جائے اور ۷ پارچہ خلعت تین رقم جیغہ مرصع مالائے مروارید۔ ریاست دو دمانی کی رعایت سے مقرر ہوا۔

غرض مرزا کلکتہ سے ناکام پھرے اور ایام جوانی ابھی پورے نہ ہوئے تھے کہ بزرگوں کا سرمایہ تمام کر کے دلی میں آئے [14]۔ یہاں اگرچہ گزران کا طریقہ امیرانہ شان سے تھا اور امیروں سے امیرانہ ملاقات تھی۔ مگر اپنے علو حوصلہ اور بلند نظری کے ہاتھوں سے تنگ رہتے تھے۔ پھر بھی طبیعت ایسی شگفتہ پائی تھی کہ ان دقتوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے اور

ہمیشہ ہنس کھیل کر غم غلط کر دیتے تھے کیا خوب فرمایا ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے [15]

جب دلّی تباہ ہوئی تو زیادہ تر مصیبت پڑی۔ ادھر قلعہ کی تنخواہ جاتی رہی۔ ادھر پنشن بند ہو گئی اور انھیں رامپور [16] جانا پڑا۔ نواب صاحب سے ۲۰، ۲۵ برس کا تعارف تھا۔ یعنی ۵۵ء میں ان کے شاگرد [17] ہوئے تھے اور ناظم تخلص قرار پایا تھا۔ وہ بھی گاہے گاہے غزل بھیج دیتے تھے۔ یہ اصلاح دے کر بھیج دیتے تھے۔ کبھی کبھی روپیہ بھی آتا تھا۔ اس وقت قلعہ کی تنخواہ جاری سرکاری پنشن کھلی ہوئی تھی۔ ان کی عنایت فتوح غیبی گنی جاتی تھی۔ جب دلّی کی صورت بگڑی تو زندگی کا مدار اس پر ہو گیا۔ نواب صاحب نے ۵۹ء سے سو روپیہ مہینہ کر دیا اور انھیں بہت تاکید سے بلایا۔ یہ گئے تو تعظیم خاندانی کے ساتھ دوستانہ و شاگردانہ بغل گیر ہو کر ملاقات کی اور جب تک رکھا کمال عزت کے ساتھ رکھا۔ بلکہ سو روپیہ مہینہ ضیافت کا زیادہ کر دیا۔ مرزا کو دلّی کے بغیر چین کہاں؟ چند روز کے بعد رخصت ہو کر پھر وہیں چلے آئے۔ چوں کہ پنشن سرکاری بھی جاری ہو گئی تھی [18]۔ اس لیے چند سال زندگی بسر کی۔

آخر عمر میں بڑھاپے نے بہت عاجز کر دیا۔ کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا۔ نقش تصویر کی طرح لیٹے رہتے تھے۔ کسی کو کچھ کہنا ہوتا تھا تو لکھ کر رکھ دیتا تھا۔ وہ دیکھ کر جواب دے دیتے تھے۔ خوراک دو تین برس یہ رہ گئی تھی کہ صبح کو پانچ سات بادام کا شیرہ۔ ۱۲ بجے آب گوشت۔ شام کو ۴ کباب تلے ہوئے۔ آخر ۷۳ برس کی عمر ۱۸۶۹ء ۱۲۸۵ھ میں جہان فانی سے انتقال کیا اور بندہ آثم نے تاریخ لکھی۔ آہ غالب بمرد [19]۔ مرنے سے چند روز پہلے یہ شعر کہا تھا اور اکثر یہی پڑھتے رہتے تھے ؎

دم واپسین برسر راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

مرزا صاحب کے حالات اور طبعی عادات

اس میں کچھ شک نہیں کہ مرزا اہل ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ مگر علوم درسی

کی تحصیل طالب علمانہ طور سے نہیں کی اور حق یو چھو تو یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ایک امیر زادہ کے سر سے بچپن میں بزرگوں کی تربیت کا ہاتھ اٹھ جائے اور وہ فقط طبعی ذوق سے اپنے تئیں اس درجۂ کمال تک پہنچائے وہ کیسی طبع خداداد لایا ہوگا جس نے اس کے فکر میں یہ بلند پروازی، دماغ میں یہ معنی آفرینی، خیالات میں ایسا انداز لفظوں میں نئی نراش اور ترکیب میں انوکھی روش پیدا کی۔ جابجا خود ان کا قول ہے اور حقیقت میں لطف سے خالی نہیں کہ زبان فارسی سے مجھے مناسبت ازلی ہے ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میری طبیعت کو اس زبان سے ایک قدرتی لگاؤ ہے۔ مفتی میر عباس صاحب کو قاطع برہان بھیج کر خط لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں "دیباچہ اور خاتمہ میں جو کچھ لکھ آیا ہوں۔ سب سچ ہے۔ کلام کی حقیقت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ نگارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ گزارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں۔ لیکن پچپن برس سے محو سخن گزاری ہوں۔ مبدۂ فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا مزہ بھی ابدی لایا ہوں۔

ہرمزد[20] نام ایک پارسی ژند و پاژند کا عالم تھا۔ اس نے اسلام اختیار کیا اور عبد الصمد اپنا نام رکھا۔ ایام سیاحت میں ہندوستان کی طرف آنکلا اور مرزا سے بھی ملاقات ہوئی۔ اگرچہ ان کی عمر اس وقت ۱۴ برس کی تھی۔ مگر وہی مناسبت ازلی طبیعت میں تھی۔ جس نے اسے کھینچا اور دو برس تک گھر میں مہمان رکھ کر اکتساب کمال کیا۔ اس روشن ضمیر کے فیضان صحبت کا انھیں فخر تھا اور حقیقت میں یہ امر فخر کے قابل ہے۔

میں نے چاہا کہ مرزا صاحب کی تصویر الفاظ و معانی سے کھینچوں۔ مگر یاد آیا کہ انھوں نے ایک جگہ اسی رنگ روغن سے اپنی تصویر آپ کھینچی ہے۔ میں اس سے زیادہ کیا کر لوں گا۔ اس کی نقل کافی ہے۔ مگر اول اتنا سن لو کہ مرزا حاتم علی مہر تخلص ایک شخص آگرہ میں تھے۔ مرزا کے اواخر عمر میں اس ہم وطن بھائی سے خط و کتابت جاری ہوئی۔ وہ ایک وجیہ اور طرح دار جوان تھے۔ ان سے دید و ادید نہ ہوئی تھی۔ لیکن کسی زمانہ کی ہم وطنی، شعر گوئی، ہم مذہبی اور اتحاد خیالات کے تعلق سے شاید کسی جلسہ میں مرزا نے کہا کہ مرزا حاتم علی مہر کو سنتا ہوں کہ طرح دار آدمی ہیں۔ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ انھیں جو یہ خبر پہنچی تو مرزا کو خط لکھا اور اپنا حلیہ

بھی لکھا۔ اب اس کے جواب میں جو مرزا آپ اپنی تصویر کھینچتے ہیں اسے دیکھنا چاہیے "بھائی تمہاری طرح داری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا۔ جس زمانہ میں کہ وہ حامد علی خاں کی نوکر تھی اور اس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا۔ تو اکثر مغل سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اس نے تمہارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے۔ بہر حال تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ (تمہاری) ڈاڑھی خوب گھنی ہوئی ہے وہ مزے یاد آگئے کیا کہوں جی پر کیا گزری۔ بقول شیخ علی حزیں ؎

تادست رسم بوز دم چاک گریباں
شرمندگی از خرقہ پشینہ ندارم

(میرے) جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار (میں نے) مِسّی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں (یعنی دہلی میں) ایک وردی ہے، عام ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑہ، منہ پر ڈاڑھی، سر پر بال۔ میں نے جس دن ڈاڑھی رکھی۔ اسی دن سر منڈایا۔" اس فقرہ سے بھی معلوم ہوا کہ اپنا انداز سب سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ لباس ان کا اکثر اہل ولایت کا ہوتا تھا۔ سر پر اگرچہ کلاہ پاپاخ نہ تھی۔ مگر لمبی ٹوپی سیاہ پوستین کی ہوتی تھی اور ایسا ضرور چاہیے تھا۔ کیوں کہ وہ فارسی نویسی کو نہ فقط ذوق بلکہ عشق دلی کے ساتھ نباہتے تھے اور لباس و گفتار کی کچھ خصوصیت نہیں۔ وہ اپنی قدامت کی ہر بات سے محبت رکھتے تھے۔ خصوصاً خاندان کے اعزازوں کو ہمیشہ جانکاہ عرق ریزیوں کے ساتھ بچاتے رہے۔ اس اعزاز پر کہ جوان کے پاس باقی تھا۔ دو دفعہ آسمانی صدمہ پہنچے۔ اول جب کہ چچا کا انتقال ہوا۔ دوسرے جب ۵۷ء میں ناکردہ گناہ بغاوت کے جرم میں پنشن کے ساتھ کرسی دربار اور خلعت بند ہوا۔ اردوے معلّی

میں بیسیوں دوستوں کے نام خط ہیں کوئی اس کے ماتم سے خالی نہیں۔ ان کے لفظوں سے اس غم میں خون ٹپکتا ہے اور دل پر جو گزرتی ہوگی وہ تو خدا ہی کو خبر ہے۔ آخر پھر ان کی جگہ اور اپنا حق لیا اور بزرگوں کے نام کو قائم رکھا۔

۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام از سر نو منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب جو کئی سال تک اضلاع شمال و مغرب کے لفٹننٹ گورنر بھی رہے۔ اس وقت سکریٹری تھے۔ وہ مدرسین کے امتحان کے لیے دتی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ مہینے کا ایک مدرس عربی ہے۔ ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔ لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے۔ ان میں مرزا کا نام بھی آیا۔ مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی۔ مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسب دستور قدیم صاحب سکریٹری استقبال کو تشریف لائیں۔ جب کہ نہ وہ ادھر سے آئے۔ نہ یہ ادھر سے گئے اور دیر ہوئی تو صاحب سکریٹری نے جمعدار سے پوچھا وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں ۲۱ چلتے۔ انھوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے۔ میں کیوں کر جاتا۔ جمعدار نے جاکر پھر عرض کی۔ صاحب باہر آئے اور کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں بہ حیثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس تعظیم کے مستحق نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں۔ نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں۔ صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے۔ صاحب موصوف نے مومن خاں صاحب کو بلایا۔ ان سے کتاب پڑھوا کر سنی اور زبانی باتیں کر کے اسی روپیہ تنخواہ قرار دی۔ انھوں نے سو روپیہ سے کم منظور نہ کیے۔ صاحب نے کہا سو روپے لو تو ہمارے ساتھ چلو۔ ان کے دل نے نہ مانا کہ دتی کو ایسا سستا بیچ ڈالیں۔ مرزا کے کھلے ہوئے دل اور کھلے ہوئے ہاتھ نے ہمیشہ مرزا کو تنگ رکھا مگر اس تنگ دستی میں بھی امارت کے تمغے قائم تھے۔ چنانچہ اردوئے معلی کے اکثر خطوط سے یہ حال آئینہ ہے۔ مرزا تفتہ ۲۲ اپنے شاگرد رشید کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ سو روپیہ کی ہنڈی وصول کرلی۔ ۲۴ روپیہ داروغہ کی معرفت اٹھے تھے وہ دیے ۵۰ روپیہ محل میں بھیج دیے۔ ۲۶ باقی رہے وہ بکس میں رکھ لیے۔ کلیان سودا لینے بازار گیا ہے۔

جلد آگیا تو آج ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے، بھائی بری آبنی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔

کدارناتھ آپ کا دیوان تھا۔ اسی عالم میں ماہ بہ ماہ آکر چھاپانٹ دیتا تھا۔ آپ کہیں سفر میں گئے ہیں تو اس کے لیے خطوط میں بار بار احکام بھیجتے ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ہنڈوی میں ۱۲دن کی میعاد تھی۔ ۶دن گزر گئے تھے ۶دن باقی تھے۔ مجھ کو صبر کہاں۔ متی کاٹ کر روپے لے لیے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہوگیا۔ آج میرے پاس سینتالیس روپے نقد بکس میں ہیں اور ۴ بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانہ میں موجود ہیں۔ الحمد اللہ علی احسانہ۔

ایک اور جگہ اپنی بیماری کا حال کسی کو لکھتے ہیں۔ ”محل سرا اگرچہ دیوان خانہ کے بہت قریب ہے پر کیا امکان جو چل سکوں۔ صبح کو ۹ بجے کھانا یہیں آجاتا ہے پلنگ پر کھسل پڑا ہاتھ منھ دھو کر کھانا کھایا۔ پھر ہاتھ دھوئے کلی کی۔ پلنگ پر جا پڑا۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگتی رہتی ہے اٹھا اور حاجتی میں پیشاب کر لیا اور پڑ رہا۔“

نواب الٰہی بخش خان مرحوم کی صاحبزادی سے مرزا صاحب کی شادی ہوئی اور اس وقت ۱۳ برس کی عمر تھی۔ باوجودیکہ اوضاع واطوار آزادانہ رکھتے تھے۔ لیکن آخر صاحب خاندان تھے۔ گھرانے کی لاج پر خیال کر کے بی بی کا پاس خاطر بہت مد نظر رکھتے تھے۔ پھر بھی اس قید سے کہ خلاف طبع تھی جب بہت دق ہوتے تھے تو ہنسی میں ٹالتے تھے۔ چنانچہ دوستوں کی زبانی بعض نقلیں بھی سنیں اور ان کے خطوط سے بھی اکثر جگہ پایا جاتا ہے ایک قدیمی شاگرد سے ایسے معاملات میں بے تکلفی تھی۔ اس نے امراؤ سنگھ نام ایک اور شاگرد کی بی بی کے مرنے کا حال مرزا صاحب کو لکھا اور یہ بھی لکھا کہ ننھے ننھے بچے ہیں۔ اب اور شادی نہ کرے تو کیا کرے؟ پھر بچے کون پالے؟ اس شخص کی ایک بی بی پہلے مرچکی تھی۔ یہ دوسری بی بی مری تھی۔ اب حضرت اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔ ”امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دوبار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو

کیوں بلا میں پھنستا ہے۔"

جب ان کی پنشن کھلی تو ایک اور شخص کو لکھتے ہیں۔ "تجھ کو میری جان کی قسم اگر میں تنہا ہوتا تو اس وجہِ قلیل میں کیسا فارغ البال و خوشحال رہتا۔" مرزا صاحب نے فرزندان روحانی یعنی پاک خیالات اور عالی مضامین سے ایک انبوہ بے شمار اپنی نسل میں یادگار چھوڑا۔ مگر افسوس کہ جس قدر ادھر سے خوش نصیب ہوئے اسی قدر فرزندان ظاہری کی طرف سے بے نصیب ہوئے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ سات [۲۳] بچے ہوئے۔ مگر برس برس کے پس و پیش میں سب ملک عدم کو چلے گئے۔ ان کے بی بی کے بھانجے الٰہی بخش خان مرحوم کے نواسے زین العابدین خان تھے اور عارف تخلص کرتے تھے۔ عارف [۲۴] جوان مر گئے اور دو ننھے ننھے بچے یادگار چھوڑے۔ بی بی ان بچوں کو بہت چاہتی تھیں۔ اس لیے مرزا نے انھیں اپنے بچوں کی طرح پالا۔ بڑھاپے میں انھیں گلے کا ہار کیے پھرتے تھے۔ جہاں جاتے وہ پالکی میں ساتھ ہوتے تھے۔ ان کے آرام کے لیے آپ بے آرام ہوتے تھے۔ ان کی فرمائشیں پوری کرتے تھے۔ افسوس کہ مرزا کے بعد دونوں جوان مر گئے۔ نواب احمد بخش خاں مرحوم کے رشید فرزند مرزا صاحب کی تکلیف نہ دیکھ سکتے تھے۔ کمال کی دولت ان سے لیتے تھے، دنیا کی ضرورتوں میں انھیں آرام دیتے تھے۔ چنانچہ نواب [۲۵] ضیاء الدین خان صاحب شاگرد ہیں۔ نواب [۲۶] امین الدین خان مرحوم والی لوہارو بھی آداب خوردانہ کے ساتھ خدمت کرتے تھے۔ نواب علاء الدین خان والی حال اس وقت ولی عہد تھے۔ بچپن سے شاگرد ہیں۔ چنانچہ مرزا صاحب نواب [۲۷] علاء الدین خان صاحب کو لکھتے ہیں۔ "میاں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈہ گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمھاری پھوپھی [۲۸] کہتی ہیں کہ ہائے دبی ہائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیوں کر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں میں بیٹھا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک

بھائی سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیرین جو الٰہی بخش خان مرحوم کا مسکن تھا۔ میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی۔ مرمت ہو جائے گی۔ پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمھارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک یہ مرمت کا احسان میرے پایان عمر میں اور بھی سہی۔ غالب۔"

مرزا کثیر الاحباب تھے۔ دوستوں سے دوستی کو ایسا نباہتے تھے کہ اپنائیت سے زیادہ ان کی دوست پرستی خوش مزاجی کے ساتھ رفیق ہو کر ہر وقت ایک دائرہ شرفا اور رئیس زادوں کا ان کے گرد کھاتی تھی۔ انھی سے غم غلط ہوتا تھا اور اسی میں ان کی زندگی تھی۔ لطف یہ کہ دوستوں کے لڑکوں سے بھی وہی باتیں کرتے تھے۔ جو دوستوں سے۔ ادھر ہونہار جوانوں کا مودب بیٹھنا۔ ادھر سے بزرگانہ لطیفوں کا پھول برسانا۔ ادھر سعادت مندوں کا چپ مسکرانا اور بولنا تو حدِ ادب سے قدم نہ بڑھانا ادھر پھر بھی شوخی طبع سے باز نہ آنا۔ ایک عجیب کیفیت رکھتا تھا۔ بہر حال انھی لطافتوں اور ظرافتوں میں زمانے کی مصیبتوں کو ٹالا اور ناگوار کو گوارا کر کے ہنستے کھیلتے چلے گئے۔ چنانچہ میر مہدی، میر سرفراز حسین، نواب یوسف مرزا وغیرہ اکثر شریف زادوں کے لیے خطوط اردوئے معلیٰ میں ہیں جو کہ ان جلسوں کے فوٹو گراف دکھاتے ہیں۔

زمانہ کی بے وفائی نے مرزا کو وہ فارغ البالی نصیب نہ کی جو ان کے خاندان اور کمال کے لیے شایاں تھی اور انھی دونوں باتوں کا مرزا کو بہت خیال تھا، لیکن اس کے لیے وہ اپنے جی کو جلا کر دل تنگ بھی نہ ہوتے تھے بلکہ ہنسی میں اڑا دیتے تھے۔ ان دونوں باتوں کی سند میں دو[29] خط نقل کرتا ہوں۔ ایک خط میر مہدی صاحب کے نام ہے کہ ایک شریف عالی خاندان ہیں اور ان کے رشید شاگرد ہیں۔ دوسرا خط منشی ہرگوپال صاحب تفتہؔ تخلص کے نام ہے جن کا ذکر خیر مجملاً پہلے لکھا گیا ہے۔

"میر مہدی تم میری عادات کو بھول گئے۔ ماہِ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رامپور کیوں کر رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی میں ایسے انداز سے

چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آپہنچا۔ یک شنبہ کو غرۂ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خان کی مسجد میں جاکر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں شب کو مسجد جامع جاکر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جاکر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ واہ کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔ اب اصل حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادثات ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا۔ ۔۔۔ ورنہ گرمی برسات وہیں کاٹتا۔ اب بشرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔ قرار واویہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے۔ سو روپیہ مجھے ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ اب میں جو وہاں گیا تو سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رامپور ہوں تو دو سو روپیہ مہینہ پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپیہ۔ بھائی! سو دو سو میں کلام نہیں کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ وشاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے۔ وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ پس بہر حال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے۔ کمی کا شکوہ کیا؟ انگریز کی سرکار سے دس ہزار روپیہ سال ٹھہرے۔ اس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپیہ سال۔ ایک صاحب نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپیہ سال۔ عزت میں وہ پایا جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے بنا رہا۔ خان صاحب بسیار مہربان و دوستانہ القاب خلعت سات پارچہ اور جیغہ و سرپیچ و بالائے مروارید۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی، ناظر، حکیم کسی سے توقیر کم نہیں مگر فائدہ وہی قلیل۔

سو میری جان! یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھا ہوں ٹٹی لگی ہوئی ہے ہوا آرہی ہے پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا یہ باتیں کرلیں۔" خط بنام منشی ہر گوپال تفتہ۔ بس اب تم اسکندر آباد میں رہے کہیں اور کیوں جاؤ گے بینک گھر کا روپیہ کھا چکے ہو۔ اب کہاں سے کھاؤ گے۔ میاں! نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے نہ تمہارے سمجھنے کی جگہ ہے ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے جو ہوتا ہے

وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے۔ کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدل[31] خوب کہتا ہے ؂

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام
زین ہو سہاگزر یا نگزر میگزرو

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید۔ نہ رنجور ہوں نہ تندرست۔ نہ خوش ہوں نہ ناخوش نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جیے جاتا ہوں۔ باتیں کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر بھی رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ہے جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت ہے۔

مرزا کے تمام خاندان کا اور بزرگوں کا مذہب سنت و جماعت تھا۔ مگر اہل راز اور تصنیفات سے بھی ثابت ہے کہ ان کا مذہب شیعہ تھا اور لطف یہ تھا کہ ظہور اس کا جوش محبت میں تھا نہ کہ تبرا و تکرار میں۔ چنانچہ اکثر لوگ انھیں نصیری کہتے تھے اور وہ سن کر خوش ہوتے تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؂

منصور فرقۂ علی اللہیان منم
آوازۂ انا اسد اللہ برافگنم

تمام اقربا اور حقیقی دوست سنت و جماعت تھے لیکن ان کی اپنائیت میں کسی طرح کی دوری نہ معلوم ہوتی تھی۔ مولانا فخرالدین کے خاندان کے مرید بھی تھے۔ دربار اور اہل دربار میں کبھی اس معاملہ کو نہیں کھولتے تھے اور یہ طریقہ دہلی کے اکثر خاندانوں کا تھا۔

تصنیفات اردو میں تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا ایک دیوان انتخابی ہے کہ ۱۸۴۹ء میں مرتب ہو کر چھپا[32]۔ اس میں کچھ تمام اور کچھ ناتمام غزلیں ہیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ غزلوں کے تخمیناً ۱۵۰۰ شعر، قصیدوں کے ۱۶۲ شعر مثنوی ۳۳ شعر، متفرقات قطعوں کے ۱۱۱ شعر، رباعیاں ۱۶، دو تاریخیں جن کے ۴ شعر۔ جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس سے ہزاروں درجہ عالم معنی میں کلام بلند ہے بلکہ اکثر ایسے اعلیٰ درجۂ رفعت پر واقع ہوئی ہیں کہ ہمارے نارساذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب ان شکایتوں کے چرچے زیادہ ہوئے تو اس

ملک بے نیازی کے بادشاہ نے کہ اقلیم سخن کا بھی بادشاہ تھا اپنی غزل کے ایک شعر سے سب کو جواب دے دیا۔

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی ۳۳

اور ایک رباعی بھی کہی۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنوران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل ۳۴

ایک دن استاد مرحوم سے مرزا صاحب کیا نداز نازک خیالی کا اور فارسی ترکیبوں کا اور لوگوں کی مختلف طبیعتوں کا ذکر تھا۔ میں نے کہا بعض شعر صاف بھی نکل جاتا ہے تو قیامت ہی کر جاتا ہے۔ فرمایا، خوب! پھر کہا کہ جو مرزا کا شعر ہوتا ہے اس کی لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ شعر ان کے میں تمھیں سناتا ہوں۔ کئی متفرق شعر پڑھے۔ ایک اب تک خیال میں ہے۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا ۳۵

اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے بیشہ کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چوں کہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انھیں طبعی تعلق تھا، اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں۔ لیکن جو شعر صاف نکل گئے ہیں، وہ ویسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔ اہل ظرافت بھی اپنی نوک جھونک سے چوکتے نہ تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مرزا بھی مشاعرہ میں تشریف لے گئے حکیم آغا جان ۳۶ عیش ایک خوش طبع شگفتہ مزاج شخص تھے۔ غزل طرحی میں یہ قطعہ پڑھا۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے!
مزا کہنے کا جب ہے ایک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اسی واسطے اواخر عمر میں نازک خیالی کے طریقے کو بالکل ترک کر دیا تھا۔ چنانچہ دیکھو اخیر کی غزلیں صاف صاف ہیں۔ دونوں کی کیفیت جو کچھ ہے معلوم ہو جائے گی۔ سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بہت بڑا تھا۔ یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب کہ فاضل بے عدیل تھے، ایک زمانہ میں دہلی کی عدالت ضلع میں سر شتہ دار تھے۔ اسی عہد میں مرزا خان عرف مرزا خانی صاحب کوتوال شہر تھے۔ وہ مرزا قتیل صاحب کے شاگرد تھے۔ نظم، نثر فارسی اچھی لکھتے تھے۔ غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا۔ اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ خیر ہوا سو ہوا۔ انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں [۳۷]۔

عود ہندی [۳۸]۔ کچھ تقریظیں کچھ اور نثریں اور خطوط ہیں۔ اکثر خطوں میں ان لوگوں کے جواب ہیں۔ جنھوں نے کسی مشکل شعر کے معنی پوچھے یا کوئی امر تحقیق طلب فارسی یا اردو کا دریافت کیا۔

اردوئے معلّی [۳۹]۔ ۱۲۸۵ھ۔ ۱۸۶۹ء چند شاگردوں اور دوستوں نے جس قدر اردو کے خطوط ان کے ہاتھ آئے ایک جگہ ترتیب دیے اور اس مجموعہ کا نام مرزا نے خود اردوئے معلّی رکھا۔ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا آپ سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں۔ مگر کیا کریں کہ ان کی باتیں بھی خاص فارسی کی، خوش نما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصع ہوتی

تھیں۔ بعض فقرے کم استعمال اور ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں تو وہ جانیں۔ یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کیا "جگر خون کن اتفاق ہے۔ اب ورنگ درزی کی تقصیر معاف کیجئے۔ پس چاہیے کوئل کی آرامش کا ترک کر نا اور خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا یہ رتبہ میری ارزش کے فوق ہے۔ سرمایۂ نازش قلم رو ہندوستان ہو۔" بعض جگہ خاص محاورۂ فارسی کا ترجمہ کیا ہے جیسے میر اور سودا وغیرہ استادوں کے کلام میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ انھی خطوں میں فرماتے ہیں۔ اس قدر عذر چاہتے ہو۔ یہ لفظان کے قلم سے اس واسطے نکلا کہ عذر خواستین جو فارسی کا محاورہ ہے وہ اس باکمال کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ ہندوستانی عذر کرنا یا عذر معذرت کرنی بولتے ہیں۔ نظر اس دستور پر اگر دیکھو تو مجھے اس شخص سے خس برابر علاقہ عزیزداری کا نہیں۔ یہ بھی ترجمہ نظر برین ضابطہ کا ہے۔ منشی نبی بخش تمھارے خط نہ لکھنے کا گلہ رکھتے ہیں۔ گلہ باور ند وشکوہ باداور ند فارسی کا محاورہ ہے۔ کیوں مہاراج کول میں آنا! منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا۔ یاد آوردن خاص ایران کا سکہ ہے۔ ہندوستانی یاد کرنا بولتے ہیں۔ جو آپ پر معلوم ہے وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔ ہر چہ بر شما منکشف است بر من مخفی نماند۔

ان خطوں کی طرز عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں ان میں خوب ادا ہو سکتی ہیں۔ یہ انھی کا ایجاد تھا کہ آپ مزا لے لیا اور اوروں کو لطف دے گئے۔ دوسرے کا کام نہیں۔ اگر کوئی چاہے کہ ایک تاریخی حال یا اخلاقی خیال یا علمی مطالب یادنیا کے معاملات خاص میں مراسلے لکھے تو اس انداز میں ممکن نہیں۔ اس کتاب میں چوں کہ اصلی خط لکھے ہیں۔ اس لیے وہ ان کی ظاہر و باطن کی حالت کا آئینہ ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے غم والم ہمیشہ انھیں ستاتے تھے اور وہ علو حوصلہ سے ہنسی ہی میں اڑاتے تھے پورا لطف ان تحریروں کا اس شخص کو آتا ہے کہ جو خود ان کے حال سے اور مکتوب الیہوں کی چال ڈھال سے اور طرفین کے ذاتی معاملات سے بہ خوبی واقف ہو۔ غیر آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس لیے اگر ناواقف اور بے خبر لوگوں کو اس میں مزانہ آئے تو کچھ تعجب نہیں۔

اس کتاب میں قلم۔ التماس کو مونث، پنشن، بیداد، بارک کو مذکر فرمایا ہے ایک جگہ

فرماتے ہیں۔ "میرا اردو بہ نسبت اوروں کے فصیح ہوگا۔"

لطائف غیبی [۴۰]۔ اس رسالہ میں منشی سعادت علی کی طرف روے سخن ہے۔ اگرچہ اس کے دیباچہ میں سیف الحق کا نام لکھا ہے مگر انداز عبارت اور عبارت کے چٹکلے صاف کہتے ہیں کہ مرزا ہیں۔ در حقیقت وہی میاں داد خاں ہیں...... جن کے نام چند رقعے مرزا صاحب کے اردوئے معلی میں ہیں چنانچہ ایک رقعہ میں انھیں فرماتے ہیں کہ صاحب میں نے تم کو سیف الحق خطاب دیا۔ تم میری فوج کے سپہ سالار ہو۔

تیغ تیز [۴۱]۔ مولوی احمد علی پروفیسر مدرسہ ہگلی نے قاطع برہان کے جواب میں موید البرہان [۴۲] لکھی تھی۔ اس کے بعض مراتب کا جواب مرزا صاحب نے تحریر فرما کر تیغ تیز نام رکھا۔

ساطع برہان [۴۳] کے اخیر میں چند ورق سید عبداللہ کے نام سے ہیں۔ وہ بھی مرزا صاحب کے ہیں۔

تصنیفات فارسی

فارسی کی تصنیفات کی حقیقت حال کا لکھنا اور ان پر رائے لکھنی اردو کے تذکرہ نویس کا کام نہیں ہے۔ اس لیے فقط فہرست لکھتا ہوں۔

قصائد۔ حمد و نعت میں آئمہ معصومین کی مدح میں۔ بادشاہ دہلی۔ شاہ اودھ۔ گورنروں اور بعض صاحبان عالیشان کی تعریف میں ہیں۔

غزلوں کا دیوان [۴۴]۔ معہ دیوان قصائد کے ۱۸۳۳ء / ۱۸۳۵ء میں مرتب ہو کر نقلوں کے ذریعہ سے اہل ذوق میں پھیلا اور اب تک کئی دفعہ چھپ چکا ہے۔

پنج آہنگ [۴۵]...... اس میں پانچ آہنگ کے پانچ باب۔ فارسی کے انشا پردازوں کے لیے خط کہ ان کے انداز میں لکھنا چاہییں۔ ایک عمدہ تصنیف ہے۔

۱۸۶۲ء میں قاطع برہان چھپی۔ بعد کچھ کچھ تبدیلی کے اسی کو پھر چھپوایا اور درفش کاویانی

نام رکھا۔ برہان قاطع کی غلطیاں نکالی ہیں۔ مگر اسی پر فارسی کے دعویداروں نے سخت حملوں کے ساتھ مخالفت کی۔

نامۂ غالب[۴۶]۔ قاطع برہان کے کئی شخصوں نے جواب لکھے۔ چنانچہ میرٹھ میں حافظ عبدالرحیم نام ایک معلّم نابینا تھے۔ انھوں نے اس کا جواب ساطع برہان لکھا۔ مرزا صاحب نے خط کے عنوان میں حافظ صاحب موصوف کو بطور جواب کے چند ورق لکھے اور ان کا نام نامۂ غالب رکھا۔

مہر نیم روز[۴۷]۔ حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بادشاہ کے تھے۔ انھیں تاریخ کا شوق تھا اور اہل کمال کے ساتھ عموماً تعلق خاطر رکھتے تھے۔ مرزا نے ان کے ایما سے اوّل کتاب مذکور کا ایک حصہ لکھا۔ اسی کے ذریعے سے ۱۸۵۰ء میں باریاب حضور ہو کر خدمت تاریخ نویسی پر مامور ہوئے اور نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسداللہ خان غالب بہادر نظام جنگ خطاب ہوا۔ چنانچہ پہلی جلد میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال بیان کر کے مہر نیم روز نام رکھا۔ ارادہ تھا کہ اکبر سے لے کر بہادر شاہ تک کا حال دوسری جلد میں لکھیں اور ماہ نیم ماہ رکھیں کہ غدر ہو گیا۔

دستنبو[۴۸]۔ ۱۱/ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک حال بغاوت۔ روداد تباہی شہر۔ اپنی سرگزشت۔ عرض کل ۱۵ مہینے کا حال لکھا ہے۔

سبد چین[۴۹]۔ دو تین قصیدے چند خطوط۔ فارسی کے اس میں ہیں کہ دیوان میں درج نہ ہوئے تھے۔

اواخر عمر میں اپنا کلام اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ اردو کی تصنیفات نواب حسین مرزا صاحب کے پاس رہتی تھیں اور وہ ترتیب کرتے جاتے تھے۔ فارسی نواب ضیاء الدین احمد خان صاحب کو بھیج دیتے تھے کہ انھیں نیر ورخشاں تخلص کر کے اپنا رشید شاگرد اور خلیفہ اوّل قرار دیا تھا۔ خلیفہ دوّم، نواب علاء الدین خان صاحب تھے۔

ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی انشا پردازی کے شوق کو بڑی کاوش اور عرق ریزی سے نباہتے تھے۔ اسی واسطے مرنے سے [illegible] پہلے ان کی تحریریں اردو میں ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک دوست کے خط میں خود فر[illegible]

"بندہ نواز! زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت عزیزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں [۵۰]

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں۔ سب دوستوں کو جن سے کتابت رہتی ہے، اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط لکھے اور بھیجے تھے ان میں سے جو صاحب اِلے آلان موجود ہیں ان سے بھی عند الضرورت اسی زبان مروج میں مکاتیب مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے۔

اردوئے معلیٰ میں مرزا حاتم علی بیگ مہؔر کو تحریر فرماتے ہیں۔ "میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین ایک میرے دوست تھے۔ انھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی اُن سے لی۔"

قطعہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے — خالِ مشکینِ رُخِ دلکش لیلیٰ کہیے
حجرالاسود و دیوارِ حرم کیجیے فرض — نافہ آہوے بیابانِ ختن کا کہیے
صومعہ میں اسے ٹھیرایے گر مُہرِ نماز — میکدہ میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
مَسّی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے — سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے
اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض — اور اس چکنی سُپاری کو سُویدا کہیے

غرض کہ بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں[۵۱]۔ بھول گیا[۵۲]۔

نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت ان کے بیٹے تھے اور باوجودیکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بادشاہ انھی کی ولی عہدی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ جب ان کی شادی کا موقع آیا تو بڑی دھوم کے سامان ہوئے۔ مرزا نے سہرا کہہ کر حضور میں گزارنا۔

سہرا[۵۳]

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا — باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے — ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کُلاہ — مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروے گئے ہوں گے موتی — ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی — تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا — ہے رگِ ابر گہربار سراسر سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے — رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز — چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے — گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیوں کر سہرا
رخِ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک — کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا
تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابر بہار — لائے گا تاب گرانباریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

☆☆☆

مقطع کو سن کر حضور کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر چشمک ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں۔ ہم نے جو شیخ ابراہیم ذوق کو استاد اور ملک الشعرا بنایا ہے۔ یہ سخن فہمی سے بعید ہے۔ بلکہ طرف داری ہے۔ چنانچہ اسی دن استاد مرحوم جو حسبِ معمول حضور میں گئے تو بادشاہ نے وہ سہرا دیا کہ استاد اسے دیکھیے۔ انھوں نے پڑھا

اور بموجب عادت کے عرض کی۔ پیر و مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا کہ استاد! تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو اور ذرا مقطع پر بھی نظر رکھنا۔ استاد مرحوم وہیں بیٹھ گئے اور عرض کیا۔

سہرا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا — آج ہے یُمن و سعادت کا ترے سر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک — کشتیِ زر میں مہ نو کی لگا کر سہرا
تابشِ حُسن سے مانند شعاعِ خورشید — رُخِ پُرنور پہ ہے تیرے منور سہرا
وہ کہے صلِّ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ — دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا
تابُنی اور بنے میں رہے اخلاص بہم — گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی — گائیں مُرغانِ نواسنج نہ کیوں کر سہرا
روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار — تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا
ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش — سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا
ایک گہر بھی نہیں صدکانِ گہر میں چھوڑا — تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا
پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار — اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا
سر پہ طُرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی — کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منھ پر سہرا
رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک — کھول دے منھ کو جو تو منھ سے اٹھا کر سہرا
کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے — دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا
دُرِ خوش آبِ مضامین سے بنا کر لایا — واسطے تیرے ترا ذوق ثناگر سہرا

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

☆☆☆

اربابِ نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اسی وقت انھیں ملا۔ شام تک شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔ دوسرے ہی دن اخباروں میں مشتہر ہو گیا۔ مرزا بھی بڑے اداشناس اور سخن فہم تھے۔ سمجھے کہ تھا کچھ اور یہ قطعہ حضور میں گزارنا۔

قطعہ در معذرت

منظور ہے گزارشِ احوال واقعی — اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفؔر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستاد شہہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا — جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ اِمتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بری نہیں — ہے شکر کی جگہ کی شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خداگواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے ۵۴

کلکتہ میں بہت سے اہلِ ایران اور بڑے بڑے علما و فضلا موجود تھے۔ مگر افسوس ہے کہ وہاں مرزا کے کمال کے لیے ایسی عظمت نہ ہوئی جیسی کہ ان کی شان کے لیے شایاں تھی۔ حقیقت میں ان کی عظمت ہونی چاہیے تھی اور ضرور ہوتی مگر ایک اتفاقی پیچ پڑ گیا۔ اس کی داستان یہ ہے کہ مرزا نے کسی جلسہ میں ایک فارسی کی غزل پڑھی۔ اس میں ایک لفظ پر بعض اشخاص نے اعتراض کیا اور اعتراض بموجب اس قاعدہ کے تھا جو مرزا قتیؔل نے اپنے ایک رسالے میں لکھا ہے۔ مرزا نے سن کر کہا کہ قتیؔل کون ہوتا ہے؟ اور مجھے قتیؔل سے کیا کام؟ ایک فرید آباد کا کھتری تھا۔ میں اہلِ زبان کے سوا کسی کو نہیں سمجھتا۔ وہ لوگ اکثر مرزا قتیؔل کے شاگرد تھے۔ اس لیے آئینِ مہمان نوازی سے آنکھیں بند کر لیں اور جوش و خروش خاص و عام میں پیدا ہوا۔ مرزا کو تعجب ہوا اور اس خیال سے کہ یہ فتنہ کسی طرح فرو ہو جائے،

سلامت روی کا طریقہ اختیار کر کے ایک مثنوی لکھی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ داد سخنوری کی دی ہے۔ معرکہ کا سارا ماجرا نہایت خوبی کے ساتھ نظم میں ادا کیا۔ اعتراض کو سند سے دفع کیا۔ اپنی طرف سے انکسار مناسب کے ساتھ معذرت کا حق پورا کیا۔ لیکن زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ جب مثنوی حریفوں کے جلسہ میں پڑھی گئی تو بجائے اس کے کہ کمال کو تسلیم کرتے یا مہمان سے اپنی زیادتیوں کا عذر کرتے۔ ایک نے عمداً کہا کہ اس مثنوی کا نام کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ بادِ مخالف، دوسرے نے گلستاں کا فقرہ پڑھا۔ یکے از صلحاء بادِ مخالف در شکم پیچید اور سب نے ہنس دیا۵۵۔

لطیفہ: دلی میں مشاعرہ تھا۔ مرزا نے اپنی فارسی غزل پڑھی۔ مفتی صدر الدین خان صاحب اور مولوی امام بخش صاحب صہبائی جلسہ میں موجود تھے۔ مرزا صاحبؒ نے جس وقت یہ مصرع پڑھا۔ ع بوادیے کہ در آں خضر را عصا خفت است۔ مولوی صہبائی کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ عصا خفتست میں کلام ہے۔ مرزا نے کہا کہ حضرت! میں ہندی نژاد ہوں میرا عصا پکڑ لیا۔ اس شیرازی کا عصا نہ پڑا گیا۔ ع ولے بجملہ اول عصائے شیخ بخفت۔ انھوں نے کہا کہ اصل محاورہ میں کلام نہیں کلام اس میں ہے کہ مناسب مقام ہے یا نہیں۔

لطیفہ: ایک دفعہ مرزا بہت قرض دار ہوگئے۔ قرض خواہوں نے نالش کر دی۔ جواب دہی میں طلب ہوئے۔ مفتی صاحب کی عدالت تھی۔ جس وقت پیشی میں گئے یہ شعر پڑھا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن۵۶

مرزا صاحب کو ایک آفت ناگہانی کے سبب سے چند روز جیل خانہ میں اس طرح رہنا پڑا کہ جیسے حضرت یوسف کو زندانِ مصر میں۔ کپڑے میلے ہوگئے جوئیں پڑ گئی تھیں۔ ایک دن بیٹھے ان میں سے جوئیں چن رہے تھے۔ ایک رئیس وہیں عیادت کو پہنچے۔ پوچھا کیا حال ہے آپ نے یہ شعر پڑھا۔

ہم غمزدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں۵۷

جس دن وہاں سے نکلے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کرتہ وہیں پھاڑ کر پھینکا اور یہ شعر پڑھا۔

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا۵۸

حسین علی خاں چھوٹا لڑکا ایک دن کھیلتا کھیلتا آیا کہ دادا جان مٹھائی منگا دو۔ آپ نے فرمایا کہ پیسے نہیں۔ وہ صندوقچہ کھول کر ادھر ادھر پیسے ٹٹولنے لگا آپ نے فرمایا۔

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۵۹

پنشن سرکار سے ماہ بہ ماہ ملتی تھی۔ بغاوت دہلی کے بعد حکم ہوا کہ ششماہی ملا کرے اس موقع پر ایک دوست کو لکھتے ہیں۔

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار۶۰

مگر یہ دو شعر حقیقت میں ایک قصیدے کے ہیں جس کی بدولت بادشاہ دہلی کے دربار سے ششماہی تنخواہ کے لیے ماہوار کا حکم حاصل کیا تھا۔ فارسی کے قصائد میں بھی اس قسم کی غزل وقصیدہ انھوں نے اکثر کہے ہیں اور یہ کچھ عجیب بات نہیں۔ انوری وغیرہ اکثر شعرا نے ایسا کیا ہے۔

لطیفہ: مولوی فضل حق صاحب مرزا کے بڑے دوست تھے۔ ایک دن مرزا ان کی ملاقات کو گئے۔ ان کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتا تو خالق باری کا یہ مصرع پڑھا کرتے تھے۔ ع بیا برادر آورے بھائی۔ چنانچہ مرزا صاحب کی تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہہ کر بٹھایا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ مولوی صاحب کی رنڈی دوسرے دالان سے اٹھ کر پاس آن بیٹھی۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ ہاں صاحب اب وہ دوسرا

مصرع بھی فرما دیجیے۔ ع۔ بنشنید مادر بیٹھ رہی مائی[۱] ۶

لطیفہ: مرزا کی قاطع برہان کے بہت شخصوں نے جواب لکھے ہیں اور بہت زبان درازیاں کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ حضرت آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہ لکھا۔ فرمایا بھائی اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو تم اس کا کیا جواب دو گے۔

لطیفہ: بہن بیمار تھیں۔ آپ عیادت کو گئے۔ پوچھا کیا حال ہے وہ بولیں کہ مرتی ہوں قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لیے جاتی ہوں۔ آپ نے کہا کہ بوا! بھلا یہ کیا فکر ہے! خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالدین بیٹھے ہیں جو ڈگری کر کے پکڑوا بلائیں گے۔

لطیفہ: ایک دن مرزا کے شاگرد رشید نے آکر کہا۔ حضرت آج میں امیر خسرو کی قبر پر گیا مزار پر کھرنی کا درخت ہے اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت وبلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھیے تو میں کیسا فصیح ہو گیا۔ مرزا نے کہا کہ ارے میاں تین کوس کیوں گئے میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیپلیاں کیوں نہ کھالیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

مرزا صاحب کی شوخی طبع ہمیشہ انھیں اس رنگ میں شور بور رکھتی تھی، جس سے ناواقف لوگ انھیں الحاد کی تہمت لگائیں اور چوں کہ یہ رنگ ان کی شکل وشان پر عجیب معلوم ہو تا تھا اس لیے ان کے دوست ایسی باتوں کو سن کر چونکتے تھے جوں جوں وہ چونکتے تھے وہ اور بھی چھینٹے اڑاتے تھے۔ ان کی طبیعت سرور شراب کی عادی تھی۔ لیکن اسے گناہ الٰہی سمجھتے تھے اور یہ بھی عہد تھا کہ محرم میں ہرگز نہ پیتے تھے۔

لطیفہ: غدر کے چند روز بعد پنڈت موتی لال کہ ان دنوں مترجم گورنمنٹ پنجاب کے تھے صاحب چیف کمشنر پنجاب کے ساتھ دلّی گئے اور حب الوطنی اور محبت فن کے سبب سے مرزا صاحب کی ملاقات کی۔ ان دنوں پنشن بند تھی۔ دربار کی اجازت نہ تھی۔ مرزا بہ سبب دل شکستگی کے شکوہ شکایت سے لبریز ہو رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ بھی نماز پڑھی ہو تو مسلمان نہیں پھر میں نہیں جانتا کہ مجھے سرکار نے باغی مسلمانوں میں کس طرح شامل سمجھا۔

لطیفہ: بھوپال سے ایک شخص دلّی کی سیر کو آئے۔ مرزا صاحب کے بھی مشتاق ملاقات

تھے۔ چنانچہ ایک دن ملنے کو تشریف لائے۔ وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ نہایت پرہیزگار اور پارسا شخص ہیں۔ ان سے بہ کمال اخلاق پیش آئے۔ مگر معمولی وقت تھا۔ بیٹھے سرور کر رہے تھے۔ گلاس اور شراب کا شیشہ آگے رکھا تھا ان بیچارہ کو خبر نہ تھی کہ آپ کو یہ شوق بھی ہے انھوں نے کسی شربت کا شیشہ خیال کر کے ہاتھ میں اٹھالیا۔ کوئی شخص پاس سے بولا کہ جناب یہ شراب ہے۔ بھوپالی صاحب نے جھٹ شیشہ ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا کہ میں نے شربت کے دھوکے میں اٹھالیا تھا۔ مرزا صاحب نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ زہے نصیب دھوکے میں نجات ہو گئی۔

لطیفہ: ایک دفعہ رات کو انگنائی میں بیٹھے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ آپ آسمان کو دیکھ کر فرمانے لگے کہ جو کام بے صلاح و مشورہ ہوتا ہے بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ خدا نے ستارے آسمان پر کسی سے مشورہ کر کے نہیں بنائے۔ جب ہی بکھرے ہوئے ہیں نہ کوئی سلسلہ نہ زنجیر نہ بیل نہ بوٹہ۔

لطیفہ: ایک مولوی صاحب جن کا مذہب سنت وجماعت تھا رمضان کے دنوں میں ملاقات کو آئے۔ عصر کی نماز ہو چکی تھی۔ مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے کہا حضرت غضب کرتے ہیں۔ رمضان میں روزے نہیں رکھتے۔ مرزا نے کہا سنی مسلمان ہوں۔ چار گھڑی دن سے روزہ کھول لیا کرتا ہوں۔

لطیفہ: رمضان کا مہینا تھا آپ نواب حسین مرزا کے ہاں بیٹھے تھے۔ پان منگا کر کھایا۔ ایک صاحب فرشتہ سیرت، نہایت متقی و پرہیزگار اس وقت حاضر تھے۔ انھوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ قبلہ آپ روزہ نہیں رکھتے۔ مسکرا کر بولے شیطان غالب ہے۔ یہ لطیفہ اہل ظرافت میں پہلے سے بھی مشہور ہے کہ عالمگیر کا مزاج سرمد سے مکدر تھا اس لیے ہمیشہ اس کا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ قاضی قوی جو اس عہد میں قاضی شہر تھا اس نے ایک موقع پر سرمد کو بھنگ پیتے ہوئے جا پکڑا۔ اول بہت سے لطائف و ظرائف کے ساتھ جواب سوال ہوئے۔ آخر جب قاضی نے کہا کہ نہیں! شرع کا حکم اسی طرح ہے، کیوں حکم الٰہی کے برخلاف باتیں بناتا ہے۔ اس نے کہا کہ کیا کروں بابا شیطان قوی ہے۔

لطیفہ: جاڑے کا موسم تھا۔ ایک دن نواب مصطفیٰ خان صاحب مرزا کے گھر آئے آپ

نے ان کے آگے شراب کا گلاس بھر کر رکھ دیا۔ وہ ان کا منہ دیکھنے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ لیجیے۔ چوں کہ وہ تائب ہو چکے تھے، انھوں نے کہا کہ میں نے تو توبہ کی۔ آپ متعجب ہو کر بولے کہ ہیں کیا جاڑے میں بھی۔

لطیفہ: ایک صاحب نے ان کے سنانے کو کہا کہ شراب پینی سخت گناہ ہے۔ آپ نے ہنس کر کہا کہ بھلا جو پیے تو کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادنیٰ بات یہ ہے کہ دعا نہیں قبول ہوتی۔ مرزا نے کہا کہ آپ جانتے ہیں شراب پیتا کون ہے؟ اوّل تو وہ کہ ایک بوتل اولڈ ٹام کی، باسامان سامنے حاضر ہو۔ دوسرے بے فکری، تیسرے صحت [۶۲]۔ آپ فرمائیے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہو اسے اور چاہیے کیا جس کے لیے دعا کرے۔

مرزا صاحب کو مرنے سے ۲۰ برس پہلے اپنی تاریخ فوت کا ایک مادہ ہاتھ آیا۔ وہ بہت بھایا اور اسے موزوں فرمایا۔

تاریخِ فوت

منکہ باشم کہ جاوداں باشم
چوں نظیری نماند و طالب مرد
در بپرسند در کدا میں سال
مُرد غالب، بگو کہ غالب مُرد

اس حساب سے ۱۲۷۷ھ میں مرنا چاہیے تھا۔ اسی سال شہر میں سخت وبا آئی۔ ہزاروں آدمی مر گئے۔ ان دنوں دلّی کی بربادی کا غم تازہ تھا۔ چنانچہ میر مہدی صاحب کے جواب میں آپ فرماتے ہیں۔ وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت۔ کال ایسا بڑا۔ وبا کیوں نہ ہو، لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے [۶۳]۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور [۶۴] ہے

میاں! ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا

واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفعِ فسادِ ہوا کے سمجھ لیا جائے گا۔

استدراک

[آزادؔ (ولادت ۱۸۳۰ء) نے عبداللہ خان اوجؔ کا حال ترجمۂ غالب کے حاشیے میں دیا ہے۔ چوں کہ حاشیہ خاصا طویل ہے میں نے قاری کی دلچسپی کے لیے یہاں آخر میں لگا دیا ہے۔ تذکرہ شمیمِ سخن اور خمخانۂ جاوید میں درج ہے کہ اوجؔ نے ۱۲۷۰ھ / ۵۴۔۱۸۵۳ء) میں انتقال کیا۔ گویا اوجؔ کے انتقال کے وقت آزادؔ ۲۳۔۲۴ سال کے تھے۔]

اوجؔ تخلص عبداللہ خان نام۔ ۴۰، ۵۰ برس کے مشاق تھے۔ ایسے بلند مضمون اور نازک خیال پیدا کرتے تھے کہ قابو میں نہ لا سکتے تھے اور انھیں عمدہ الفاظ میں ایسی چستی اور درستی سے باندھتے تھے کہ وہ مضمون سما بھی نہ سکتا تھا۔ اس لیے کبھی تو مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا تھا اور کبھی کچھ بھی نہ رہتا تھا۔ سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں غزل کہتے تھے۔ فکرِ مضامین اور تلاش الفاظ میں تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ غور کے ساتھ کاوش کرتے تھے اور آپ ہی آپ مزے لیتے تھے ہونٹ چباتے چباتے ایک طرف سے سفید ہو گیا تھا۔ بعض شعر پڑھ کر کہتے تھے کہ آنکھوں سے لہو ٹپک پڑا تھا جب یہ شعر کہا تھا۔ بعضے پر کہتے تھے کہ ۶ مہینے تک برابر پڑھتا رہا۔ پڑھتے اس زور و شور سے تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مشاعروں میں غزل سناتے تھے۔ توصفِ مجلس سے گز گز بھر آگے نکل جاتے تھے۔ بعض اشخاص شہر کے اور قلعہ میں اکثر مرشد زادے (شہزادے) شاگرد تھے۔ مگر استاد سب کہتے تھے۔ شعرائے باکمال کو جا کر سناتے تھے اور واہ واہ کی چیخیں اور تعریفوں کے فغان و فریاد لے کر چھوڑتے تھے۔ کیوں کہ اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔...... میں ان دنوں میں مبتدی شوقین تھا۔ اپنا مشاق سمجھ کر مجھ سے بہت خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ بس تم ہمارے کلام کو سمجھتے ہو۔ رستہ میں مل جاتے تو دس قدم دور سے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور جو نیا شعر کہا ہوتا اسے وہیں سے اکڑ کر پڑھتے۔ پھر شعر سنتے سناتے چلتے۔ قلعہ کے نیچے میدان میں گھنٹوں ٹہلتے اور شعر پڑھتے رہتے۔ غریب خانہ پر بھی تشریف لاتے اور پہر بھر سے کم نہ بیٹھتے۔ ایک دن رستہ میں ملے دیکھتے ہی کہنے لگے آج گیا تھا۔ انھیں بھی سنا آیا۔ میں نے کہا کیا؟ کڑک کر کہا۔

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غالبؔ
غالبؔ آسان نہیں صاحب دیوان ہونا

ظاہر کہ یہ واقعہ ۱۸۴۱ء (دیوان غالب طبع اول کا سال اشاعت) اور ۵۴۔۱۸۵۳ء (اوج کا سال وفات) کے درمیان کبھی ہوا ہوگا۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ ۱۸۵۰ء کے آس پاس ہوا ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت آزادؔ لگ بھگ بیس سال کے ہوں گے۔

حواشی

(۱) میر اور میریات۔ مطبوعہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۲ء۔ ص ۱۵۳

(۲) غالب جب ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو شاہ ظفر کے حضور پیش ہوئے تو بادشاہ نے نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ کہہ کر خطاب کیا۔

(۳) پورا نام محمد اسداللہ بیگ خاں تھا۔

(۴) یہ حقیقت میں منشی ذکاءاللہ دہلوی کا بیان ہے۔ دیکھیے مکتوب ذکاءاللہ بنام آزادؔ۔ "نگار"، فروری ۱۹۶۳ء۔ ص ۱۱

(۵) دیوان فارسی میں ۲۰،۱۵ شعر کا ایک قطعہ لکھا ہے۔ بعض اشخاص کا قول ہے کہ ذوقؔ کی طرف چشمک ہے غرض اس میں کا ایک شعر ہے:-

راست میگویم من داز راست سر نتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است
(آزادؔ)

اس قطعے کے کل ۱۹ اشعر ہیں۔ قطعہ پہلی بار دیوان (کلیات) فارسی غالب (پہلا ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۴۵ء) کے ص ۲۵ پر درج ہوا۔ اس کے تین شعر (تیسرا، چوتھا اور چودھواں) ملاحظہ فرمائیے:-

نیست نقصان یک دو جز واست ار سوادِ ریختہ
کان وژم برگے ز نخلستانِ فرہنگِ من است

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہاے رنگ رنگ
بگورا مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

دیدہ ور سلطان سراج الدین بہادر شہ کہ او
آں شرر بلند کہ پنہاں در رگِ سنگ من است

شاہ ظفرؔ ۲۹ ستمبر ۱۸۳۷ء کو تخت نشین ہوئے تھے گویا یہ قطعہ جو کہا جاتا ہے کہ غالب نے ذوقؔ سے خطاب کر کے کہا ہے، ۲۹ ستمبر ۱۸۳۷ء اور ۱۸۴۵ء (سال طباعت کلیات فارسی غالب) کے مابین کسی وقت فکر کیا ہوگا۔ مجموعہ اردو کا ذکر بھی کیا ہے اس لیے ۱۸۴۱ء کے بعد شاید ۱۸۴۲ء کا کہا ہوا ہو۔ غالب کہتے ہیں کہ یہ کوئی ایسا گھاٹے کا سودا نہیں، اگر میں نے ایک دو جز کا مجموعہ کلام تصنیف کیا ہے۔ کیوں کہ یہ میرے فرہنگ کے نخلستان کا ایک معمولی پتا ہے اگر رنگ رنگ کے نقوش دیکھنا چاہتے ہو تو میرا فارسی کلام دیکھو اور میرے روکھے پھیکے مجموعہ اردو (دیوان غالب پہلا ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۴۱ء) کو نظر انداز کر دو۔ مگر غالب یہ فارسی قطعہ لکھتے ہوئے بھول گئے کہ (نسخہ شیرانی میں) ۱۸۴۲ء سے سترہ اٹھارہ سال پہلے وہ خود لکھ آئے ہیں:-

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

اور یہ شعر اس مجموعہ اردو میں انھوں نے برقرار رکھا جسے "بے رنگ" کہا ہے یعنی دیوان غالب اردو مطبوعہ ۱۸۴۱ء۔ شعر اس کے ص ۵۱ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

(۶) یہ شعر اور قصہ علائیؔ کا بیان کردہ ہے۔ دیکھو مکتوب علائی بنام آزاد، "نگار"، فروری ۱۹۶۳ء، ص ۹۔ اصل شعر جس کا ذکر خود غالب نے اردوئے معلیٰ میں کیا ہے وہ میر امانی اسدؔ شاگرد سوداؔ کا ہے اور اس شعر سے قدرے مختلف ہے۔

اسدؔ اس جفا پر بتوں سے وفا کی
میرے شیر! شاباش رحمت خدا کی

(۷) غالب نے ۱۲۳۱ھ میں دو مہریں بنوائیں۔ پہلی پر اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ کندہ کرلیا اور دوسری پر (جو بعد میں بنوائی گئی) "اسداللہ الغالب ۱۲۳۱ھ جو مطابق ہے ۱۶۔ ۱۸۱۵ء کے۔ دوسری مہر حقیقت میں حضرت علی کا لقب ہے اور عبارت بطور سجع ہے بعد میں تبدیلِ تخلص کے وقت یہی سجع کام آیا اور اسد کی جگہ غالب تخلص قرار پایا۔ ۱۸۱۶ء میں غالب تخلص کا استعمال باقاعدگی سے کرنے لگے۔ لیکن اسدؔ تخلص کو بھی کلّی طور پر ترک نہیں کیا۔

(۸) یہ درست نہیں۔ نواب نظام علی خاں کے منصب داروں کی فہرست میں ان (غالب کے والد) کا نام نہیں ہے اس لیے یہ بات واضح ہے کہ وہ حیدر آباد میں بہت معمولی حیثیت سے کارگزار رہے ہوں گے۔ (غالب اور آہنگ غالب۔ اشاعت دوم، ستمبر ۱۹۷۱ء) یعنی تین سو یا چار سو کی جمعیت کے رسالدار نہ ہوں گے۔

(۹) یہ واقعہ ۱۸۰۲ء کا ہے۔ غالب نے اپنے والد کے الور راج کے تحت لڑتے ہوئے مارے جانے کا ذکر ایک شعر میں اس طرح کیا ہے۔

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست
در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

(۱۰) غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے ہاتھ سے گر کر زخمی ہو جانے سے انتقال کیا (تقریباً اپریل ۱۸۰۶ء)

(۱۱) اصل حال یہ ہے کہ جب مرزا نے اپنا دعویٰ کلکتہ میں پیش کیا تو سرکار نے اس کا فیصلہ سرجان مالکم صاحب گورنر بمبئی کو سپرد کیا کیوں کہ جب جاگیروں کی سندیں لکھی گئی تھیں تو وہ لارڈ لیک صاحب کمانڈران چیف ہندوستان کے سکریٹری تھے اور انھیں کے دستخط سے اسناد جاری ہوئے تھے۔ جب ان کے پاس یہ مقدمہ اور اس کے کاغذات پہنچے تو انھوں نے لکھا کہ مدعی غلط کہتا ہے۔ نواب احمد بخش خاں ہمارا قدیمی دوست تھا اور بڑا راست امیر تھا۔ اس پر یہ اتہام ضد سے کیا گیا ہے ہم نے پانچ ہزار سالانہ لکھا تھا۔ جس

میں سے تین ہزار مدعی اور اس کے متوسلین کے لیے تھے اور دو ہزار خواجہ حاجی اور اس کے وارثوں کے نام تھے۔ پھر مرزا صاحب نے ولایت میں مرافعہ کیا۔ وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔ بموجب تحقیق نواب ضیاء الدین خاں بہادر دام ظلہم العالی کے تحریر ہوا۔ (حاشیہ از: آزاد)

(۱۲) نواب احمد بخش خاں کا انتقال اکتوبر ۱۸۲۷ء کو ہوا۔ غالب کو یہ خبر سفر کلکتہ کے دوران میں مرشد آباد میں ملی۔

(۱۳) غالب ۱۹ یا ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ اسی روز شملہ بازار (متصل چیت پور) میں گرو تالاب کے نزدیک مرزا علی سوداگر کی حویلی میں رہنے کو مکان مل گیا۔

(۱۴) ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو دتی واپس ہوئے۔

(۱۵) یہ شعر ۱۸۲۶ء یا اس سے پہلے کا فکر کردہ ہے اور بیدلؔ کے ذیل کے فارسی شعر کا چربہ ہے

مطلع ازے پرستی تر دماغی نہ بانہ بود
یک دو ساغر آب دادم گریۂ مستانہ را

(۱۶) ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو رام پور کے پہلے سفر پر روانہ ہوئے اور ۲۷ جنوری کو رام پور پہنچے۔

(۱۷) نواب یوسف علی خاں ناظم والی رام پور، ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو غالب کے شاگرد ہوئے۔

(۱۸) مئی ۱۸۶۰ء میں دوبارہ انگریزی پنشن کا اجرا ہوا۔

(۱۹) اس تاریخ پر اکثر اصحاب کو توارد ہوا۔ حقیقت میں یہ اس قطعے سے ماخوذ ہے جو خود غالب نے از راہ تفنن ایک دفعہ کہا تھا۔

من کہ باشم کہ جاوداں باشم چوں نظیریؔ نماند و طالب مُرد
ور بگویندہ در کدامیں سال مُرد غالب بگو کہ "غالب مُرد"

آگے چل کر خود آزادؔ نے بھی لطیفے کے تحت یہ قطعہ درج کیا ہے۔

(۲۰) ہرمزد ثم عبدالصمد استاد غالب بعض کی نظر میں کوئی وجود نہیں رکھتے۔ اس پر طرفین میں لمبی لمبی بحثیں ہو چکی ہیں۔ میرے خیال میں ان کا وجود تھا اور غالب نے اپنے بچپن میں زبان فارسی کے کچھ نکات ان سے سیکھے ہوں گے اگرچہ شعر غالب سے ان کا کوئی

تعلق نہ رہا ہوگا۔

(۲۱) یہ واقعہ آزاد اور ان کے تتبع میں حالی نے ۱۸۴۲ء کا قرار دیا ہے مگر حقیقت میں ۱۸۴۰ء کا ہے۔

(۲۲) ہرگوپال تفتہ سکندر آبادی (ولادت ۱۸۰۰ء / ۱۷۹۹ء وفات ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء)۔ تفتہ کا دیوان قصائد کبھی نہیں شائع ہوا۔

مرزا صاحب سے بھی عمر میں بڑے معلوم ہوتے تھے۔ فارسی کے عاشق تھے اس لیے باوجو ہندو ہونے کے مرزا تفتہ کے نام سے بڑے خوش ہوتے تھے۔ دیوان قصائد اور دیوان غزلیات چھپوا دیا تھا۔ فارسی ہی شعر کہتے تھے۔ (حاشیہ از: آزاد)

(۲۳) ۷رجب ۱۲۲۵ھ (۱۹/اگست ۱۸۱۰ء) کو ۱۳ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ اگر آزاد نے یہ عبارت خط بنام میاں داد خاں سیاح سے لی ہے تو وہ یوں ہے اور خط ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء کو لکھا گیا تھا..... "سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی، لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی..... "حیرت ہے کہ غالب نے اپنی کسی اولاد کے پیدا ہونے یا مر جانے کا ذکر اپنے خط میں نہیں کیا۔ کسی ہم عصر کے یہاں بھی اس کی نشان دہی اب تک نہیں کی جاسکی۔

(۲۴) عارف ولادت ۱۸۔ ۱۸۱۷ء وفات اپریل ۱۸۵۲ء

(۲۵) ضیاالدین احمد خاں نیر ور خشاں، ولادت اکتوبر ۱۸۲۱ء، وفات ۲۷ جون ۱۸۸۵ء

(۲۶) امین الدین احمد خاں۔ ولادت ۱۸۱۴ء۔ وفات ۱۳ دسمبر ۱۸۶۹ء

(۲۷) علاءالدین احمد خاں علائی۔ ولادت ۲۵ اپریل ۱۸۳۳ء ، وفات ۳۱/اکتوبر ۱۸۸۴ء

(۲۸) الٰہی بخش خاں مرحوم کی بیٹی نواب احمد بخش خان مرحوم کی حقیقی بھتیجی ہوئیں وہ ان کی بی بی تھیں۔ چوں کہ کوٹھی کا مکان رہنے کو مانگا ہے اس لیے اپنے تئیں صاحب اور بی بی کو میم صاحبہ اور بچوں کو بابا لوگ بنایا۔ (حاشیہ از: آزاد)

(۲۹) دیکھو اردوے معلّی کے خطوط۔ (حاشیہ از: آزاد)

(۳۰) غرۂ رمضان سے لے کر یہاں تک فقط شوخی طبع ہے کیوں کہ جو جو باتیں ان فقروں میں ہیں۔ مرزا ان سے کوسوں بھاگتے تھے اور یہ خط غدر کے بعد کا ہے اس وقت یہ باتیں

دلّی میں خواب و خیال ہو گئی تھیں۔ (حاشیہ از: آزاد)

(۳۱) بیدلؔ۔ ولادت ۱۶۴۴ء۔ ۱۷۲۰ء، وفات ۱۷۲۰ء

(۳۲) غالب کا اردو دیوان ان کی زندگی میں پانچ بار چھپا، پہلی بار مطبع سید الاخبار، دلّی سے اکتوبر ۱۸۴۱ء میں، اس میں ۱۰۹۶ شعر ہیں، دوسری بار مطبع دار السلام دلّی سے مئی ۱۸۴۷ء میں اس میں ۱۱۵۸ شعر ہیں، تیسری بار مطبع احمدی دلّی سے جولائی ۱۸۶۱ء میں اس میں ۱۷۹۶ شعر ہیں، چوتھی بار مطبع نظامی کان پور سے جون/جولائی ۱۸۶۲ء میں اس میں ۱۸۰۲ شعر ہیں، پانچویں بار مطبع مفید خلائق آگرہ سے جون/جولائی ۱۸۶۳ء میں اس میں ۱۷۹۵ شعر ہیں۔

(۳۳) فکر کردہ ۱۸۲۱ء

(۳۴) فکر کردہ ۱۸۲۱ء

(۳۵) فکر کردہ ۱۸۲۱ء

(۳۶) آغا جان عیشؔ۔ ولادت تقریباً ۱۷۸۵ء ۔ وفات (۲۶ جون) ۱۸۷۴ء

(۳۷) یہ محض داستاں سرائی ہے۔ اب سب اس بات پر متفق ہیں کہ انتخاب کلام غالب میں سوائے غالب کے کسی اور کا ہاتھ نہیں ہے۔ البتہ اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ سفر کلکتہ سے پہلے ہی کبھی مولوی فضل حق نے غالب کو مُغلک اشعار کہنے سے ٹوکا ہو۔

(۳۸) مسودہ ۱۸۶۶ء میں مکمل ہو کر مطبع میں دیا جا چکا تھا مگر کتاب پہلی بار ۲۷/۲ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوئی۔

(۳۹) غالب کی وفات کے انیس دن بعد ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو چھپی۔

(۴۰) یہ رسالہ ۲/اکتوبر ۱۸۶۴ء کو چھپا تھا۔

(۴۱) تیغ تیز، ۱۸۶۷ء میں مطبع اکمل المطابع سے چھپی تھی۔

(۴۲) صحیح موید برہان (مطبوعہ مطبع مظہر العجائب کلکتہ۔ ۱۲۸۲ھ)

(۴۳) ساطع برہان (فارسی صفحات ۱۷۴) ۱۲۸۲ھ میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع ہوئی تھی۔ چوں کہ یہ غالب کی کتاب قاطع برہان کی مخالفت میں ہے اس لیے اس میں غالب کی طرف سے (چاہے وہ کسی سید عبداللہ کے نام سے سہی) کوئی تحریر کیوں کر ہو سکتی

ہے؟

(۴۴) کلیات (دیوان) نظم فارسی "میخانہ آرزو سرانجام" کے نام سے ۱۸۳۵ء میں مرتب ہو چکا تھا مگر یہ پہلے پہل ۱۸۴۵ء میں مطبع دارالسلام دہلی سے چھپا۔

(۴۵) پنج آہنگ پہلی بار ۳/اگست ۱۸۴۹ء کو مطبع سلطانی دہلی سے چھپی۔

(۴۶) ۱۶ صفحے کا یہ رسالہ (اگست) ۱۸۶۵ء میں مطبع محمدی (محمد میرزا خاں) دہلی سے چھپا مگر یہ فارسی نہیں، اردو تصنیف ہے۔ کتابی شکل میں شائع ہونے کے بعد اودھ اخبار کی دو اشاعتوں ۱۰/اکتوبر اور ۱۷/اکتوبر میں بھی چھپا تھا۔ اب عود ہندی میں شامل ہے۔

(۴۷) پہلی بار ۱۲۷۱ھ (۵۵۔۱۸۵۴ء) میں فخر المطابع سے شائع ہوئی۔ کل صفحات ۱۱۶

(۴۸) پہلا ایڈیشن مطبع مفید خلائق آگرہ سے نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپا۔

(۴۹) سبد چین میں خطوط شامل نہیں ہیں اور اس میں قصیدوں اور قطعوں کے علاوہ رباعیاں، غزلیں وغیرہ بھی ہیں۔ کتاب اگست ۱۸۶۷ء میں مطبع محمدی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔

(۵۰) مفہوم کے پیش نظر اسے غالب کی آخری عمر کا شعر سمجھا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۶ء کے مابین کہا گیا ہے۔ اس وقت غالب کی عمر ۲۹ سال سے بھی کم تھی۔

(۵۱) دیکھو قطعہ اردوے معلی میں (حاشیہ از: آزاد) غالب لکھتے ہیں "بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں۔" غالب کا یہ خط مرزا حاتم علی مہر کے نام اواخر نومبر ۱۸۵۸ء کا لکھا ہوا تسلیم کیا جاتا ہے اس میں صرف ۲ شعر درج ہیں جب کہ قطعہ ۱۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ پھبتی بہ معنی تشبیہ بھی رائج ہے جیسے آتش۔

کہاں سے دی کبھی تشبیہ ہم نے تیغ سے گاہے
کبھی ہیں پھبتیاں اس ابروے خمدار پر کیا کیا

اگر حساب لگا کر دیکھا جائے تو غالب نے بیس بائیس پھبتیوں (تشبیہوں) کی بات درست کہی تھی۔ اس قطعے کے کل ۱۳ اشعار میں ۲۱ پھبتیاں ہیں۔ صرف پہلے چار مصرعے (دو شعر) اور آخری شعر کا پہلا مصرعہ دہندہ پرور کے کف دست کو دل کیجے فرض۔ بیانیہ ہیں، باقی ۲۱ مصرعوں میں سے ہر مصرع میں تشبیہ موجود ہے۔

(۵۲) یہ قطعہ قیام کلکتہ کے زمانے میں کہا گیا تھا۔ ۱۸۲۸ء یا ۱۸۲۹ء کوئی سال بھی ہو سکتا ہے مگر قیاس ہے کہ ۱۸۲۹ء ہی میں کہا گیا ہو گا۔

(۵۳) ذکر کردہ ۱۸۵۲ء

(۵۴) سال ذکردہ ۱۸۵۲ء۔ (ذوق کے سہرے کے مقطعے کے بعد کا یعنی سہرے کا آخری شعر غماز ہے کہ یہ بادشاہ کے کہنے پر اضافہ کیا گیا ورنہ سہرا مقطع تک مکمل ہو چکا تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پورا سہرا ایک ہی نشست میں نہیں کہا گیا تھا۔)

(۵۵) یہ لطیفہ قطعی آزاد کا اختراع ہے کیوں کہ جب یہ مثنوی لکھی گئی تھی تب اس کا نام "باد مخالف" نہ تھا۔ بلکہ "آشتی نامہ" تھا اور "دوادپیام" (یعنی دوستی کا پیغام) تھا جیسا کہ آخری شعر سے ظاہر ہے۔

آشتی نامہ دو داد پیام
ختم شد والسلام والاکرم

"باد مخالف" کا عنوان ترتیب دیوان کے وقت دیا گیا معلوم ہوتا ہے۔

(۵۶) یہ شعر ۱۸۳۱ء یا اس سے پہلے کا ذکر کردہ ہے اور مفتی صدرالدین آزردہ ۱۵ جون ۱۸۳۳ء کو صدرالصدور مقرر ہوئے تھے۔ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے جیسے شعر بھری عدالت میں فی البدیہہ پڑھا گیا ہو۔ محض شعر کو سامنے رکھ کر قصہ گھڑ لیا گیا ہے۔

(۵۷) سال ذکر بعد از مئی ۱۸۴۷ء۔ غالب دوسری بار ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو جوے کے الزام میں گرفتار ہوئے تھے۔ پہلی بار جرمانہ ادا کر کے گلو خاصی کرالی تھی۔ اب کی چھ ماہ قید بامشقت اور دوسو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ جرمانے کی عدم ادائی کی صورت میں چھ ماہ مزید قید اور اگر اصلی جرمانے کے علاوہ پچاس روپے مزید ادا کردیں تو مشقت معاف۔ کلام عاصی ص ۲۶۴ پر نثری بیان بھی کچھ الگ ہے اور پہلا مصرع بھی یوں درج ہے۔

جس دن سے کہ ہم غم زدہ زنجیر بپا ہیں

اور یہی معتبر ہے۔

(۵۸) قید خانے کا کرتا پھاڑا نہیں جا سکتا، افسران قید خانہ کو لوٹانا پڑتا ہے۔ نیز یہ شعر ۱۸۴۷ء سے کم از کم ۳۶ سال پہلے کہا گیا تھا۔ (فی البدیہہ نہیں) یوں بھی اس شعر کا اطلاق یہاں کیوں کر ہو سکتا ہے؟

(۵۹) حسین علی خاں شاداںؔ پسر زین العابدین خاں عارفؔ اس وقت سات آٹھ سال کے ہوں گے اس لیے شعر کا سال فکر ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ ہوگا۔ (شاداںؔ ولادت ۱۸۵۰ء وفات ۷ ستمبر ۱۸۸۰ء)

(۶۰) یہ ایک قطعے کے شعر ہیں جو ۱۸۵۵ء میں تصنیف ہوا تھا۔ کل شعر تیس ہیں۔

(۶۱) قاضی عبدالودود مرحوم نے اس لطیفے کو آزادؔ کے اختراعات سے کہا ہے۔

(۶۲) غالب نے انتخاب غالب میں خود یہ لطیفہ لکھا ہے۔ اگر چہ مفہوم وہی ہے تاہم یہ معلوم ہو جائے گا کہ "...... ایک بوتل اولڈ ٹام کی باسامان سامنے حاضر ہو......" جیسے الفاظ کا اضافہ آزادؔ نے کیا ہے۔ یہ لفظ غالب کے نہیں۔

(۶۳) اپنے تئیں لسان الغیب قرار دیا۔ (حاشیہ از: آزادؔ)

(۶۴) یہ غزل دیوان غالب اردو (دوسرا ایڈیشن) مطبوعہ ۱۸۴۷ء میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۴۷ء کے بعد کہی گئی تھی۔ اگر غالب کے خط بنام میر مہدی مجروحؔ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۱ء میں دیے گئے بیان پر بھروسہ کیا جائے تو دس سال تاریخ خط میں سے منہا کر کے اس غزل کا سال فکر ۱۸۵۱ء متعین کیا جا سکتا ہے۔

توقیتِ غالب

۱۷۳۰ء (قیاساً)	غالب کے دادا میرزا قوقان بیگ خان کی سمرقند میں ولادت
۱۷۳۶ء	غالب کی دادی کی ولادت۔ مقام ولادت نامعلوم
۱۷۵۲ء۔۵۳	میرزا قوقان بیگ خان۔ غالب کے دادا کی سمرقند سے ہندوستان میں آمد، احمد شاہ ابدالی کے تیسرے حملے (دسمبر ۱۷۵۱ء تا مارچ ۱۷۵۲ء) کے بعد اور معین الملک کی وفات ۳ نومبر ۱۷۵۳ء سے پہلے۔ وسط ۱۷۵۴ء تک لاہور میں رہے۔ عالمگیر ثانی کے عہد جو ۲ جون ۱۷۵۴ء سے شروع ہوتا ہے میں دہلی پہنچے۔ چندے تلاش معاش میں سرگرداں۔ پھر شاہ عالم کی شہزادگی کے عہد میں جو ۱۴ اپریل ۱۷۵۶ء سے شروع ہوتا ہے، شاہی ملازم ہوئے۔ بعد از مئی ۱۷۷۱ء جب شاہ عالم نے دہلی کی طرف کوچ کیا تو نجف خاں کو بھی الہ آباد سے فوج کا سردار بنا کر اپنے ساتھ کر لیا۔ یہیں سے عہد نجف خانی شروع ہوتا ہے اور انھیں دنوں میں قوقان بیگ خان نے نجف خاں کی ملازمت قبول کی۔ بعد میں مستعفی ہو کر مہاراجہ جے پور کے ہاں نوکری۔ آگرے میں قیام۔
۱۷۵۸ء۔۵۹	قتیل کی ولادت شاہجہان آباد میں
۱۷۶۳ء (قیاساً)	غالب کے دادا میرزا قوقان بیگ خاں کی شادی

۱۷۶۵ء (قیاساً)	غالب کے والد عبداللہ بیگ خان کی دہلی میں ولادت
۱۷۶۷ء تا ۱۷۸۰ء	غالب کے چچا نصراللہ بیگ خان، دو اور چچاؤں (نام نامعلوم) اور تین پھوپھیوں کی ولادت، اندازہ ہے کہ انھیں بارہ تیرہ سالوں میں ہوئی ہوگی۔
۱۷۸۲ء (۶/اپریل)	ذوالفقار الدولہ نجف خاں کا انتقال ۴۵ سال کی عمر میں
۱۷۸۸ء (قبل از ۳۰ جولائی)	میرزا قوقان بیگ خان کا انتقال
۱۷۹۳ء (تقریباً)	عبداللہ بیگ خان (غالب کے والد) کی شادی
۱۷۹۵ء (تقریباً)	غالب کی بہن چھوٹی خانم کی ولادت
۱۷۹۷ء (۲۷/دسمبر)	(محمد) اسداللہ (بیگ) خان (غالب) کی آگرے میں ولادت (قوقان بیگ خان کے بڑے بیٹے عبداللہ بیگ خان کا نکاح آگرے کے ایک امیر فوجی افسر خواجہ غلام حسین خان کی بیٹی عزت النساء بیگم سے ہوا۔ عبداللہ بیگ خاں اور عزت النساء بیگم، محمد اسداللہ بیگ خان (غالب) کے والدین تھے)
۱۷۹۹ء اواخر	یوسف علی بیگ خان (غالب کے چھوٹے بھائی) کی ولادت (۱۲۱۴ھ، ۵ جون ۱۷۹۹ء سے شروع ہوتا ہے)۔
۱۸۰۲ء	سالِ ولادت لاڈو بیگم زوجہ مرزا یوسف (برادرِ غالب)
۱۸۰۲ء	میرزا عبداللہ بیگ خان (غالب کے والد) کا ریاست الور کی ملازمت میں انتقال۔ کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست درخاک راج گرہ پدرم را بود مزار (غالب)

	اسد اللہ بیگ خان اور ان کے خاندان کا نصر اللہ بیگ خان (عبد اللہ بیگ خان کے برادر خرد) کی سرپرستی میں آنا (نصر اللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے قلعدار تھے۔ ۱۸۰۳ء میں انھوں نے قلعہ لارڈ لیک کے حوالے کر دیا۔ اس پر وہ انگریزی فوج میں سترہ سو روپے ماہوار مشاہرے پر ۴۰۰ سواروں کے رسالدار مقرر ہو گئے۔)
۱۸۰۳ء (۱۸/اکتوبر)	آگرے پر انگریزوں کا قبضہ
۱۸۰۶ء (؟اپریل)	نصر اللہ بیگ خان کا ہاتھی سے گر جانے سے زخمی ہونا اور انتقال (نواب احمد بخش خان، والیِ فیروز پور جھرکا و لوہارو کی ہمشیرہ نصر اللہ بیگ خان کے عقدِ نکاح میں تھی۔)
۱۸۰۶ء (۴/مئی)	احمد بخش خان کی سفارش پر انگریزوں کی طرف سے نصر اللہ بیگ خان کے پس ماندگان کا وظیفہ دس ہزار روپیہ (پہلا شقہ) (اس وظیفے میں نصر اللہ بیگ خان کی والدہ، تین بہنیں، اسد اللہ بیگ خان یعنی غالب اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف علی بیگ خان حصہ دار تھے۔)
۱۸۰۶ء (۷/جون)	وظیفہ کی رقم دس ہزار سے پانچ ہزار سالانہ کر دی گئی۔ (دوسرا شقہ) غالب کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سالانہ (اس شقہ کی رو سے ایک شخص خواجہ حاجی بھی اس وظیفے میں دو ہزار سالانہ کا حصہ دار قرار دیا گیا تھا۔)
۱۸۰۶ء (۲۸/نومبر)	جلال الدین شاہ عالم ثانی کا انتقال، معین الدین اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی

۱۸۰۶ء تا ۱۸۲۵ء	غالب کی دادی کا انتقال (غالب کے عرضی دعوے سے پتا چلتا ہے کہ ۱۸۰۶ء میں ان کی دادی زندہ تھی اور جب ۱۸۲۵ء میں خواجہ حاجی فوت ہوئے تو اس سے پہلے ان کی دادی کا انتقال ہو چکا تھا۔ غالباً ۱۸۲۵ء سے بہت پہلے۔)
۸۔ ۱۸۰۷ء (تقریباً)	شعر گوئی کا آغاز۔ اسدؔ تخلص، روایت ہے کہ ایک اور شاعر میر امانی اسدؔ تخلص تھا چوں کہ لوگ اس کا کلام غالب (اسدؔ) سے منسوب کرنے لگے تھے۔ اس لیے اسدؔ تخلص ترک کرے (لگ بھگ ۱۸۱۶ء میں) تخلص غالبؔ رکھ لیا گیا۔ تاہم کبھی کبھی اسدؔ تخلص بھی روا رکھا۔
۱۸۱۰ء	قلندر بخش جرأت کی لکھنؤ میں وفات (۱۲۲۵ھ، ۶/فروری ۱۸۱۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ۲۵/جنوری ۱۸۱۱ء کو ختم ہوتا ہے۔)
۱۸۱۰ء (تقریباً)	اسد اللہ بیگ خان کی مولوی محمد معظم کے مکتب (آگرہ) میں تعلیم (بحوالہ عیار الشعراز: خوب چند ذکاؔ، گلستانِ بے خزاں از قطب الدین باطنؔ۔ بعد میں حالیؔ وغیرہ)
۱۸۱۰ء (۱۹/اگست)	الٰہی بخش خان معروفؔ کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے دلّی میں نکاح ۷ رجب ۱۲۲۵ھ تاریخ نکاح حقیقت میں ۱۷ رجب ۱۲۲۵ھ ہے (الٰہی بخش خان، نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ نکاح کے وقت غالب کی عمر تیرہ سال کی تھی اور امراؤ بیگم کی گیارہ سال کی۔ معروفؔ کا نامکمل دیوان چھپ چکا ہے۔

	دیوان مطبوعہ کے علاوہ ایک مخطوطہ مکتوبہ ۱۲۳۶ھ بھی میرے کتب خانے میں ہے۔)
۱۸۱۰ء(۲۰/ ستمبر)	میر تقی میر کی لکھنؤ میں وفات۔
۱۸۱۲ء_۱۳	غالب کی دلّی میں آمد اور مستقل سکونت۔
۱۸۱۴ء_۱۹/ اگست تا ۱۸۱۷ء_۸/ جولائی	کسی بھی سال میں مرزا یوسف کی شادی (یقینی دن، تاریخ اور مہینہ۔ دوشنبہ (سہ شنبہ؟) ۲۲شعبان)
۱۸۱۵ء_۱۶	غالب کی پہلی مہر (۱۲۳۱ھ) غالب کی عمر ۱۸_ ۱۹ برس کی تھی یعنی ان کے عیش و نشاط کا زمانہ تھا۔ — اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ
	غالب کی دوسری مہر (یہ دونوں مہریں ایک ہی سال میں بنوائی گئیں) — اسد اللہ الغالب ۱۲۳۱ھ
	اس مہر کی بنا پر حضرت علی کا لقب ہے اور یہ بطور سجع ہے۔ اسی سال تبدیلِ تخلص کے وقت یہی سجع کام آیا اور اسد کی جگہ غالب تخلص قرار پایا۔ (۱۲۳۱ھ ، ۳/ دسمبر ۱۸۱۵ء سے شروع ہوتا ہے۔)
۱۸۱۶ء	غالب تخلص کا باقاعدہ استعمال۔
۱۸۱۶ء(۱۱جون)	دیوانِ اردو بخط غالب کی کتابت کی تاریخ (۱۴/رجب سہ شنبہ ۱۲۳۱ھ؟)
۱۸۱۷ء(۱۹ مئی)	انشاء کی لکھنؤ میں وفات

۲۴۔۱۸۲۲ء	غالب کی تیسری مہر محمد اسد اللہ خاں ۱۲۳۸ھ
۱۸۲۳ء(۳/مئی)	نواب احمد بخش خاں پر قاتلانہ حملہ۔
۲۵۔۱۸۲۴ء	مصحفی کی لکھنؤ میں وفات (۱۲۴۰ھ، ۲۶/اگست ۱۸۲۴ء سے شروع ہوتا ہے۔)
۱۸۲۵ء	خواجہ حاجی کا انتقال (انتقال شاید ۱۸۲۵ء کے شروع میں ہوا ہوگا۔ ۲۸/اپریل ۱۸۲۸ء کی پنشن کی درخواست میں غالب نے لکھا ہے کہ خواجہ حاجی کا انتقال تین برس ہوئے جذام کے مرض سے ہوا۔)
۱۸۲۵ء(تقریباً جون)	فیروز پور جھرکا کا سفر۔ نواب احمد بخش خان کی خدمت میں بسلسلۂ حق پنشن۔ یہ بات جنرل اخترلونی کے انتقال (۱۵/جولائی ۱۸۲۵ء) سے کچھ پہلے کی ہے۔ ناکام واپس پلٹے۔
۱۸۲۵ء(شاید اکتوبر)	میرزا یوسف علی (بیگ) خان کی شدید بیماری، دیوانگی کا آغاز۔
۱۸۲۵ء(۲۸/نومبر؟)	نواب احمد بخش خان کی معیت میں سر چارلس منکاف اور ان کے فوجوں کے ساتھ بھرت پور کا سفر (اسے سفر کلکتہ کا آغاز کہہ سکتے ہیں کیوں کہ اب کے جو دہلی سے نکلے تو پھر ۲۹/نومبر ۱۸۲۹ء ہی کو سفر کلکتہ ختم کر کے واپس آسکے۔ مقصد سر چارلس منکاف سے ملنا تھا۔)
۱۸۲۵ء(بعد از ۱۸/دسمبر)	واپسی پر ایک لمبے عرصے تک فیروز پور جھرکا میں نواب احمد بخش خان کے ساتھ قیام۔

۱۸۲۶ء (آغاز سال تا اواخر ستمبر)	فیروز پور ہی میں رکے رہے کیوں کہ احمد بخش خان الور اور اپنے بیٹے شمس الدین خان وغیرہ کی جانشینی کے معاملات میں بیشتر فیروز پور سے باہر ہی رہے۔ غالب مایوس ہو گئے۔
۱۸۲۶ء (اوائل اکتوبر)	غالب کی فرخ آباد کے راستے کان پور کو روانگی۔ قرض خواہوں کے ڈر سے دہلی نہ گئے اس لیے فیروز پور ہی سے کلکتے کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔
۱۸۲۶ء (۱۳/ اکتوبر)	نواب احمد بخش خان کی فیروز پور جھرکا اور لوہارو کی حکومت سے دستبرداری (نواب شمس الدین احمد خان والی ریاست)
۱۸۲۶ء	الٰہی بخش خان معروفؔ (غالب کے خسر) کا انتقال (انتقال ۱۲۴۲ھ میں ہوا تھا جو ۶ / اگست ۱۸۲۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ گویا ۶ / اگست ۱۸۲۶ء اور ۳۱ / دسمبر ۱۸۲۶ء کے درمیان کسی وقت)
۱۸۲۶_۲۷ء	فارسی میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز (اس سے پہلے کا سرمایۂ شعر فارسی ناقابل اعتنا اور مقدار میں بہت کم ہے۔ گل رعنا میں شامل فارسی انتخاب اس پر شاہد ہے کہ ۱۸۲۸ء (۱۲۴۴ھ) تک ان کے پاس ۲۷ غزلوں سے زیادہ فارسی کلام نہ تھا اور وہ بھی اسی سفر کلکتہ کے دوران کہا گیا تھا۔ غالب کے قدیم ترین خطی نسخے میں بھی اردو کا تو مکمل مرتّب دیوان ہے مگر فارسی کی صرف ۱۳ رباعیاں ہیں۔)
۱۸۲۷ء (۲۳/ ستمبر تا ۲۲/ اکتوبر)	نواب احمد بخش خان کا انتقال۔ غالب کو یہ خبر سفر کلکتہ کے دوران میں مرشد آباد میں ملی۔

۱۸۲۸ء(۱۹/ فروری یا ۲۱/ فروری)	کلکتہ میں ورود۔ اسی روز شملہ بازار (متصل چیت بازار) میں گرو تالاب کے نزدیک مرزا علی سوداگر کی حویلی میں رہنے کو مکان مل گیا۔ (غالب نے سہ شنبہ چہارم شعبان (۱۲۴۳ھ) لکھا ہے۔ سہ شنبہ کو ۲شعبان تھا جو ۱۹/ فروری کے مطابق ہے۔ ۴شعبان کو پنج شنبہ تھا جو مطابق ہے ۲۱فروری کے۔)
۱۸۲۸ء (۲۸/اپریل)	پنشن کے مقدمے کا آغاز
۱۸۲۸ء (۲۸/اپریل)	پنشن کی درخواست میں مذکور ہے کہ "میرا نام محمد اسداللہ خان ہے" (اس کے سامنے وہ خط بنام تفتہ بھی دیکھیے جس میں غالب نے لکھا ہے کہ وہ اب "محمد کا لفظِ مبارک اپنے نام کے ساتھ اس لیے نہیں لگاتے کہ لوگوں نے لکھنا ترک کر دیا تھا لہٰذا انھوں نے بھی موقوف کیا۔)
۱۸۲۸ء (۲۸/اپریل)	غالب نے درخواست میں لکھا کہ آج ان پر بیس ہزار روپیہ قرض ہے۔
۱۸۲۸ء (۱۱/ ستمبر)	گل رعنا کی ترتیب و تدوین مکمل۔ اردو اور فارسی کلام کا یہ انتخاب انھوں نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر خود اپنے قلم سے کیا تھا۔
۱۸۲۹ء (۱۶/ فروری)	گورنر جنرل کے دربار میں شمولیت۔ نواب اکبر علی خاں کے ساتھ دسویں نشست۔
۱۸۲۹ء(یکم اگست)	پھر گورنر جنرل کے دربار میں شمولیت۔ معلوم ہوا کہ گورنر جنرل ہندوستان کے دورے پر نکلیں گے۔ غالب نے بھی واپس دہلی آنے کا ارادہ کر لیا۔

۱۸۲۹ء(۲۹/نومبر)	چار برس کی غیر حاضری کے بعد دلّی واپس۔ سفر کلکتہ ختم
۱۸۳۰ء(۱۶/اگست)	نظیر اکبر آبادی کی وفات
۱۸۳۰ء(۱۹/نومبر)	راجا رام موہن رائے کا سفر انگلستان۔ البیون (Albion) نامی کمپنی کے بحری جہاز سے۔
۱۸۳۱ء(۲۷/جنوری)	مقدمہ پنشن خارج (اس کے بعد وہ اپیل کرتے رہے۔ جس کا سلسلہ ۱۸۴۴ء تک رہا۔ لیکن یہ ابتدائی فیصلہ قائم رہا۔)
۱۸۳۲ء(تقریباً)	شیفتہ کی غالب سے پہلے پہل جان پہچان۔
۱۸۳۳ء(۱۶/اپریل)	دیوان متداول (اردو) کی تاریخ ترتیب۔
۱۸۳۴ء(۱۸/اکتوبر)	شمس الدین خان کے داروغہ شکار کریم خاں کی انیا میواتی کے ساتھ دہلی میں انگریزوں کے ایجنٹ ولیم فریزر کے قتل کے لیے دہلی میں آمد، تین مہینے دہلی میں رہا مگر ناکام لوٹا۔ پھر دہلی واپس آیا۔
۱۸۳۵ء(۲۲/مارچ)	ولیم فریزر کا قتل۔ نواب شمس الدین احمد خان کے داروغہ شکار کریم خاں کی گرفتاری۔
۱۸۳۵ء(۱۸/اپریل)	نواب شمس الدین احمد خان کی الزام قتل میں گرفتاری
۱۸۳۵ء(۲۹/اپریل)	دیوان غالب فارسی، "میخانہ آرزو سر انجام" کے نام سے مرتب۔ یہ ترتیب ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۰ مئی ۱۸۳۴ء تا ۲۹/اپریل ۱۸۳۵ء) میں مکمل ہوئی۔
۱۸۳۵ء(۲۶/اگست)	کریم خان کو بجرم قتل پھانسی کی سزا۔
۱۸۳۵ء(۸/اکتوبر)	نواب شمس الدین احمد خان کو بالزام اعانت مجرمانہ پھانسی۔ (اس پر فیروز پور جھرکا کا علاقہ انگریزوں نے واپس لے لیا۔ اس کے بعد غالب کی پنشن، ساڑھے سات سو روپے سالانہ، ریاست لوہارو کی جگہ انگریزی خزانے سے ادا ہونے لگی۔)

۱۸۳۵ء(۲۰/مارچ تا ۱۸۳۶ء)(۴/مارچ)	سر چارلس مٹکاف، ایکٹنگ گورنر جنرل
۱۸۳۷ء(آخر مئی)	جام جہاں نما، کلکتہ بابت ۷/جون ۱۸۳۷ء میں (بہ زبان فارسی) خبر چھپی کہ میرزا اسد اللہ خاں، یوسف خاں کی ملاقات کو جارہے تھے کہ اثنائے راہ میں عدالت کے چپراسی نے دو سو پچاس روپے کی نالش کی بابت جو میکفرسن صاحب نے کی تھی، انھیں گرفتار کرکے ناظر کے مکان میں قید کردیا۔ چنانچہ (نواب) امین الدین خاں نے چار سو روپیہ اصل و سود ادا کرکے رہا کرالیا۔ میکفرسن مشہور شراب فروش انگریز تھے۔
۱۸۳۷ء(۲۸/ستمبر) ۶ بجے شام	معین الدین اکبر شاہ ثانی کا انتقال
۱۸۳۷ء(۲۹/ستمبر) علی الصباح تین بجے	سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی
۱۸۳۷ء(۲۰/نومبر)	راج دربار سے فارسی زبان خارج کرنے کا حکم
۱۸۳۸ء(۱۵/اگست)	ناسخ کا لکھنؤ میں انتقال
۱۸۳۸ء(۲۳/نومبر)	شاہ نصیر کا حیدرآباد میں انتقال (۲۵ شعبان ۱۲۵۴ھ) سال ولادت ۱۱۷۵ھ / (۶۱-۱۷۶۰ء) قرار دیا جاتا ہے۔
۱۸۳۹ء (۲۷/جون)	مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال
۱۸۴۰ء (؟)	غالب کی والدہ کی علالت اور انتقال (ایک فارسی تحریر کے پیش نظر وہ ۳۰/جنوری ۱۸۴۰ء تک زندہ تھیں۔)
ایضاً	دلّی کالج میں مدرسِ فارسی کے عہدے کی پیشکش اور غالب کا انکار۔

۱۸۴۰ء فروری	"حکیم احسن اللہ خاں کو خلعت چھ پارچہ کا، تین رقم جواہر معہ خطاب عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزماں حکیم احسن اللہ خان بہادر ثابت جنگ مرحمت ہوا۔ حکیم مذکور بجائے حکیم شرف الدین کے...... سرفراز ہوئے۔" (دہلی اردو اخبار ۲۳/فروری ۱۸۴۰ء)
۱۸۴۱ء (قبل از ۱۵/اگست)	غالب کی، گھر پر جوا خانہ کے قیام میں گرفتاری (عدالت نے سو روپیہ جرمانہ کیا، عدم ادائی جرمانہ کی صورت میں چار مہینہ قید۔ جرمانہ ادا کر دیا گیا۔)
۱۸۴۱ء (اکتوبر)	دیوان اردو کا پہلا ایڈیشن (مطبع سید الاخبار، دہلی۔ اگرچہ دیوان ۱۸۳۳ء میں مرتب ہو چکا تھا۔)
۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۴ء	بہ عہد لارڈ ایلن برا گورنر جنرل، خلعت ہفت پارچہ اور سہ رقم جواہر کا غالب کو اعزاز۔
۱۸۴۴ء	میر نظام الدین ممنون کا دہلی میں انتقال۔
۱۸۴۵ء	دیوان (کلیات نظم) فارسی کا پہلا ایڈیشن (مطبع دار السلام دہلی) دیوان ۱۸۳۵ء میں مرتب ہو چکا تھا۔
۱۸۴۷ء	زین العابدین خان عارف کے بڑے بیٹے، باقر علی خاں کا سال ولادت۔
۱۸۴۷ء (۱۳/جنوری)	آتش کا لکھنؤ میں انتقال۔
۱۸۴۷ء (مئی)	دیوان اردو کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت (مطبع دار السلام دہلی)
۱۸۴۷ء (۲۵/مئی)	گھر پر جوا خانہ قائم کرنے کے الزام میں غالب کی دوبارہ گرفتاری (فیصلے میں چھ ماہ قید بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی۔ مشقت غالباً پچاس روپے ادا کر کے معاف ہو گئی۔ وہ صرف تین مہینے قید میں رہے، اس کے بعد رہائی ہو گئی۔)

۱۸۴۸ء (۹/مارچ)	غالب کا پہلا اردو خط (بنام نبی بخش حقیر اب ایک خط بنام تفتہ کو غالب کا پہلا اردو خط تسلیم کیا جارہا ہے۔ اس خط پر تاریخ درج نہیں مگر قیاس ہے کہ خط ۱۸۴۷ء کا لکھا ہوا ہے۔)
۱۸۴۹ء(۱۴/اگست)	پنج آہنگ (فارسی) کا پہلا ایڈیشن (مطبع سلطانی، لال قلعہ، دہلی)
۱۸۵۰ء	زین العابدین خان عارف کے چھوٹے بیٹے، حسین علی خان کا سال ولادت۔
۱۸۵۰ء(۴/جولائی)	تیموری خاندان کی تاریخ (مہر نیم روز) لکھنے پر مقرر، چھ پارچے اور تین رقم جواہر کا، خلعت اور خطاب نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ عطا ہوا (تاریخ نویسی کی تنخواہ چھ سو روپیہ سالانہ مقرر ہوئی۔)
۱۸۵۰_۵۱ء	حافظ عبدالرحمٰن خان (حافظ جیو) احسان دہلوی کا دہلی میں انتقال۔ (۱۲۶۷ھ، ۶/نومبر ۱۸۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔)
۱۸۵۰_۵۱ء	غالب کی چوتھی مہر غالب کو یہ خطاب بہادر شاہ ظفر نے ۴/جولائی ۱۸۵۰ء کو دیا۔ جو ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ کے مطابق ہے۔

> نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں
> بہادر نظام جنگ
> ۱۲۶۷ھ

مہر ۱۲۶۷ھ میں بنوائی گئی۔ جو ۶/نومبر ۱۸۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔

۱۸۵۲ء(اپریل) زین العابدین خان عارف (امراؤ بیگم کے بھانجے) کی وفات۔ (عارف اور پھر عارف کی والدہ بنیادی بیگم کی وفات کے بعد عارف کے دونوں لڑکوں کو امراؤ بیگم نے پالا) قبر مرزا غالب کے قریب کونے میں ہے۔

۱۸۵۲ء(۱۴/مئی) مومن کا دتی میں انتقال۔

۱۸۵۲ء(اگست؟) مثنوی شانِ نبوت وولایت کی اشاعت۔
(مولوی محمد سالم کی نثر کا یہ منظوم ترجمہ بہادر شاہ ظفر کے حکم (جو ۹ شوال ۱۲۶۸ھ مطابق ۲۷/جولائی ۱۸۵۲ء کو دیا گیا تھا) سے مطبع سلطانی سے چھپی تھی۔ اس کے کل صفحے ۱۱ ہیں۔ پہلے اس میں ۱۰۱ شعر تھے جب اسے کلیات غالب (فارسی) غالبًا ۱۸۶۳ء میں شامل کیا گیا تو اس کے آخری تین شعر نکال کر ۳۰ مزید شعروں کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح اب اس کے ۱۲۸ شعر ہیں۔)

۱۸۵۲ـ۵۳ء غالب کی پانچویں مُہر
غالب حضرت علیؓ کو مشکل کشا مانتے تھے شاید یہ مُہر ان کے سقیم حالات کی نشان دہی کرتی ہے۔

یااسد اللہ الغالب ۱۲۶۹ھ

(۱۲۶۹ھ، ۱۵/اکتوبر ۱۸۵۲ء سے شروع ہوتا ہے۔)

۱۸۵۳ء(اپریل) پنج آہنگ کا دوسرا ایڈیشن (مطبع دار السلام، دہلی)

۱۸۵۳ء(۲۰/دسمبر) غالب کی بڑی اور آخری پھوپھی کا انتقال

	(اس پھوپھی کی وفات کے ساتھ، توقان بیگ خان کی صلبی اولاد (بیٹے بیٹیوں) کا خاتمہ ہو گیا۔)
۱۸۵۴ء	حالی پہلی مرتبہ دہلی آئے۔ بہ عمر ۱۷-۱۸ برس ڈیڑھ برس کے بعد اواخر ۱۸۵۵ء میں واپس پانی پت۔ سال بھر حصار میں ملازمت کی۔
۱۸۵۴ء (اکتوبر)	غلام حسین خاں مسرور (زین العابدین خان عارف کے والد اور غالب کے ہم زلف) کا انتقال۔
۱۸۵۴ء (۱۵/نومبر)	شیخ محمد ابراہیم ذوق (استادِ ظفر) کا انتقال بعد از انتقال ذوق، غالب استاد ظفر مقرر ہوئے۔
۱۸۵۴-۵۵ء	مہر نیم روز کی طباعت و اشاعت (فخر المطابع، دلی ۱۲۷۱ھ، ۲۴/ستمبر ۱۸۵۴ء سے شروع ہوتا ہے۔ (یہ اسی سال میں کم از کم تین بار چھپی۔ یہ سب ایڈیشن جو پہلا ایڈیشن ہی کہلاتے ہیں۔ میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔)
۱۸۵۵ء (۱۴/جون)	بنیادی بیگم (امراؤ بیگم کی بڑی بہن اور والدۂ عارف) کا انتقال
۱۸۵۶ء (از ۱۴/ستمبر تا ۳۱/دسمبر)	قادر نامہ کی اشاعت اوّل (مطبع سلطانی، لال قلعہ، دہلی) ۱۲۷۲ھ۔ (یہ نظم غالب نے عارف کے دونوں بچوں کو فارسی اور اردو پڑھانے کے لیے کہی تھی۔)
۱۸۵۶ء (۷/فروری)	الحاق اودھ (۳ مارچ ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ لکھنؤ سے کلکتہ چلے گئے۔)
۱۸۵۶ء (۱۰/جولائی)	غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو (ولی عہد بہادر شاہ ظفر) کا انتقال

۱۸۵۷ء(۲۸/جنوری)	غالب نے مولانا فضل حق خیر آبادی کی تحریک پر والیِ رام پور نواب محمد یوسف علی خاں کی خدمت میں قصیدہ بھیجا۔
۱۸۵۷ء(۵/فروری)	غالب کا تقرر بطور استاد نواب یوسف علی خان، ناظم والیِ رام پور
۱۸۵۷ء(مارچ/اپریل)	غالب کے رازدارانہ خطوط بنام والیِ رام پور (قوی گمان ہے کہ یہ سیاسی امور پر مشتمل تھے۔ اس لیے غالب کی ہدایت پر یہ خطوط ضائع کر دیے گئے۔)
۱۸۵۷ء(۱۰/مئی)	سنہ اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے (غدر) کا میرٹھ میں آغاز
۱۸۵۷ء(۱۱/مئی)	دیسی فوج (تلنگوں) کا دہلی میں داخلہ: انگریزی تسلط کا خاتمہ، دیسی اقتدار کا قیام، غالب کی قلعہ کی تنخواہ اور انگریزی پنشن بند۔
۱۸۵۷ء(۲۰/ستمبر)	انگریزوں کی فتح اور دہلی پر دوبارہ قبضہ
۱۸۵۷ء(ستمبر)	غدر کے بعد دہلی پر دوبارہ انگریزی قبضے کے دوران امام بخش صہبائی انگریز کی گولی کا نشانہ ہوئے۔
۱۸۵۷ء(۱۸۔۱۹/اکتوبر)	میرزا یوسف علی (بیگ) خان (برادر غالب) کی وفات (وہ انگریز کی گولی کا نشانہ بنے، اگرچہ غالب نے مصلحتاً لکھا ہے کہ وفات بخار سے ہوئی۔)
۱۸۵۸ء(نومبر)	دستنبو کی اشاعت اوّل (مطبع مفید خلائق، آگرہ)
۱۸۵۹ء	سکّہ کا الزام۔ خط بنام حسین مرزا۔ نوشتہ ۱۸/جون ۱۸۵۹ء۔ (گوری شنکر مخبر نے سکّہ کی رپورٹ منسوب بہ غالب ۱۹/جولائی ۱۸۵۷ء ہی کو انگریزوں کو پہنچا دی تھی۔)

۱۸۵۹ء (۱۰/جولائی)	والی رام پور سے مستقل وظیفے کی درخواست اور اسی مہینے سے سو روپے ماہوار بطور وظیفہ مقرر۔
۱۸۶۰ء (جنوری)	گورنر جنرل یکم جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی آئے تھے۔ کچھ دنوں بعد ہی غالب ان سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے ہوں گے۔ جواب ملا کہ "فرصت نہیں" اور کہ تم "باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔" (یہ سلوک سکے کے الزام کی وجہ سے تھا) درحقیقت یہ سکہ حافظ ویران شاگرد ذوق کا کہا ہوا تھا جو صادق الاخبار کے ۱۳ ذیعقدہ ۱۲۷۳ھ (مطابق ۶/جولائی ۱۸۵۷ء) کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ گوری شنکر مخبر کو ویران کی جگہ غالب کا نام یاد رہ گیا۔
۱۸۶۰ء (۱۹/جنوری)	رام پور کا پہلا سفر (۲۷/جنوری کو رام پور پہنچے۔)
۱۸۶۰ء (۲۴/مارچ)	رام پور سے واپسی (۱۷/مارچ کو رام پور سے روانہ ہوئے تھے۔)
۱۸۶۰ء (مئی)	انگریزی پنشن کا دوبارہ اجرا۔ (تین برس کا بقایا ساڑھے سات سو سالانہ کے حساب سے ۲۲۵۰ روپے وصول ہوا۔)
۱۸۶۱ء (۲۹/جولائی)	دیوان اردو کا تیسرا ایڈیشن (مطبع احمدی، دہلی)
۱۸۶۱ء (۱۹/اگست)	مولانا فضل حق خیر آبادی کا جزیرۂ انڈیمان میں انتقال۔
۱۸۶۱ء ـ ۶۲	غالب کی چھٹی مہر یہاں سے غالب کی زندگی کا انتہائی شہرت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

غالب
۱۲۷۸ھ

یہ مختصر علم ان کی انا کا نقطۂ عروج ہے۔ سات سال بعد ان کا انتقال ہوا۔ یہ ان کی آخری مُہر تھی گویا ان کی انا کا مظاہرہ ان کے انتقال تک پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا (۱۲۷۸ھ ، ۱۰ جولائی ۱۸۶۱ء سے شروع ہوتا ہے۔)

۱۸۶۲ء	قاطع برہان کی طبع اوّل (مطبع نول کشور، لکھنؤ)
۱۸۶۲ء (۲/مارچ)	انگریزی درباروں میں کرسی نشینی اور خلعت کے اعزاز کا دوبارہ اجرا۔
۱۸۶۲ء (جون)	دیوان اردو کا چوتھا ایڈیشن (مطبع نظامی، کان پور)
۱۸۶۲ء (یکم اکتوبر)	لاڈو بیگم بیوہ مرزا یوسف کی حکومت سے درخواست گزارے کے لیے۔
۱۸۶۲ء (بعد از جون)	دیوان اردو کی پانچویں اور آخری اشاعت (مطبع مفید خلائق، آگرہ)
۱۸۶۳ء (مئی/جون)	دیوانِ فارسی (کلیاتِ نظم فارسی) کا دوسرا ایڈیشن (مطبع نول کشور، لکھنؤ)
۱۸۶۳ء (جولائی)	یکم اکتوبر ۱۸۶۲ء سے ۲۰ روپے مہینہ خیراتی پنشن بنام لاڈو بیگم زوجہ مرزا یوسف مرحوم، جاری
۱۸۶۴ء	مثنوی ابر گہربار کی اشاعت (اکمل المطابع، دلّی) (یہ مثنوی کلیات نظم میں شامل تھی، لیکن اب الگ سے شائع ہوئی۔)
۱۸۶۴ء	قاطع برہان کے جواب میں محرقِ قاطع برہان مصنفہ سید سعادت علی کی اشاعت (مطبع احمدی، دلّی)
۱۸۶۴ء	قادر نامہ کی دوسری اشاعت (مجلس پریس، دلّی)
۱۸۶۴ء	سر جان لارنس گورنر جنرل

۱۸۶۴ء	لطائف غیبی (اگرچہ نام میاں داد خان سیاح کا ہے مگر اس کے اصل مصنف غالب ہی ہیں۔)
۱۸۶۴ء	انتخاب غالب کی ترتیب (مزید کوائف ۱۸۶۶ء کے تحت دیکھیے)
۱۸۶۴ء	سوالات عبدالکریم از عبدالکریم کی اشاعت۔ اکمل المطابع، دلی۔ (دوسرے کے نام سے شائع ہوئی لیکن یہ بھی غالب کی اپنی تصنیف ہے۔)
۱۸۶۵ء	دافع ہذیان معنفہ سید محمد نجف علی جھجری کی اشاعت۔
۱۸۶۵ء	ساطع برہان از مرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی کی اشاعت۔
۱۸۶۵ء	غالب نے حکومت سے تین مطالبے کیے کہ انھیں شاعر دربار مقرر کیا جائے، پہلے سے اونچی جگہ ملے اور دستنبو حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے۔ حکم ہوا کہ تحقیقات کی جائے کہ غدر میں غالب کا رویّہ کیا تھا۔ رپورٹ ہوئی کہ ان سے سکّہ منسوب ہے۔ سب درخواستیں رد ہو گئیں۔ غالب پر سکّہ کا الزام ان کی زندگی میں غلط ثابت نہ ہو سکا۔
۱۸۶۵ء (۲۱/اپریل)	نواب یوسف علی خان والیِ رام پور کا انتقال، نواب کلب علی خان کی جانشینی۔
۱۸۶۵ء (اگست)	غالب کے رسالے نامۂ غالب بجواب ساطع برہان کی اشاعت (مطبع محمدی، دلی)
۱۸۶۵ء (۷/اکتوبر)	مرزا غالب کا رام پور کا دوسرا سفر۔ ۱۲/اکتوبر کو رام پور پہنچے۔

۱۸٦۵ء	دستنبو کا دوسرا ایڈیشن (مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل، کھنڈ بریلی)
۱۸٦۵ء (دسمبر)	قاطع برہان کی طبع ثانی بعنوان درفشِ کاویانی کی اشاعت۔ (اکمل المطابع، دلی)
۱۸٦۵ء (دسمبر)	رام پور کے دوسرے سفر سے واپسی۔ (۲۸/ دسمبر کو رام پور سے روانہ ہوئے اور ۸/ جنوری ۱۸٦٦ء کو دلی پہنچے)
۱۸٦٦ء	قاطع برہان کے جواب میں موید برہان مصنفہ مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کی اشاعت (مطبع مظہر العجائب، کلکتہ)
۱۸٦٦ء	قاطع برہان کے جواب میں قاطع القاطع مصنفہ امین الدین امین دہلوی کی اشاعت (مطبع مصطفائی، دہلی)
۱۸٦٦ء	انتخاب غالب کی اشاعت (پہلے حصے میں دو دیباچے، ۱۲ خط، ۲ نقلیں اور ایک لطیفہ ہے۔ دوسرے حصے میں اردو کے ۱۳۱ منتخب شعر ہیں۔ مولوی ضیاء الدین خاں نے اس کے خطوط معمولی ردّ و بدل کے بعد اپنی مرتبہ انشائے اردو (حصہ دوم) میں شامل کر کے ۱۸٦٦ء میں انھیں مطبع فیض احمدی سے شائع کردیا تھا۔ نہیں معلوم کہ یہ مکمل انتخاب غالب کی زندگی میں کبھی شائع ہوا تھا کہ نہیں۔ یہ انتخاب پہلے بھی تین بار ناقص چھپ چکا ہے۔ میں نے اسے اب (۱۹۹۲ء) میں اصل مخطوطے کے عکس اور مبسوط دیباچے کے ساتھ انتخاب رقعات و اشعار غالب کے نام سے شائع کیا ہے۔ ۱۹۹۵ء میں اسے مزید ترمیم و تنقیح کے بعد رشید حسن خاں صاحب نے بھی اسے انشائے غالب کے نام طبع کرادیا ہے۔)

۱۸۶۷ء(؟)	دعاے صباح۔ فارسی منظوم ترجمہ (مطبع نول کشور، لکھنؤ) (اس کا آج تک ایک ہی مطبوعہ نسخہ دریافت ہوا ہے جو میرے کتب خانے میں ہے۔ اس کا ایک ہو بہو ایڈیشن میں نے ۱۹۷۷ء میں اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔)
۱۸۶۷ء	تیغ تیز کی اشاعت (اکمل المطابع، دہلی) (غالب نے یہ مختصر رسالہ موید برہان کے جواب میں لکھا تھا۔)
۱۸۶۷ء(فروری)	نکات غالب و رقعات غالب کی اشاعت مطبع سراجی، دہلی (پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے ڈائریکٹر میجر فلر نے رائے بہادر ماسٹر پیارے لال کو حکم دیا کہ غالب سے فارسی قواعد سے متعلق کتاب لکھوائی جائے۔ ماسٹر صاحب موصوف کے کہنے پر میرزا نے یہ دو مختصر رسالے قلم بند کیے)
۱۸۶۷ء(۱۱/اپریل)	ہنگامۂ دل آشوب را، کی اشاعت۔ مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ (قاطع برہان کے مناقشے کے سلسلے کے منظومات)
۱۸۶۷ء(اگست)	سبدِ چین کی اشاعت (مطبع محمدی، دلی)
۱۸۶۷ء(۲۵/ستمبر)	ہنگامۂ دل آشوب (۲) کی اشاعت۔ مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ۔
۱۸۶۷ء(۲/دسمبر)	(مولوی امین الدین دہلوی مصنف قاطع القاطع کے خلاف مقدمہ ازالۂ حیثیت عرفی۔)
۱۸۶۸ء(جنوری)	کلیاتِ نثر فارسی (غالب) کی اشاعت (مطبع نول کشور، لکھنؤ)

(اس میں فارسی نثر کی تین کتابیں، پنج آہنگ، مہرِ نیم روز، دستنبو شامل ہیں)

۱۸۶۸ء (۲۳/مارچ) مولوی امین الدین دہلوی کے مقدمے سے دست برداری، راضی نامہ۔

۱۸۶۸ء (۱۶ جولائی) مفتی محمد صدر الدین آزردہ کا دہلی میں انتقال۔

۱۸۶۸ء (۲۷/اکتوبر) عودِ ہندی مجموعہٴ مکاتیب غالب کی پہلی اشاعت (مطبع مجتبائی، میرٹھ)

۱۸۶۹ء (۱۵/فروری) غالب کی وفات (بستی نظام الدین، خاندانِ لوہارو کی ہڑواڑ میں تدفین۔ اگرچہ بہت دنوں سے مختلف امراض کا شکار تھے، لیکن موت سے چند دن پہلے غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ۱۴/فروری دوپہر کو بے ہوش ہوگئے۔ تشخیص ہوئی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ اسی حالت میں اگلے دن دوپہر ڈھلے انتقال کیا۔ آخری وظیفہ بابت جنوری ۱۸۶۹ء منجانب نواب رام پور، غالب کی وفات سے صرف ایک گھنٹہ پہلے موصول ہوا تھا۔)

۱۸۶۹ء (۶/مارچ) اردوے معلّیٰ (مجموعہٴ مکاتیب اردو) کی پہلی اشاعت (اکمل المطابع، دہلی)

۱۸۶۹ء (ستمبر، اکتوبر) نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا انتقال

۱۸۶۹ء شمشیر تیز تر از مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کی اشاعت۔ (مطبع نبوی، کلکتہ)

(یہ قاطع برہان کے سلسلے کی آخری کتاب غالب کی تصنیف "تیغ تیز" کے جواب میں ہے جو مرزا کی وفات کے بعد شائع ہوئی، اگرچہ اس کی طباعت ان کی زندگی میں شروع ہو چکی تھی۔)

۱۸۷۰ء(۴/فروری)	غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم کا انتقال (مرزا غالب کی شرقی دیوار کے باہر کی طرف مدفون ہیں۔)
۱۸۷۴ء(۲۶/جون)	حکیم آغا جان عیش کا دتی میں انتقال۔
۱۸۷۶ء(۲۵/مئی)	باقر علی خان (فرزند اکبر زین العابدین خان عارفؔ) کا انتقال (فارسی میں تخلص باقرؔ تھا اور اردو میں کاملؔ۔ مدفن سلطان جی میں حضرت محبوب الٰہی کی پائنتی قاسم جانیوں کی ہڑواڑ میں ہے۔)
۱۸۸۰ء(۷/ستمبر)	حسین علی خان، زین العابدین خان عارفؔ کے چھوٹے بیٹے کا انتقال، اردو میں شاداںؔ تخلص کرتے تھے، فارسی میں خیالیؔ۔
۱۸۸۴ء (۳۱/اکتوبر)	علائیؔ، نواب علاء الدین احمد خاں (خلیفہ و جانشین غالب۔ ولادت ۲۵/اپریل ۱۸۳۳ء) کی وفات دہلی میں ؎ علائی چو برجائے غالب نشست ورق بردرید و قلم درشکست (علائیؔ)
۱۹۳۷ء(۱۹/جنوری)	فرخ مرزا، نواب امیر الدین احمد خاں فرخیؔ (ابنِ علائیؔ۔ ولادت ۲۶/ جنوری ۱۸۶۰ء) کی وفات۔ لوہارو میں دفن ہوئے۔ "میاں تمھارے "دادا" امین الدین احمد خاں بہادر ہیں۔ میں تمھارا "دلدادہ" ہوں۔" غالب
۱۹۴۵ء(۱۰/مئی)	معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم زوجہ باقر علی خاں کاملؔ (فرزند اکبر زین العابدین خان عارفؔ) کا انتقال۔

(بگا بیگم ۱۲سال کی عمر میں کاملؔ کی دلھن بن کر مرزا غالب کے گھر میں آئیں۔ ۲۴سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں اور ۶۹ سال بیوگی کے عالم میں گزار کر بہ عمر ۹۳ سال فوت ہوئیں۔ فخرالدین علی احمد مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہندان کے نواسے تھے۔)

۱۹۵۴ء (۲۹/مارچ)

محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم کی وفات (یہ عارفؔ کے بیٹے باقر علی خاں کاملؔ اور بگا بیگم کی دوسری بیٹی تھیں ۱۲۸۱ھ مطابق ۶۵۔ ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئی تھیں نواب ضیاالدین احمد خاں کے پوتے اور میرزا شہاب الدین احمد خاں کے بیٹے میرزا شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ سے بیاہی گئی تھیں۔ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مرزا غالب انھیں پیار سے میرزا جیون بیگ کہتے تھے۔)

انجمن کی تازہ مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۔ اردو ادب کی تحریکیں (چوتھا ایڈیشن)	ڈاکٹر انور سدید	200/-
۲۔ اردو ناول کے چند اہم زاویے	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	160/-
۳۔ حرفے چند (جلد سوم)	جمیل الدین عالی	100/-
۴۔ سرسید احمد خاں، حالات و افکار	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۵۔ افکارِ عالیہ	خان رشید/قاضی قیصر الاسلام	130/-
۶۔ اردو کی ادبی تاریخیں	ڈاکٹر گیان چند	450/-
۷۔ ملت اسلامیہ	علی نواز میمن/صفوت قدوائی	250/-
۸۔ غالب کے چند پہلو	شمس الرحمن فاروقی	100/-
۹۔ پاکستان ایک اشرافی ریاست کی معیشت	ڈاکٹر عشرت حسین	480/-
۱۰۔ انجمن ترقی اردو کا المیہ	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۱۱۔ منتشر یادیں	نورالحسن جعفری	150/-
۱۲۔ اردو کی منظوم داستانیں	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	350/-
۱۳۔ غالب کی بعض تصانیف	کالی داس گپتا رضا	120/-
۱۴۔ جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری	ڈاکٹر ناہید قاسمی	400/-
۱۵۔ تاریخ انجمن بابائے اردو کے بعد	شہزاد منظر/تکملہ۔ ادیب سہیل	175/-
۱۶۔ اشاریۂ اردو	مصباح العثمان	100/-
۱۷۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت (جلد اول)	سید ہاشمی فرید آبادی	250/-
۱۸۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت (جلد دوم)	سید ہاشمی فرید آبادی	300/-
۱۹۔ غالب ایک مطالعہ	ممتاز حسین	150/-

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی۔